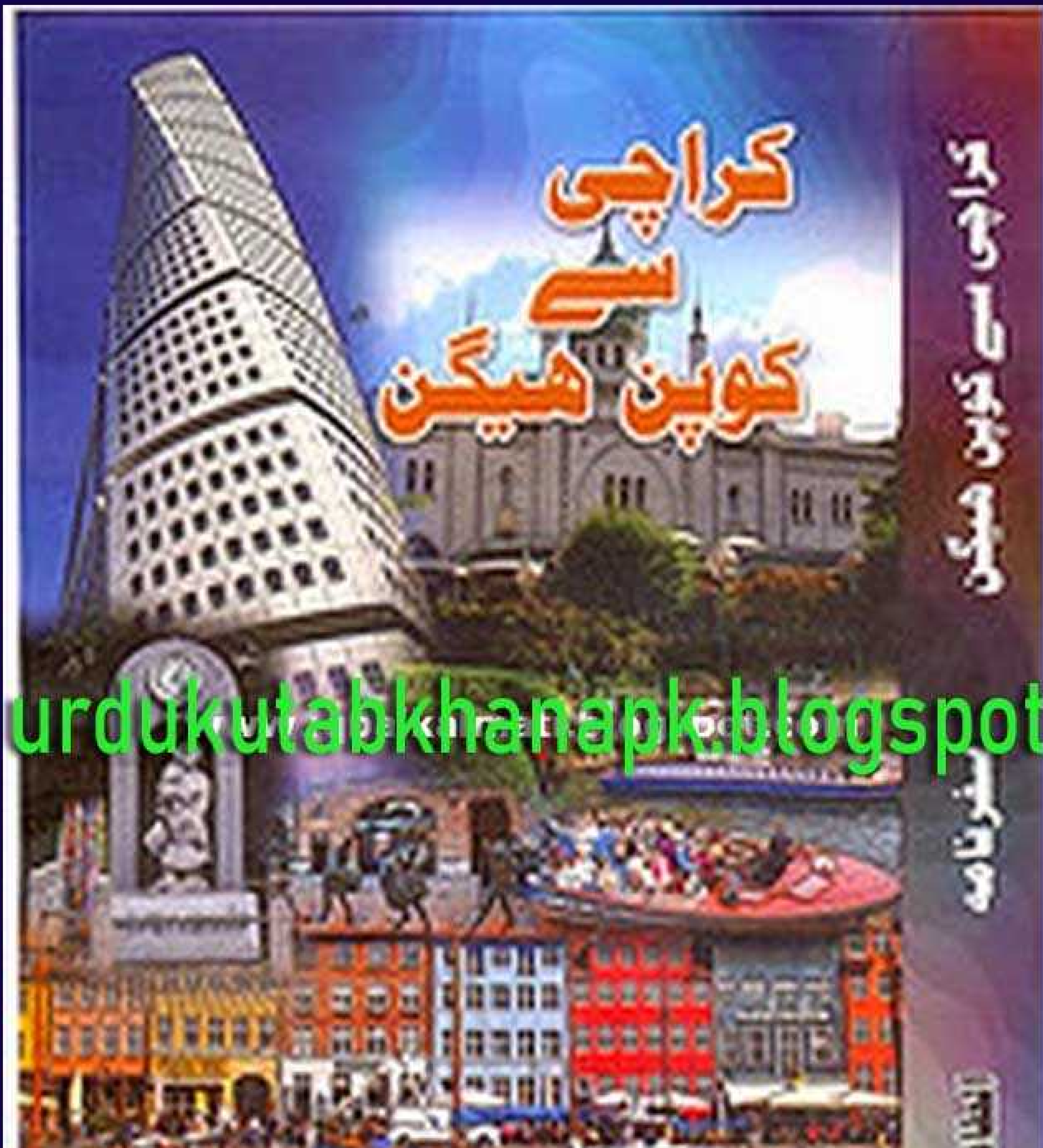

کراچی
سے
کوپن ہیگن
الطاف شیخ
Altaf
urdukutabkhanapk.blogspot
اردو کتب خانہ
URDUKUTABKHANAPK.BLOGSPOT

کراچی سے کوپن ہیگن

سفرنامہ

الطاف شیخ

الطاف شیخ ویب

www.altafshaikh.com.pk

کتاب کا نام: کراچی سے کوپن ہیگن

مصنف: الطاف شیخ

موضوع: سفرنامہ

پہلی اشاعت: دسمبر 2004

دوسری اشاعت: جون 2011

سرورق: کپتان ابڑو

کمپوزنگ: پیار گرافکس

پیسٹنگ: قمر گھانگھرو

ناشر: الطاف شیخ

مطبع: کاچھو پبلیکیشنز، کراچی۔ 0300-2879794

قیمت: 350 روپے

انتساب

کیڈٹ کالیج پٹارو کے ساتھی وائس ایڈمرل فاروق رشید کے نام جو پاکستان نیوی میں اِس اعلیٰ عہدے تک پہنچنے والے پہلے پٹارین ہیں۔ ہم سب کو اُن پر فخر ہے۔

الطاف شیخ

کیڈٹ کالج پٹارو کے ساتھی ایڈمرل فاروق رشید اور الطاف شیخ

فہرست

عرض مؤلف

سفرناموں کے سلسلے میں میری نئی کاوش آپ کے ہاتھوں میں ہے۔ میری خواہش ہے کہ نگر نگر گھوم کر حاصل ہونے والے عام تجربات و مشاہدات اپنے قارئین کے لیے صفحہءقرطاس پر منتقل کردوں۔ تاکہ وہ اس سے استفادہ کرسکیں۔ ماضی کی طرح اس کتاب کے لیے بھی میں اپنے تمام دوست و احباب کا شکرگذار ہوں جن کی کاوشوں اور نوازشات کے سبب تازہ سفرنامہ پائیہ تکمیل کو پہنچا۔ بالخصوص سینئر صحافی کامران لاشاری صاحب کا میں تہہ دل سے مشکور ہوں کہ انہوں نے اپنی تمام مصروفیات کے باوجود اپنا قیمتی وقت نکال کر کتاب کی نوک پلک سنواری۔ اگر میں انجنیئر نسیم خان اور لیفٹنٹ کمانڈر الطاف الرحمٰن کا شکریہ ادا نہ کروں تو زیادتی ہوگی کہ ان دونوں احباب نے اس کتاب کے چھاپنے میں اپنے طور پر ہر ممکنہ علمی اور تکنیکی مدد فراہم کی۔

طالب دعا

الطاف شیخ

جنوری 2004

Address: 2/112, 8th Gizri Lane

Phase IV, DHA Karachi

E-mail: altafshaikh2004@yahoo.co.uk

altafshaikh2005@gmail.com

"کراچی سے کوپن ہیگن" ایک تاریخی سفر نامہ

اردو میں سفر نامے کے ابتدائی نقوش سید احمد شہید بریلوی کی "سوانح احمدی" کے اس حصے سے ملتے ہیں جہاں اُنہوں نے 1821ءمیں سفر حج کے حالات لکھے ہیں۔ اس سے قبل فارسی زبان میں سفرنامے لکھے گئے ہیں۔ اردو میں اس کے بعد بھی جو سفرنامے سامنے آتے ہیں وہ سفر حج کے بارے میں ہی ہیں۔ لہٰذا یوسف خان کمبل پوش کا سفرنامہ عجائبات فِرنگ اُردو کا پہلا سفرنامہ کہلاتا ہے۔ خود اُنہوں نے اُسے تاریخ یوسفی کے نام سے موسوم کیا۔ اُس میں یورپ کے سفر کی روداد ہے۔ انگلینڈ اور فرانس کے شہروں اور دیہاتوں کا ذکر اور اُس زمانے کی مذہبی روایات کی تفصیل ہے'کمبل پوش نے 1837ءمیں سفر کا آغاز کیا۔ 1838ءمیں ہندوستان (کلکتہ) پہنچا اور 1847ءمیں یہ سفر نامہ پہلی بار دہلی میں شائع ہوا۔ جسے نول کشور لکھنو نے دربارہ 1873ءمیں شائع کیا۔

سفر نامہ نگار شخصی حوالہ ہوتے ہوئے بھی اپنے عہد کی تاریخ لکھتا ہے۔ جس ملک میں اس نے قدم رکھا ہے وہاں کے سیاسی۔ مذہبی اور اخلاقی رویوں کی تفصیل اسی صورت میں ممکن ہوسکتی ہے جب سفرنامہ نگار تعصب سے ہٹ کر چیزوں کو اس مُلک کے لوگوں کے تناظر میں دیکھ کر اپنا نقطہءنظر پیش کرے۔

ابن خِلدون نے بھی جب تاریخ لکھنے کا فیصلہ کیا تو وہ سفارتی اور سیاسی تجربات سے دوچار ہوچکا تھا۔ پھر ان تجربات کو قلعہ ابن اسامہ میں چار سال مُقیم رہ کر قلم بند کیا۔ اپنے بارے میں خود لکھا ہے۔

"میں نے تمام دنیا کے بکھیڑوں سے الگ ہوکر اس کتاب کی تالیف و تصنیف کا سلسلہ شروع کیا اور نئے اسلوب سے اس مقدمے کو تکمیل تک پہنچایا وہ اُس گوشہ نشین زندگی کی یادگار ہے۔"

اصل خزانہ تو گوشہ نشینی سے قبل جہاں گردی کے دوران مِلا۔ 26 برس اپنے وچن سے دُور رہ کر جو کچھ حاصل کیا وہ تاریخ کے اوراق میں منتقل کیا۔

یوں کہا جاتا ہے کہ کمبل پوش نے سفر اور سفرنامے کا حق ادا کیا۔ ابن خلدون نے تاریخ لکھنے کا حق ادا کیا۔ خوش نصیب ہیں وہ شخص جنہیں حق ادا کرنے کا موقع ملتا ہے۔ صلاحیت عطا ہوتی ہے اور حاکم وقت کی مراعات میسر ہوتی ہیں۔

الطاف شیخ نے بھی اپنے نئیں سفر اور سفر نامہ دونوں کا حق ادا کیاہے۔ عام فہم زبان میں قاری کو اپنے ساتھ لے کر چلنا اور ایک نئے ملک کے رسم رواج سے یوں آگاہ کرنا کہ طبیعت میں گرانی پیدا نہ ہو بلکہ دلچسپی اور حیرت کے ساتھ سوچنے پر مجبور ہوکہ ہمارا ملک ترقی کیوں نہیں کررہا۔ ہمارے ہاتھ میں پاکستانی پاسپورٹ دیکھ کر لوگ ہمیں کمتر کیوں سمجھتے ہیں۔ ہمارے سفارتخانوں میں اُن لوگوں کو تعین کیا جاتا ہے جنہیں وطن یا ہم وطنوں سے کوئی لگاؤ نہیں ہوتا۔ جو وہاں مفت خوروں کی طرح تنخواہ لے کر اپنے فرائض منصبی سے کوئی سروکار نہیں رکھتے۔

الطاف شیخ کے تمام سفر ناموں کا خاصہ یہ ہے کہ خود کسی لڑکی کے عشق میں مبتلا نہیں ہوتے نہ ہی کوئی لڑکی ان پر فدا ہوتی ہے۔ وہ صاف ستھری شادی شدہ زندگی بسر کرتے ہیں۔ دو بیٹیوں کے باپ ہیں اور ان کی تعلیم و تربیت میں دل لگاتے ہیں۔

وہ دس سال جاپان رہے اور دس سال ملائشیا۔ دونوں ملکوں کی زبانوں میں دسترس حاصل ہے لیکن دونوں ملکوں کی لڑکیوں سے کوئی سروکار نہیں۔ اُنہیں تو جہاز میں ملنے والی نارویجن خاتون کے بارے میں یہ جان کر دکھ ہوتا ہے کہ وہ بھارت میں دو ہفتے گزار کر آئی اور کراچی ایئر پورٹ پر رات گزارنے کے باوجود شہر دیکھنے نہیں گئی کیوں کہ وہ مسجدوں میں نمازیوں کی ہلاکت اور دیگر دہشت گردی کی خبریں پڑھ چکی تھی۔ لہٰذا اُسے موئن جو دڑو۔ بھنبھور اور کوٹ دیجی گھومنے کے لئے قائل کرنا بے س± ود تھا۔

کوئی بھی تخلیق نگار۔ اپنے ماحول، بچپن اور اپنے خاندان سے **الگ** ہوکر نہیں لکھ سکتا وہ جس ماحول میں زندگی بسر کرتا ہے۔ اورجس طرح اس کی تعلیم وتربیت ہوتی ہے۔ تحریریں اس کی ترجمانی کرتی ہیں۔ اسی طرح سفر نامہ نگار جہاں بھی جاتا ہے وہ اپنے **ملک** اور اپنی اقدارکو ساتھ لے جاتا ہے۔ وہ نئے **ملک** میں مقیم ہوکر بھی ہمہ وقت اپنے **ملک** اور اپنے **ملک** کے لوگوں سے موازنہ کرتا ہے۔ اپنے ہاں کی اچھی اور بری باتیں دونوں یاد آتی ہیں۔ اور پھر اُن کا تجزیہ بھی ہوتا رہتا ہے۔

الطاف شیخ صبح چار بجے اُٹھتے ہیں۔ خوش نصیب ہیں وہ لوگ جو صبح اُٹھ سکتے ہیں۔ صبح کا وقت تخلیقی عروج کا وقت کہلاتا ہے۔ اور روحانی سفرکے لئے بھی یہ ہی وقت موزوں ہے۔ صبح اٹھنا برسوں کی پابندی کے بعد عادت ثانیہ بن جائے تو تخلیقی اور روحانی تجربوں سے ہمکنار ہوکر اِنسان بہت کچھ لکھ سکتا ہے۔ الطاف شیخ نے۔ سمندرکا دن، ملائیشیاکے دن، یورپ کے دن۔ سندھی میں لوک ادب۔ جاپان کا لوک ادب۔ جیسی بہت سی کتابیں لکھیں اور ہمیں اپنے زندگی کے تجربوں میں **شریک** ہونےکا موقع دیا۔

”کوپن ہیگن ڈنمارک کا دارالحکومت۔ دنیاکا مصروف ترین اور سہولتوں سے آراستہ ہوائی اڈہ ہونے کے ساتھ اتنی ہی اہمیت کی بندرگاہ بھی ہے۔ ہمیں سوئیڈن کے شہر مالمو میں جانا تھا۔ اس لئے کوپن ہیگن اتر رہے ہیں۔ کیونکہ مالمو سے کوپن ہیگن اِتنا قریب ہے جتنا کیماڑی سے منوڑہ۔ جبکہ سوئیڈن کا دارالحکومت اسٹاک ہوم مالمو سے اِتنا دور ہے جتنا اسلام آباد سے کراچی۔“

مندرجہ بالا اقتباس سے اندازہ ہوتا ہےکہ سفرنامہ نگار فاصلہ ناپنے کا حوالہ بھی اپنے **ملک** کے شہروں اور بندرگاہوں کا ہے۔ اس طرح پاکستانی قاری اُن جگہوں سے نا صرف مانوس ہوتا ہے بلکہ فاصلہ بھی آسانی سے سمجھ سکتا ہے۔

اس طرح Hoover craft کے بارے میں لکھا ہے۔ ”گھوڑے اور گدھے کے بیچ کی خچر نما چیز۔ یعنی وہ ہوائی جہاز اور پانی کے جہاز والی چیز ہے۔ خشکی پر بھی کھڑا ہوسکتا ہے اور پانی میں بھی۔ بحری جہاز اور ہوورکرافٹ میں یہ فرق ہےکہ سطع آب سے اوپر چلنے کے باعث مسافروں کوSea Sickness نہیں ہوتی۔“ ایک اور اقتباس ملاحظہ ہو:۔

”سویڈن ہر شعبے میں ترقی کی راہ پر گامزن ہے سوائے آبادی میں اضافہ کے۔ جس **ملک** میں سب سے زیادہ لوگ خودکشی کرتے ہوں، سالانہ طلاقوں کی شرح شادیوں سے زیادہ ہو۔ عورتوں کو بچہ پالنے سے زیادہ کتا پالنے کا شوق ہو، وہاں آبادی خاک بڑھے گی۔۔۔ سویڈن میں جس کے سب سے زیادہ بچے ہیں وہ ایک پاکستانی ہے جو 25 سال پہلے یہاں آکر آباد ہوا تھا ،جس کے چار بچے ہیں اور اخبارات میں اس کی تصویر شائع ہوئی ہے۔“

ہم جب پاکستان سے باہر جاتے ہیں تو زیادہ حساس ہوتے ہیں۔ پاکستان یا پاکستانی کے بارے میں کوئی بھی خبر ہمیں سنائی دیتی ہے تو ہم فوراً توجہ دیتے ہیں،کسی سیمینار میں شرکت کے لئے جائیں اور پتہ چلے کہ تمام ممالک کے باشندے ایک ہفتہ قبل پہنچ چکے تھے سوائے پاکستان کے، افتتاحی تقریب میں بھی نمائندگی نہیں ہوسکی تو بہت افسوس ہوتا ہے۔ پاکستان کی بیوروکریسی کی پیچیدگیوں پر غصہ آتا ہے۔

اس سفرنامے کو پڑھنے کے بعد کوئی بات بھی طبعیت پر گراں نہیں لگتی۔ ہلکے پھلکے انداز میں بات کرکے اپنے ملک پر تنقید کی ہے جو محبت، سچائی اور دیانت داری پر بنی ہے۔

مثلاً:۔

1.سویڈن میں مختلف ممالک سے لوگ آکر رابطے کی زبان انگریزی سیکھ لیتے ہیں۔ لیکن ہمارے ہاں اردو کو رابطے کی زبان نہیں سمجھا جاتا۔ قومی زبان بھی ڈنڈے کے زور پر کہلائی اور بنگالیوں کو ناراض کیا۔ بنگلادیش وجود میں آیا۔

2. مسلمان جہاں بھی ہوں۔ عید منانے پر جگھڑا رہتا ہے۔کوئی اتحاد نہیں۔

3.آج بھی یورپی مسافر ایشیائی یا افریقی کے قریب والی سیٹ پر بیٹھنا گوارا نہیں کرتے۔

4.ہمارے سفارتخانے کرپشن کا شکار ہیں۔

5.جاپانی بھی پاکستانیوں سے نفرت کرتے ہیں۔

6.پاکستانی باہر جاتے ہیں تو ہر کوئی لیڈر بن جاتا ہے۔ اسی لیے چھوٹے گروہوں میں بٹے ہوئے ہیں۔

7.پاکستانی لبنیٰ علی چار ہزار امید داروں میں کامیاب ہونے والے تین سو کیڈٹوں میں ایک جبکہ ناروے کی پولیس اکیڈمی کا معیار کافی بلند ہے۔

ان تمام نکات سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ الطاف شیخ نے پاکستانیوں پر مستقل نظر رکھی ہے۔ پاکستانی اپنی ذاتی صلاحیت کا مظاہرہ کرتے ہیں تو وہ کامیاب ہوتے ہیں۔ لبنیٰ علی کا کام ہونا کوئی معمولی بات نہیں۔ ناروے کی پولیس اکیڈمی کا داخلہ ٹیسٹ انتہائی مشکل ہوتا ہے۔

مختصر یہ کہ سیاسی اکھاڑ پچھاڑ۔ اور بیوروکریسی کی کرپشن کا شکار ہونے کے باوجود پاکستانی عوام حوصلہ نہیں ہارتے اور وہ جہاں بھی جاتے ہیں۔ بہتر زندگی کا خواب لے کر جاتے ہیں۔

بہر حال بہتر زندگی کا خواب تو ہر ملک کا ہر شہری دیکھتا ہے۔ روس کے شہری ہوں یا امریکہ اور ایشا کے۔ اصل مسئلہ وسائل کا ہونا یا نہ ہونا ہے۔ جس ی بناءپر انسان امارات اور غربت کے خانوں میں تقسیم کردیا جاتا ہے۔

الطاف شیخ نے نہایت چابک دستی سے اسی نکتے کو اجاگر کیا ہے۔ افلاس کو سب سے بڑی لعنت اور بیماری کہا ہے۔

آئیے ہم سب فیصلہ کریں ہمیں اسی بیماری کے خلاف جہاد کرنا ہے۔

الطاف شیخ مبارک کے مستحق ہیں۔ اس سفر نامے کے ذریعے ہمیں اپنی غلطیوں کے بارے میں سوچنے کی صلاح دے کر اپنی تقدیر بدلنے کی نویددی ہے۔

فردوس حیدر

ستمبرء 2004

کراچی

کوپن ہیگن کی طرف

جہاں بارہ گھنٹے کا سفر ہو وہاں ایک آدھ گھنٹے کی تاخیر کوئی بڑی بات نہیں ہے۔ پی آئی اے کے جس ہوائی جہاز سے ہم لوگ کراچی سے کوپن ہیگن جا رہے تھے کا مقررہ وقت نو بجے تھا مگر جہاز نے ساڑھے نو بجے کراچی سے پرواز کی۔ اس میں مسافروں اور جہاز کی حفاظت کے لئے کئی ضروری اقدامات لازمی ہیں جس کی وجہ سے پرواز کی روانگی میں اکثر تاخیر ہو جاتی ہے ورنہ ہائی جیکنگ "فیشن" سے قبل مسافر ایئرپورٹ پر تقریباً آدھ گھنٹہ پہلے پہنچتے تھے۔ اپنے سامان کا وزن کرواتے اور جہاز میں جاکر بیٹھتے تھے۔ اس لئے ہر مسافر کو شک کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے کہ کہیں وہ طیارے میں سوار ہونے کے بعد مسافروں اور طیارے کے لئے درد سر نہ بنے۔ ظاہر ہے کہ نہ صرف طیارے کے مسافر ¾ پائلٹ اور جہاز کے مالکان کے ساتھ وہ ملک بھی کڑے امتحان میں آ جاتا ہے جس کی سرزمین پر ہائی جیک کردہ طیارہ اتارا جاتا ہے۔

اور یہی عالم سفر مکمل کرنے پر جہاز سے اتر کر ایئرپورٹ سے باہر نکلتے وقت ہوتا ہے۔ خصوصاً ہمارے خطے کے ملکوں کے لوگوں کے لئے دنیا کے ہر ملک کے کسٹم کا عملہ اور اسپیشل پولیس ہر ایک پر شک کرتی نظر آتی ہے کہ ان میں سے کوئی منشیات اسمگلر تو نہیں ہے اور اپنے ملک کا کسٹم عملہ ہمیں گھور گھور کر دیکھتا ہے کہ کہیں یہ کھیپیا تو نہیں یعنی وہ کھیپیا جس نے ان سے چائے پانی کی بات طے نہیں کی ہے۔ ہمارے ملک کے کئی تھانوں کی پولیس بھی ایسے چور یا ڈاکو کو ہرگز برداشت نہیں کرتی جو پہلے سے ان کو اعتماد میں لئے بغیر چوری پر نکل پڑتا ہے۔

بہر حال پی آئی اے کے اس طیارے نے کراچی سے صبح نو بجے کی بجائے ساڑھے نو بجے پرواز ضرور کی لیکن پائلٹ نے یہ آدھے گھنٹے کی تاخیر کسی نہ کسی طرح پوری کرکے طیارے کو ڈنمارک کے ہوائی اڈے کوپن ہیگن پر اپنے مقررہ وقت یعنی ڈیڑھ بجے اتارا۔ کوپن ہیگن اور کراچی کے وقت میں چار گھنٹے کا فرق ہے یعنی اس وقت کراچی میںساڑھے پانچ بجے ہوں گے مجھے اور میرے ساتھ سفر کرنے والے میرے ساتھی کیپٹن سلیم قاسم کو ڈنمارک کے اس شہر کوپن ہیگن سے سوئیڈن کے جنوبی شہر اور بندرگاہ مالمو جانا تھا۔

مالمو جہاز سازی کے کارخانوں اور ورلڈ میری ٹائم یونیورسٹی کی وجہ سے دنیا بھر میں مشہور ہے۔ ورلڈ میری ٹائم یونیورسٹی دنیا میں اپنی نوعیت کی واحد یونیورسٹی ہے جہاں دنیا بھر سے جہاز رانی سے تعلق رکھنے والے سینئر افسران مختلف مضامین میں ایم ایس سی کرنے آتے ہیں۔

کراچی سے کوپن ہیگن کی پرواز کے دوران پی آئی اے والوں نے جو ناشتہ اور دوپہر کا کھانا دیا وہ ٹھیک ٹھاک تھا۔ نہ موٹی پاپڑی والے آلو اور لال مرچوں سے بھرے ہوئے سموسے تھے اور نہ کچے خمیر کی ڈبل روٹی تھی۔ اس لئے کسی کو شکایت نہ ہوئی کم از کم ہمارے اردگرد بیٹھے ہوئے سارے لوگ مطمئن تھے۔ کھانے کے علاو کیبین اسٹاف بھی اچھے اخلاق کا مظاہرہ کررہا تھا۔ جہاز میں سوار سوئیڈش، ڈینش، نارویجن اور دوسرے یورپی لوگ باربار باورچی خانے میں جاکر ایئر ہوسٹس سے کوکا کولا، فانٹا یا دوسرے مشروبات اور جوس لے رہے تھے۔ ہم نے بھی ایک دو دفعہ سیون اپ جیسا سفید شربت (شاید ببل اپ یا اسپرائٹ ہو) لیکر پیا کچھ پیاس بجھانے کے لئے کچھ وقت پاس کرنے کے لئے۔ جہاز میں آٹھ نو گھنٹے بیٹھ کر اور کیا کیا جائے۔ رات ہوتی تو دوسروں کو سوتا دیکھ کر ہم بھی آنکھیں بند کرکے سونے کی کوشش کرتے لیکن چونکہ دن کا سفر تھا اور سورج کی تیز روشنی کی وجہ سے سب کا سکون برباد تھا۔ ایئر ہوسٹس پوری کوشش کررہی تھیں کہ کھڑکیوں کے فلیپر بند رہیں تاکہ جہاز میں اندھیرا چھانے کی وجہ سے جو جہاں ہے وہیں رہے لیکن عادت سے مجبور کوئی نہ کوئی مسافر پردہ ہٹاکر باہر دیکھنے کا شوق پورا کرتا اور سورج کی تیز روشنی پورے جہاز کو روشن کردیتی جن کی آنکھ لگ چکی تھیں وہ بھی آنکھیں مَل کر اٹھ بیٹھتے اور پھر یا تو ٹانگیں سیدھی کرنے کے لئے ٹائلٹ، باورچی خانے جاتے یا ادھر ادھر ٹہلنا شروع کردیتے۔ ایئر ہوسٹس کو بلاکر پانی، شربت، اخبار یا کمبل کی فرمائش کرتے یا کسی نہ کسی چیز کی شکایت کرتے۔ یہی وجہ ہے کہ مسافر چاہیں نہ چاہیں لیکن کیبن کریو کی یہی خواہش ہوتی ہے کہ سفر رات کا ہو۔ مسافر سخت تھکا ہوا ہو تاکہ کھانے کا کام ختم ہونے کے بعد وہ چپ چاپ سوجائے یا خاموشی اختیار کرلے۔ یہ ایسے ہی ہے جیسے گھر کے سارے کمروں کی بتیاں جلتی رہنے سے مہمانوں کے بچے پورے گھر میں دوڑتے اور شور کرتے رہتے ہیں آپ باقی کمروں اور برآمدوں کی بتیاں بجھاکر اندھیرا کردیں تو سارے بچے ایک کونے میں خاموش ہوکر بیٹھ جائیں گے۔

شربت پینے کے بعد ایک دفعہ میں نے کافی کی بھی فرمائش کی۔ ہم نے سمجھا کہ پی آئی اے کا عملہ یہ نخرے نہیں برداشت کرے گا۔ لیکن حیرت انگیز بات یہ تھی کہ اسٹیورڈ نے بغیر منہ بنائے کہا :© آپ چل کر بیٹھیں کافی بھجوادیتے ہیں۔

تھوڑی دیر کے بعد ایئر ہوسٹس کیپٹن سلیم اور میرے لئے شربت کے پلاسٹک والے گلاسوں میں کافی لے آئی۔ سلیم سمجھ گیا کہ مگ یا کپ میں کافی لانے کی بجائے گلاس میں اس لئے لائی ہے تاکہ کسی اور کو پتہ نہ چلے کہ اب کافی کا دور شروع ہوگیا ہے۔ یہ ایسے ہی ہے جیسے کسی محفل میں ایک کے پانی مانگنے پر سب شروع ہوجاتے ہیں

اور پلانے والا دو رکعت نفل کے ثواب سے ہی ہاتھ اٹھا لیتا ہے۔ دعا کرتا رہتا ہے کہ بس جان چھوٹے یا جگ اور گلاس ٹوٹے۔

ویسے تو آج کل ہوائی کمپنیاں اتنی کنجوس ہوگئی ہیں کہ جہاز میں بیٹھنے کے بعد صرف پہلا گلاس شربت یا جوس کا مفت میں نصیب ہوتا ہے اسکے بعد کوئی کافی پئے یا بیئر یا صرف نلکے کا پانی پہلے پیسے ہاتھ پر رکھے پھر بات کرے۔ اس خیال سے پی آئی اے کا مذکورہ کام اجر کا سمجھنا چاہیے جس کی جزا ان کو ضرور ملے گی۔

چلے تو کٹ ہی جائے گا سفر

لمبے سفر میں پی آئی اے یا دوسری ہوائی کمپنیوں والے ایک یا دو فلمیں ضرور دکھاتے ہیں۔ کراچی سے کوپن ہیگن تک کی اس پرواز میں ہمیں بھی ایک انگریزی فلم دکھائی گئی ویسٹرن ٹائپ، جس میں فلمی اداکاروں سے زیادہ اچھی اداکاری گھوڑے کرتے ہیں۔ فلم کے علاوہ تھوڑے تھوڑے وقفے سے کئی کارٹون فلمیں بھی دکھائی گئیں جن کو دیکھ کر بچے تو کیا بڑے بھی مسکراتے رہے۔ پاکستانی گیتوں اور غزلوں کی بھی ایک کیسٹ چلائی گئی جو (جیساکہ اس میں بار بار بتایا جارہا تھا) پی آئی اے اور پاکستان ٹیلی وژن کی مشترکہ تعاون سے تیار کی گئی تھی۔ ضرور ایسا ہی ہوا ہوگا چونکہ اس کے معیار سے پتہ چل رہا تھا۔ یہ کیسٹ گزشتہ تین سال سے پی آئی اے کی بیرون ملک پروازوں میں مسلسل دکھائی جارہی ہے۔ گیتوں اور غزلوں کی اس کیسٹ کی جھلک جن دنوں یہ تیارے ہوئی تھی میں نے کوالالمپور میں ایک پاکستانی کے ہاں دیکھی تھی۔ ویسے تو اپنے وطن سے زیادہ عرصہ دور رہنے کے بعد اپنے ملک کے کوے بھی پرائے دیس کے طوطوں سے اچھے لگنے لگتے ہیں لیکن گیتوں اور غزلوں کی یہ کیسٹ کسی بھی پاکستانی کو اچھی نہیں لگی۔ ایسے لگا جیسے ریڈیو پاکستان حیدرآباد سے کوئی سفارشی گلوکار ریڈیو اسٹیشن پر کام کرنے والے شاعر قسم کے اعلیٰ افسران کے لکھے ہوئے ردیف اور قافیہ سے عاری کلام سنائے جارہا ہو۔

عابدہ پروین کا شمار بہت اچھی گانے والوں میں ہوتا ہے۔ اس نے سندھی کے علاوہ سرائیکی، اردو اور پنجابی زبان میں بھی اپنے فن کا مظاہرہ کیا ہے لیکن ضروری نہیں کہ کسی گلوکار کا ہر گانا ہٹ ہو۔ اس کیسٹ میں عابدہ پروین کا یہ گانا سر میں درد پیدا کرنے والا ہے۔ کلاسیکل ہونے کی وجہ سے پاکستانیوں کو بھی مشکل سے پسند آتا ہے۔ میں نے کھڑے ہو کر جہاز میں چاروں طرف نظر دوڑائی تو سوائے کیپٹن سلیم اور میرے کوئی بھی پاکستانی نہ تھا۔ سارے مسافر نارڈک ملکوں (ناروے، ڈنمارک، سویڈن وغیرہ) کے یا مغربی یورپ کے تھے اور جب ہم ہی بور ہو رہے تھے تو ذرا سوچیں ان کا کیا حشر ہورہا ہوگا۔ کبھی کبھی خراب سُر والی خاتون ٹی وی پر آجائے تو بھی لوگ نظریں نہیں ہٹاتے اور دیکھنے والے گانے کے تین منٹ گلوکارہ کے خوبصورت چہرے کو یا اس کے رنگین لباس کو یا اچھے ڈانس کو دیکھتے رہتے ہیں۔ لیکن یہاں عابدہ پروین اجرک اوڑھے زمین پر بیٹھی آدھے گھنٹے سے آ آ آ کر رہی تھی جو یقینا ایک کلاسیکل موسیقی کے ماہر کے لئے لاجواب چیز ہوگی لیکن ہمارے لئے ایسے تھا جیسے شمالی یورپ یا کینیڈا کے دور دراز دیہات کے کسی چرچ میں کوئی ٹیڑھا منہ کر کے شیکسپیئر کے زمانے کا کوئی کلاسیکل راگ سنا رہا ہو جو راگ کم گیدڑ کی آواز زیادہ ہوتی ہے۔

دراصل یہ یہی چیز ہے جس میں بھارت ہم سے آگے نکل جاتا ہے۔ وہ سننے والوں کی پسند کا خیال کرکے گانوں کے ساتھ ساتھ گانے والیوں اور ڈریس اور ڈانس کو بھی مدنظر رکھتا ہے۔ اس قسم کی بات اگر ہم پی آئی اے کے متعلقہ شعبے سے کریں تو وہ ایک دم مذہب کو بیچ میں لاکھڑا کریں گے پھر ان کو کون سمجھائے کہ اگر مذہب کی بات ہے تو پھر ایئروہسٹسوں کو ننگے سر نامحرموں کو سروس نہیں دینی چاہیے۔ ان کے لئے برقعے کا بندوبست ہونا چاہیے۔ گیتوں کی اس کیسٹ میں بہر حال کوئی سننے کی چیز تھی تو وہ مسرت نذیر تھی۔ وہ چاہے جتنی بھی عمر کی ہو

لیکن اس کے گانے کا انداز بہت ہی جاندار اور پُراثر ہے۔ کسی اور کو یہ انداز پسند آئے یا نہ آئے لیکن مجھے بہت پسند آیا۔ اِس وقت بھی اُس کے گانے کے بول میرے دماغ اور کانوں میں تازگی کا احساس پیدا کررہے ہیں۔

چلے تو کٹ ہی جائے گا سفر آہستہ آہستہ

ہم اس کے پاس جاتے تھے مگر آہستہ آہستہ

ابھی تاروں سے کھیلو چاند کی کرنوں سے اِٹھلاو ٔ

ملے گی اُس کے چہرے کی سحر آہستہ آہستہ

اس گانے کے انتخاب اور پیش کرنے پر پی آئی اے والوں کو کریڈٹ دینا ضروری سمجھتا ہوں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ پی آئی اے والے دانستہ یا غیر دانستہ کبھی کبھار خیر کا کوئی ایسا کام کرلیتے ہیں جس سے ان کے پچھلے گناہ دھل جاتے ہیں۔ پی آئی اے کی اس وقت یہ بیلنس شیٹ بناتے وقت ان کی **ایک** اور اچھائی کا یہاں پر ذکر کرنا بلکہ ان کے کھاتے میں ڈالنا ضروری سمجھتا ہوں۔ مسافروں کی دلچسپی کے لئے وہ تھوڑی تھوڑی دیر کے بعد طیارے کی جغرافیائی پوزیشن بتاتے رہے کہ وہ اس وقت کس رفتار سے، کتنی بلندی پر اور کہاں (یعنی کس **ملک** یا سمندر پر) پرواز کر رہا ہے۔ بحری جہاز چلانے والے کیپٹن سلیم اور میرے لئے یہ چیز کافی معلوماتی تھی۔ میں ہمیشہ یہ سمجھا کرتا تھا کہ ہوائی جہاز شہد کی مکھی کی طرح سیدھی لکیر میں سفر کرتا ہے۔ سمندر میں پہاڑ، جزیرے یا ہوا اور لہروں کے خراب رخ کی وجہ سے ہم لوگوں کا تو زیادہ تر چلنا شطرنج کے گھوڑے کی طرح بھی ہو جاتا ہے لیکن ہمارا یہ طیارہ نہ معلوم کیوں **ایک** دو مرتبہ سیدھا اُڑنے بجائے دائیں بائیں رخ اختیار کرلیتا تھا اور کافی فاصلہ طے کرنے کے بعد واپس اپنے راستے پر آتا تھا۔ ظاہر ہے کہ اس طرح سے نہ صرف سفر لمبا ہو جاتا ہے بلکہ تیل بھی زیادہ خرچ ہوتا ہے اور آکٹین کوئی سستا تیل تو ہے نہیں۔ ہو سکتا ہے عراق اور ایران میں جنگی حالات کی وجہ سے وہاں کی فضائی حدود سے گذرنے سے گریز کیا جا رہا ہو۔ بہرحال آج کل ہر چیز ریکارڈ ہونے کی وجہ سے بحری یا ہوائی جہاز چلانے میں شاید ئی کوئی غلطی چُھپ سکتی ہو۔

غلطی کرنے پر پائلٹ صاحبان کو اپنے ہیڈ آفس سے ضرور ڈانٹ سُننا پڑتی ہوگی۔ ہمارے **ایک** سری لنکن دوست کو کولمبو ہیڈ آفس پر پہنچنے پر ہمیشہ اس سلسلے میں اس سے پوچھ کچھ ہوتی تھی۔ وہ سفر کے آخری گھنٹے اپنے بحری جہاز کو کیڑے مکوڑے کی طرح چلاتا تھا، یعنی ٹیڑھا میڑھا اور آہستہ آہستہ تاکہ جہاز بندرگاہ میں آدھی رات کو پہنچنے کی بجائے صبح کو روشنی میں پہنچے اور وہ آرام سے بندرگاہ کے قریب آ سکے۔ بہر حال اس جوان نے کبھی یہ نہیں مانا کہ اسے ڈر لگتا ہے یا اسے خود پر اعتماد نہیں ہے۔ ہمیشہ یہ کہتا تھا کہ موسم اور سمندر خراب ہونے کی وجہ سے اس نے رفتار کم کی اور ہوا اور لہروں سے زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھانے کے لئے جہاز کا رخ ادھر ادھر موڑا۔

ٹی وی اسکرین پر اور چیزوں کے ساتھ ساتھ باہر کا درجہ حرارت بھی دکھایا جارہاتھا جو تقریباً منفی 45 ڈگری سینٹی گریڈ تھا۔ منفی 4سینٹی گریڈ پر تو پانی برف ہو جاتا ہے۔منفی 45 ڈگری سینٹی گرید درجہ حرات (ٹھنڈ) میں تو ہوا میں موجود کاربن ڈائی آکسائیڈ گیس بھی مائع یا برف کی صورت اختیار کرلیتی ہے اور اتنی اونچائی پر اگر جہاز پھٹ جائے تو مسافر تو مارے ٹھنڈ کے وہیں ختم ہو جائے۔ اتنی بلندی سے زمین پر آکر گرنا یا سمندر میں ڈوبنا تو بعد کی بات ہے۔

ہوائی جہاز میں سفر کرتے وقت میں ہمیشہ یہ سوچا کرتا ہوں کہ اتنی بڑی بلاکو اتنی بلندی پر لے جا کر اڑانے کے ساتھ ساتھ اندر کا درجہ حرارت اور پریشر برقرار رکھنا (جس میں ہمیں ایسا لگتا ہے جیسے زمین پر اپنے گھر میں چل رہے ہوں) ایئرو ڈائنامکس اور Aviation کا کمال ہے اور اتنی بلندی پر تھکے ہوئے اور بور مسافروں کو مزید بور کرنے کے لئے عابدہ پروین اور مہدی حسن کی کلاسیکل راگنیاں سنانا یہ پی ٹی وی اور پی آئی اے کا مشترکہ کمال ہے۔

کس سانپ نے ڈسا ہے۔۔۔

کراچی سے کوپن ہیگن تک کے سفر میں کوئی ایسی قابل ذکر بات نہیں ہوئی جو میں یہاں بیان کروں، بس کبھی سوتے رہے یا کھڑکی سے نیچے جھانکتے رہے جہاں سوائے بادلوں کے اور کچھ نظر نہیں آ رہا تھا۔ کبھی کبھار ٹی وی پر نظریں جمالیتے یا ارد گرد بیٹھے ناردرک ملکوں کے لوگوں کی باتیں سننے لگتے جن کی آواز کانوں کو انگریزی سے اتنی مختلف لگ رہی تھی جتنی تامل زبان عربی یا پشتو زبان بنگالی سے۔ اب آنے والے دو برس ہمیں یہ زبانیں (سوئیڈش، ڈینش اور نارویجن) بولنے والے لوگوں کے درمیان گزارنے تھے۔

ترکی کے اوپر سے گزرتے وقت ہمیں نیچے زمین پر کئی دائرے نظر آئے۔ درمیان میں چھوٹے قطُر کے گرد باہر کی طرف بڑے قطُر کے تھے۔ کافی دیر تک یہ سلسلہ چلتا رہا اور کیپٹن سلیم قاسم اور میں یہ ہی سوچتے رہے کہ زمین پر یہ کیا چیز ہو سکتی ہے۔ ہمارے آگے اور پیچھے بیٹھے ہوئے لوگ بھی مستقل نیچے دیکھ رہے تھے اور صاف لگ رہا تھا کہ وہ سمجھ گئے تھے کہ یہ کیا چیز ہے۔ مجھ سے رہا نہ گیا اور میں نے اگلی سیٹ پر بیٹھی خاتون جو کراچی ایئر پورٹ پر بھی ہمارے ساتھ بیٹھی اس پرواز کا انتظار کر رہی تھی، سے انگریزی میں پوچھا کہ یہ کیا ہے۔ "پہاڑ" جونہی اس نے جواب دیا تو مجھے اپنے کیڈٹ کالج کے دن یاد آگئے جب میٹرک میں ہمارا مضمون میپ ریڈنگ ہوا کرتا تھا اور ہمارے استاد کیپٹن عالم جان محسود (جو لیفٹیننٹ جنرل ہوکر ریٹائرڈ ہوئے) بتایا کرتے تھے کہ نقشے میں پہاڑ کی نشانی تین چار مختلف قطر کے دائرے ہوتی ہے کیونکہ اوپر سے پہاڑ ایسے ہی نظر آتے ہیں۔ ہم ترکی کے اس علاقے سے گزر رہے تھے جہاں بہت زیادہ پہاڑ ہیں اور وہاں زیادہ تر کُرد باشندے آباد ہیں۔

میرے آگے بیٹھی ہوئی یہ نارویجن خاتون کافی دیر تک ترکی کے اس علاقے کے بارے میں بتاتی رہی۔ اس نے بتایا کہ وہ اپنے ملک ناروے میں جغرافیہ کی استاد رہ چکی ہے۔ حال ہی میں ریٹائر ہوئی ہے اور اس وقت اپنی سہیلیوں کے ہمراہ نیپال اور شمال بھارت کی سیر کے بعد وطن واپس جا رہی ہے۔

"لیکن آپ تو کراچی سے سوار ہوئی تھیں"۔ میں نے حیرت سے پوچھا۔

"دراصل ہمارے لئے پی آئی اے کی وہ پرواز آسان رہتی ہے جو براہ راست کوپن ہیگن آتی ہے جہاں سے ہم بذریعہ کشتی اپنے اپنے شہروں یا جزیروں کی طرف روانہ ہو جاتے ہیں۔ کل شام کو ہم سنگاپور ایئر لائنز کے جہاز سے بمبئی سے کراچی پہنچے تھے۔ رات ہوائی اڈے پر گذار کر صبح صبح آپ لوگوں کے ساتھ اس جہاز میں سوار ہوئے۔"

اپنے ملک کی تاریخی چیزوں اور قدرتی نظاروں کو جب دنیا کے دوسرے ملکوں کی ان چیزوں سے موازنہ کرتا ہوں تو ہمارا ملک کسی سے کم نہیں لگتا اور جب سیاحوں کو دوسرے ممالک میں گھومتے پھرتے دیکھتا ہوں تو میرے دل میں ایک عجیب غم و غصے کی کیفیت پیدا ہوتی ہے کہ یہ لوگ ہمارے ملک میں کیوں نہیں آتے۔ ہم لوگوں سے کیوں دور بھاگتے ہیں۔ ہمارے ملک کی چیزیں دوسروں کیلئے کیوں پُرکشش نہیں ہیں۔ اور اب اس ناریجن خاتون سے یہ سن کر کہ وہ ہمارے پڑوسی ممالک میں کوئی دو ہفتے گزار کر آئی ہے اور ہمارے ملک میں پہنچ کر بھی کچھ دیکھنے کے لئے اس کا دل نہیں مانا، مجھ سے رہا نہ گیا اور میں نے کہہ دیا۔ "میڈم کمال ہے آپ کراچی میں آکر بھی ایئر پورٹ سے باہر کراچی دیکھنے نہیں نکلیں۔"

وہ خاموش رہی۔ کیا سوچ رہی تھی میرے لئے اندازہ لگانا مشکل تھا۔ ہو سکتا ہے میری بات اسے درست لگ رہی ہو اور وہ اس پر افسوس کر رہی ہو کہ وہ کراچی میں کچھ نہ دیکھ پائی۔

”اور اگر تھوڑی سی ہمت کرتیں تو دنیا کی پانچ ہزار سال پرانی تہذیب موئن جو دڑو بھی دیکھ سکتی تھی کیونکہ کراچی سے وہ زیادہ دور نہیں مالمو سے جتنا اسٹاک ہوم ہے اس کا مشکل سے چوتھائی فاصلہ کراچی سے لاڑکانہ تک ہے۔۔۔“ میں ایک سیاحتی ایجنٹ کی طرح بولتا چلا گیا لیکن اس کے چہرے پر نہ کسی جذبے کا اظہار ہوا اور نہ ہی اسنے کچھ کہا۔ اچانک میں چپ ہوگیا۔ مجھے ایک دن پہلے کی ایک خبر یاد آگئی جو ڈاکوؤں نے گھر میں موجود خاتون اور ان کے بچوں کو قتل کردیا تھا۔

میں نے اپنا دھیان ان خبروں سے ہٹا کر ایک غیر ملکی کو موئن جو دڑو، بھبھور، کوٹ ڈیجی اور روہڑی گھومنے کے لئے قائل کرنے کی کوشش کی۔ ”سندھ کے لوگ بڑے مہمان نواز ہیں۔۔۔“

”جان و مال کی حفاظت اور رہائش کی سلامتی بھی تو ہو۔ ایسے میں وہاں کوئی کیسے جائے۔“ اس نے آخر جواب دیا۔ دنیا کے دور دراز کونے سے آئی ہوئی ایک خاتون ہمارے علاقوں کا کتنا علم رکھتی ہے اس کا یہ جملہ سن کر مجھے ایسے لگا جیسے میرا جھوٹ پکڑا گیا ہو۔ واقعی وہ کوئی اندھی یا بہری تو تھی نہیں۔ یہ لوگ ہم سے زیادہ اخبار اور ریڈیو ٹی وی دیکھتے ہیں۔ سندھ کے لوگ مہمان نواز ضرور ہیں لیکن اب گزشتہ دس بارہ سال سے سندھ میں کیا کچھ ہو رہا ہے وہ کسی سے ڈھکا چھپا نہیں ہے۔ سندھ جہاں دن دہاڑے ڈاکے پڑتے ہیں۔ سندھ جہاں انسانوں کو اغواءکر کے بھیڑ بکریوں کی طرح فروخت کیا جاتا ہے، ان کے پاؤں میں بیڑیاں ڈال کر کھڈوں میں چھپا کر ان کا سودا کیا جاتا ہے۔ سندھ جہاں کے لوگ نہ خواتین اور بچوں کو چھوڑتے ہیں نہ مسجدوں میں نماز پڑھنے والوں کو۔ سندھ جہاں بموں سے حملے کرکے گاؤں کے گاؤں تباہ کردیئے جاتے ہیں۔ ایک غیر ملکی کو کس سانپ نے ڈسا ہے کہ وہ دنیا چھوڑ کر یہاں گھومنے آئے اور اپنی جان کو خطرے میں ڈالے۔ میں خاموش ہوگیا۔

ہوور کرافٹ یا خچر

ڈنمارک کا دارالحکومت اور بین الاقوامی ہوائی اڈہ کوپن ہیگن ہے۔ کوپن ہیگن میں دنیا کا مصروف ترین اور سہولتوں سے آراستہ ہوائی اڈہ ہونے کے ساتھ ساتھ اتنی ہی اہمیت کی بندرگاہ بھی ہے۔ دنیا کے مختلف ممالک میں سامان کو جلد سے جلد پہنچانے کے لئے آنے والے دور میں کیا کرنا چاہیے؟ اس سلسلے میں جہاز رانی اور نقل و حمل کے ماہرین کا یہ خیال ہے کہ دنیا کے مختلف کونوں میں چند بہت بڑی بندرگاہیں بنائی جائیں جہاں پر دیوہیکل اور تیز رفتار بحری جہازوں کے ذریعے سامان پہنچایا جائے۔ وہاں سے چھوٹے جہاز سامان لے کر اڑوس پڑوس کے ملکوں میں پہنچائیں۔ اس سلسلے میں پورے یورپ میں ڈنمارک کی حکومت اپنی بندرگاہ کوپن ہیگن کو مطلوبہ معیار پر لانے میں کافی حد تک کامیاب ہوئی ہے جس طرح ایشیائی ملکوں میں سنگاپور کو یہ مقام حاصل ہے۔

ہمیں سوئیڈن کے شہر مالمو جانا تھا جس کے لئے ہم سوئیڈن کے بین الاقوامی اڈے پر اترنے کی بجائے ڈنمارک کے ہوائی اڈے کوپن ہیگن پر اتر رہے تھے کیونکہ مالمو سے کوپن ہیگن اتنا قریب ہے جتنا کیماڑی سے منوڑہ اور سوئیڈن کا اپنا دارالحکومت اور بین الاقوامی ہوائی اڈہ اسٹاک ہوم مالمو سے اتنا دور ہے جتنا اسلام آباد سے کراچی۔ ایسی صورت میں کون مزید دو گھنٹے کا سفر کرکے اسٹاک ہوم پہنچے اور پھر بس یا جہاز سے واپس مالمو آئے۔

جس جزیرے پر کوپن ہیگن ہے اس کے اور سوئیڈن کے اس جنوبی بندرگاہ مالمو کے درمیان بالٹک سمندر کا ایک معمولی سا حصہ ہے جسے مختلف کمپنیوں کی کشتیاں (Ferries) ایک ڈیڑھ گھنٹے میں عبور کرکے مسافروں اور انکی کاروں، بسوں وغیرہ کو مالمو سے کوپن ہیگن اور کوپن ہیگن سے مالمو پہنچاتی رہتی ہیں۔ تیز رفتار بحری جہاز ہودرکرافٹ تو یہ سفر آدھے گھنٹے میں طے کرلیتے ہیں۔ ہمارے پاس ہوور کرافٹ (Hoover Craft) کا ٹکٹ تھا جو ہوائی اڈے کے ٹرانزٹ لاؤنج کے سامنے خشکی پر مسافروں اور ان کے سامان کا انتظار کررہا تھا۔

ہوور کرافٹ، بقول کیپٹن سلیم قاسم کے، گھوڑے اور گدھے کے بیچ کی خچر نما چیز ہوتی ہے یعنی وہ ہوائی جہاز اور پانی کے جہاز کے درمیان والی چیز ہے۔ خشکی پر بھی کھڑا ہو سکتا ہے اور پانی میں بھی۔ بیرونی شکل پانی کے جہاز جیسی ہوتی ہے لیکن انجن اور اندر بیٹھنے کا انتظام ہوائی جہاز کی طرح ہوتا ہے۔ ہوائی جہاز کی طرح سیٹیں اور سیٹ بیلٹ ہوتے ہیں۔ دروازے پر یونیفارم میں کھڑی ہوسٹس مسافروں کو نمبروں کے مطابق سیٹوں پر بٹھاتی جاتی ہیں اور سامنے والی سیٹ میں لگی میز کھول کر ان کے لئے چائے پانی یا کھانا لگاتی ہیں۔ فرق صرف یہ ہے کہ ہوائی جہاز انجن بند ہونے سے نیچے گر کر تباہ ہو جاتا ہے یہ وہیں کا وہیں (پانی پر) رہتا ہے۔

ہوور کرافٹ، پانی میں چلنے کی بجائے سطح سمندر سے ایک دو فٹ اوپر چلتا ہے۔ اس جہاز کے نیچے سے ہوا اتنی تیز سے خارج کی جاتی ہے کہ جہاز نیچے رہنے کی بجائے ہمیشہ تھوڑا اوپر رہتا ہے اور جہاز کے اوپر لگے ہوئے جیٹ انجن ہوائی جہاز کی طرح اسے آگے بڑھاتی ہیں۔ اس ٹیکنالوجی کی وجہ سے یہ جہاز (Hoover Crafts) کہلاتا ہے یہ نہ صرف سمندر پر بلکہ خشکی پر بھی، خصوصاً صحرا میں بھی چل سکتے ہیں۔ میں نے سنا ہے کہ سعودی عرب اور کویت کی فوج کے پاس بھی یہ جہاز ہیں جو ریت پر چلتے ہیں۔ بحری جہاز اور ہوور کرافٹ میں یہ فرق ہے کہ سطح آب سے اوپر چلنے کے باعث اس میں سوار مسافروں کو Sea Sickness نہیں ہوتی ہے ورنہ

سردیوں کے چھ سات ماہ جب بالٹک (Baltic Sea) بپھرا ہوا ہوتا ہے باقی کشتیوں میں سوار مسافروں کو کافی Sea Sickness محسوس ہوتی ہے کیونکہ وہ بحری جہاز پانی کی لہروں کے رحم و کرم پر ہوتے ہیں۔

کوپن ہیگن سے مالمو یا دوسرے ملکوں کی بندرگاہوں میں جانے والی کشتیاں (فیریاں) مختلف حجم کی ہوتی ہیں۔ کچھ کشتیاں صرف مسافر برادار ہوتی ہیں اور کچھ تو اتنی بڑی ہوتی ہیں کہ جن میں سو ڈیڑھ سو کاریں، بسیں اور ٹرک تو آتے ہی ہیں اس کے ساتھ ایک یا دو مال بردار یا مسافر بردار ریل گاڑیاں بھی آ جاتی ہیں ۔ جرمنی کے شہر فلیز نبرگ جہاں جہاز رانی اور جہاز سازی کے کالج ہیں وہاں پر کچھ سیمینار اٹینڈ کرنے کے لئے ہم مالمو سے بذریعہ ریل گاڑی جاتے تھے۔ مالمو کے مرکزی ریلوے اسٹیشن سے فلیز نبرگ کا ٹکٹ لے کر ریل گاڑی میں بیٹھتے۔ ریل گاڑی سمندر کے کنارے تک پٹریوں پر چلتی رہتی اس کے بعد بندرگاہ میں کھڑی فیری میں گھس جاتی۔ ان Ferries میں ریل گاڑیوں کے کھڑے ہونے کے لئے پٹریاں بنی ہوتی ہیں جو کنارے کی پٹریوں سے ملائی جاتی ہیں۔ فیری چل پڑنے کے بعد بھی ہم ریل میں ہی بیٹھے رہتے کبھی کبھی چائے پینے کے لئے یا سمندر کا نظارہ کرنے کے لئے ریل سے باہر نکل کر فیری کے ریستوران اور عرشے پر آ جاتے تھے۔ دو ڈھائی گھنٹے کے بعد جرمنی کا کنارہ نظر آتا ہے اور کشتی (فیری) جرمنی کی پہلی بندرگاہ پر جالگتی اور ایسے کھڑی ہو جاتی کہ اس کی پٹریاں کنارے کی پٹریوں سے مل جاتیں۔ فیری کا آگے کا بڑا دروازہ کھلنے کے بعد باقی بسوں اور کاروں کی طرح ہماری ریل گاڑی بھی چل پڑتی اور جرمنی کے مختلف ریلوے اسٹیشنوں سے ہوتی ہوئی تین چار گھنٹے کے بعد فلیز نبرگ کے ریلوے اسٹیشن پر پہنچ جاتی۔

ٹھنڈ ہر چیز کو خاموش کردیتی ہے

سوئیڈن کے لئے یہ کہا جاسکتا ہے کہ یہ ملک ہر شعبے میں ترقی کی راہ پر گامزن ہے۔ سوائے آبادی میں اضافہ کے۔ بقول کسی کے جس ملک میں سب سے زیادہ لوگ خودکشی کرتے ہوں ،جہاں سالانہ طلاقوں کی شرح شادیوں سے زیادہ ہو اور جس ملک کی عورتوں کو بچے پالنے سے زیادہ کتا پالنے کا شوق ہو وہاں آبادی کیا خاک بڑھے گی۔ یہاں کی خواتین زیادہ تعداد میں بچے پیدا کرکے اپنی جسمانی ساخت خراب نہیں کرنا چاہتیں۔

ایک دفعہ یہاں کے لوگوں کے ذریعے بات چیت کرتے ہوئے یہ بات پھیل گئی کہ پاکستانی زیادہ بچے پیدا کرتے ہیں۔ سوئیڈن میں جس کے سب سے زیادہ بچے ہیں اور جس کی تصویر اس سلسلے میں اخبار میں بھی آچکی ہے وہ ایک پاکستانی ہے جو 25 سال پہلے یہاں آکر آباد ہوا تھا۔ اس پاکستانی سے ہم بھی واقف تھے۔ ہمارے پوچھنے پر اس نے بتایا کہ " یار میرے کوئی دس بارہ بچے نہیں ہیں۔ شادی کے بعد سات سال تو کوئی اولاد نہیں ہوئی۔ حکیم یا ڈاکٹروں پر میرا یقین نہیں ہے میں ہمیشہ یہ کہتا تھا کہ ہر چیز قدرت کے ہاتھ میں ہے اور وہی ہوا کہ ایک کے بعد دوسرا پورے چار سال میں چار بچے ہوگئے اور اس میں کوئی شک نہیں کہ ان ممالک میں اتنے بچے بہت زیادہ سمجھے جاتے ہیں۔"

"واقعی چار بچے تو اتنے زیادہ نہیں ہیں کہ اخبارات میں تصویر آجائے اور اس کو کمال سمجھا جائے۔" ہم لوگوں نے اس سے کہا پھر سوئیڈن میں بچوں کی کم پیدائش کا سبب پوچھا۔

"بس! ویسے وثوق سے تو کچھ بھی نہیں کہا جاسکتا۔" اس نے جواب دیا۔ " "شاید یہاں کے ٹھنڈے موسم کا بھی اثر ہو۔ کچھ رسم و رواج اور ثقافت کا بھی اثر ہو جو ہر ایک چھوٹے خاندان کے ساتھ گھومتے ہوئے نظر آتا ہے۔ ہمارے پورے محلے میں میرے اور ہماری بلی کے چار چار بچے ہیں ورنہ ایک سے زیادہ کسی کے نہیں ہیں۔ کئی لوگوں کا تو ایک بھی نہیں ہے۔ شادی کے بعد طلاق اتنی جلدی ہوتی ہے کہ بچہ پیدا ہونے کی نوبت ہی نہیں آتی۔ میاں بیوی کے درمیان وہ پیار اور چاہت مستقل طور پر نہیں ہوتی ہے۔ کچھ اس رویہ کی وجہ سے بھی کہ ایک دوسرے کی کوئی پرواہ کیوں کرے، ایک شوہر گیا تو کیا ہوا جب دل چاہے گا دوسرے کا بندوبست ہو جائے گا اور بوائے فرینڈز کی تو کوئی کمی نہیں ہے۔" اور پھر کچھ راز دارانہ انداز میں کہا۔ "کچھ یہاں کی سخت سردی نے بھی ہوش و حواس گم کردیئے ہیں۔ ہر چیز سکڑی ہوئی ہے۔ ایک دوسرے کی محبت میں وہ ولولہ اور جوش نہیں ہے، شاید جو گرم ملکوں کے باشندوں میں ہوتا ہے۔۔۔؟"

بہر حال یہ 25 سال سے اس ملک میں مقیم ایک پاکستانی کا ذاتی خیال تھا۔

ایک دن میں مالمو شہر کے صدر بس اسٹاپ، گستاؤ اڈولف پر دیگر لوگوں کے ساتھ بس کا انتظار کررہا تھا۔ میرے ساتھ یمن کی بندرگاہ عدن کا پورٹ انجیئر محمد مبارک بھی تھا۔ سخت سردی کی وجہ سے ہمارا پورا جسم سویٹر، جیکٹ، اوورکوٹ، مفلر اور گرم ٹوپیوں سے ڈھکا ہوا تھا۔ سرد ہوا سے بچنے کیلئے ہم ایک دوسرے کے قریب کھڑے ہوئے تھے۔ پھر بھی جسم کانپ رہا تھا اور دانت بج رہے تھے۔ ظاہر ہے کہ یہ ملک سویڈن قطب شمالی کے ان ملکوں میں سے ایک ہے جس کے مقابلے میں انگلینڈ، فرانس، اسپین بھی گرم ملک سمجھے جاتے ہیں۔ سردیوں کی چھٹی میں ناروے، سوئیڈن، فن لینڈ کے لوگ اٹلی، اسپین اور پرتگال ایسے جاتے ہیں جیسے ان دنوں میں مری اور ایبٹ آباد کے لوگ کراچی آتے ہیں۔

ہم لوگ وقت گذارنے کیلئے مفلر سے ڈھکے ہوئے منہ سے باتیں کررہے تھے۔ اتنے میں ایک سوئیڈش اپنے بھاری بھرکم کتے کے ساتھ آکر ہمارے پاس کھڑا ہوگیا۔ کتوں کے ساتھ تو اور بھی دو تین مسافر تھے بلکہ ہر بس میں کچھ نہ کچھ کتے بھی چڑھتے ہیں اور انکے سفر کا ٹکٹ ان کے مالک لیتے ہیں لیکن یہ اتنے بڑے سائز اور خوفناک چہرے والا بل ڈاگ نما کتا میں نے پہلی دفعہ دیکھا تھا۔ جنگلی سور کی طرح لگ رہا تھا اور اس کا پورا جسم غبارے کی طرح پھولا ہوا تھا۔ آتے ہی اپنا منہ میری طرف کرکے کھڑا ہوگیا۔ میں تھوڑا ساکھسک کر اس کی دم کے پاس کھڑا ہوگیا جس میں کم از کم میرے خیال کے مطابق تھوڑا ساتو حفاظتی پہلو تھا۔ بس آئی تو لوگ اس میں سوار ہونے لگے لیکن میں خاموش کھڑا رہا۔

"بھئی چلو بھی کس کا انتظار ہے۔" مبارک نے عربی طرز کی انگریزی میں مجھے کہا۔

"تھوڑا ٹھہرو یار اس کمبخت کتے والے آدمی کو پہلے جانے دو۔" میں نے جواب دیا۔ میرے دماغ میں یہ خوف طاری تھا کہ ہمارے پہلے بیٹھنے کے بعد ہو سکتا ہے یہ کتے والا ہمارے پاس آکر بیٹھ جائے لیکن بعد میں جانے سے یہ فائدہ ہوتا کہ ہم اپنی مرضی سے اس سے دور بیٹھ سکتے تھے۔

"کتنا خبیث قسم کا کتا ہے۔" مبارک نے بھی یہ بات محسوس کرکے اس کا اظہار کیا۔

"مبارک مجھے تو ایسے لگ رہا تھا کہ یہ کتا مجھے کاٹ کھائے گا۔" بس میں بیٹھتے ہی میں نے مبارک سے کہا۔

مبارک نے ہنستے ہوئے جواب دیا۔ "ہو ہی نہیں سکتا الطاف، کبھی نہیں۔ یہاں میں نے آج تک کسی کتے کو کسی پر بھونکتے، حملہ کرتے یا کاٹتے ہوئے نہیں دیکھا ہے۔"

"بات تو تم صحیح کہتے ہو۔" میں نے مبارک کے مشاہدے کو درست قرار دیتے ہوئے کہا۔ "شاید یہ لوگ کتوں کو ایسی تربیت دیتے ہیں۔"

"ہو سکتا ہے اس میں تربیت کا بھی اثر ہو لیکن حقیقت یہ ہے کہ ٹھنڈ ہر چیز کو ٹھنڈا کردیتی ہے۔" مبارک نے یہ آخری جملہ دو دفعہ دہرایا اور ہر دفعہ "ہرچیز" پر زور دیتے ہوئے کہا اور اس کے اس ہر چیز کا مطلب سمجھ کر مجھے ہنسی آگئی۔

مالمو (سوئیڈن) کی ورلڈ میری ٹائم یونیورسٹی میں بھی مبارک کلاس میں میرے ساتھ بیٹھتا ہے اور پورا دن ادھر ادھر کی خبریں سناکر دوسرے ملکوں سے آئے جہازوں اور بندرگاہوں کے افسروں کو ہنساتا رہتا ہے۔ ہر وقت

بولتے رہنا اس کی عادت ہے۔ سوئیڈن کی ٹھنڈ ہر چیز کو ضرور خاموش کردیتی ہوگی لیکن مبارک کی زبان کو نہیں۔ سردی، تیز ہوا اور کھلے آسمان کے نیچے بھی مبارک اپنے منہ کو مفلر سے ڈھانپ کر گھنٹوں بول سکتا ہے اور اب بس کے دروازے بند ہونے اور بس کے گرمائش کے نظام میں سردی کا احساس ختم ہونے کے بعد اس نے اپنے چہرے سے مفلر اور سر سے کنٹوپ اتار کر گود میں رکھا اور اپنا قصہ سنانے لگا۔

"تمہیں معلوم ہے کچھ سال قبل میں یمن کے شہر صنعاء میں رہا کرتا تھا؟"

"نہیں یار۔ مجھے تو یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ مبارک نام کا ایک شخص عدن میں رہتا ہے جس سے میری ملاقات سوئیڈن میں ہوگی۔ ان دنوں میں ملائیشیا میں رہتا تھا۔ تمہیں پتہ تھا کہ میں ملائیشیا میں تھا۔" میں نے مبارک کو چھیڑا۔

"یار مذاق نہیں کرو۔ یہ میرا انداز بیان ہے۔ میری انگریزی بہت کمزور ہے۔ بس میری بات کا مطلب سمجھنے کی کوشش کیا کرو۔"

"اچھا مبارک بات کرو۔ میں بھی یونہی مذاق کر رہا تھا۔" میں نے مبارک کو سمجھایا۔

"ہاں تو بات یہ تھی کہ یمن کا یہ شہر صنعاء میرے گاؤں والے شہر عدن کی طرح ساحل سمندر پر نہیں ہے۔ صنعاء پہاڑوں پر یعنی کافی بلندی پر واقع ہے اور موسم سرما میں تو وہاں اچھی خاصی سردی پڑتی ہے۔ ایک رات میں دیر سے گھر کی طرف آ رہا تھا تو اپنی گلی کی نکڑ پر ایک نہ دو پورے چھ سات کتے نظر آئے۔ میں نے دل میں سوچا مبارک آج تو تیری خیر نہیں۔ لیکن اب کیا کر سکتا تھا، خاموشی سے آگے بڑھتا گیا۔ ٹھنڈ اور کتوں کے خوف سے میں تھر تھر کانپ رہا تھا جب پوری گلی پار کرکے گھر کے پاس پہنچا تو ایسا لگا جیسے یہ سب میں خواب میں دیکھ رہا تھا۔ کسی ایک کتے نے حملہ تو کیا بھونکا تک نہیں۔ صنعاء کی جگہ عدن ہوتا تو یہی کتے چیر پھاڑ کر رکھ دیتے، قمیص اور پتلون دوبارہ پہننے کے قابل نہیں رہتی، روٹی پکانے کے توے کو صاف کرنے میں ہی کام آتی۔ لیکن صنعاء کے کتے ایک جگہ ایسے بیٹھے رہے جیسے پانی جم کر برف بن گیا ہو اور اب برتن سے باہر نکالنے کے بعد بھی ایسا ہی رہے گا۔ البردیھدی کل شئی۔" مبارک نے آخری جملہ عربی میں بول کر پھر انگریزی میں اس کا ترجمہ بتایا کہ ٹھنڈ ہر چیز کو خاموش کردیتی ہے۔

اقوام متحدہ، آئی ایم او اور ورلڈ میری ٹائم یونیورسٹی

دوسری جنگ عظیم کے بعد متعدد ممالک کے سربراہوں، دانشوروں، سیاستدانوں وغیرہ نے بیٹھ کر سوچا کہ آپس میں لڑنے سے کچھ حاصل نہیں ہوگا۔ الٹا دونوں ممالک کو اس لڑائی کا نقصان ہی ہوتا ہے کسی کو کم تو کسی کو زیادہ۔ سوچنے کی بات ہے کہ دوسری جنگ عظیم کے اثرات نہ صرف ہمارے جیسے غریب ملکوں پر پڑے بلکہ بڑے ممالک بھی بے حال ہوگئے۔ کئی برس تک جاپان اور جرمنی کی عورتیں جسم فروشی کا دھندا کرتی رہیں۔ فرانس اور انگلینڈ جیسے امیر ممالک کے لوگ صبح کی چائے کی پتی سکھا کر شام کو استعمال میں لاتے تھے۔ بمباری کے اثرات سے ہر طرف عجیب وغریب بیماریاں پھیل چکی تھیں۔ سب نے یہ محسوس کیا کہ ہمیں آپس میں لڑنے کی بجائے اصلی دشمن بھوک، بیروزگاری، بیماری وغیرہ کا مل کر مقابلہ کرنا چاہیے اور اس طرح دنیا کے تمام

ملکوں کی ایک یونین اور سوسائٹی بنائی گئی جس کا نام اقوام متحدہ رکھا گیا۔ آج کل دنیا کے تمام ممالک مذکورہ ادارے کے رکن ہیں اور اقوام متحدہ کا مرکزی دفتر نیویارک میں واقع ہے۔ جہاں تمام ملکوں کے نمائندے عالمی مسائل حل کرتے ہیں (یاکم ازکم حل کرنے کی کوشش کرتے ہیں)۔ مختلف مسائل کے حل کے لئے مختلف ادارے بنائے گئے ہیں۔ جیسا کہ ایک عالمی ادارہ صحت کے نام سے مشہور ہے، جس میں کام کرنے والے ڈاکٹر، سائنسدان وغیرہ دنیا میں صحت کے معیار پر نظر رکھتے ہیں۔ چیچک، پولیو جیسی بیماریوں سے اس کرہءارض کو پاک کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ بچوں کی بہترین صحت کے لئے ان کے کھانے پینے کی چیزوں پر نظر رکھتے ہیں۔

دنیا کے مزدوروں اور کارکنوں کو ظلم سے بچانے اور انکو اپنا حق دلانے کے لئے اقوام متحدہ کا ایک اور ادارہ عالمی ادارہ برائے مزدور (آئی ایل او) کے نام سے ہے جس کا کام مزدور سے متعلق قانون سازی کرنا اور اس پر عملدر آمد کو یقینی بنانا ہے۔

ایک اور چیز جس کا واسطہ ساری دنیا سے ہے اور جس کے ایک حصے کی خرابی دوسرے ملکوں پر اثر انداز ہوسکتی ہے وہ ہے سمندر۔ سمندر پر نہ صرف امیر ملکوں کا حق ہے جن کے پاس بہت زیادہ جہاز ہیں بلکہ ان کا بھی حق ہے جو غریب ہیں، چھوٹے ہیں اور جن کے پاس ایک بھی جہاز نہیں ہے۔ یعنی سمندر دنیا کے تمام لوگوں کا ہے نہ صرف ان کا جو اس وقت زندہ ہیں بلکہ ان کا بھی جو آنے والے دقتوں میں آئیں گے۔ ہم اگر اس وقت سمندر کی تمام مچھلیاں ختم کردیں یا تباہ کردیں تو مستقبل میں کیا ہوگا۔ ہم اگر خودغرض اور کاہل ہوکر اپنے ملک کی فیکٹریوں کی زہریلی گندگی سمندر کے حوالے کریں گے تو اس سے نہ صرف ہماری سمندری حدود بلکہ بھارت کا مغربی کنارہ، ایران، یمن، عمان، عراق، سعودی عرب یعنی پورا بحیرہ عرب آلودہ ہو جائے گا۔

آج کل بحری جہازوں میں لاکھوں ٹن تیل اور دوسرے کیمیکل اٹھائے جاتے ہیں۔ جہاز رانوں کی معمولی لغزش سے یا جہاز کے مالک کی کنجوس کی وجہ سے جو جہاز کی تعمیر میں کم لوہا استعمال کرتا ہے جس کی وجہ سے جہاز کمزور رہتا ہے، یا جہاز بنانے والوں کی غلط ڈیزائننگ کی وجہ سے جہازوں کے حادثے ہوتے ہیں، جہاز ٹوٹ جاتے ہیں اور اس میں موجود تیل اور کیمیکل سمندر اور سمندری مخلوق (مچھلی، جھینگوں اور آبی پرندوں) کو تباہ کردیتے ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ کنارے پر رہنے والے وہ تمام لوگ بیروزگار ہو جاتے ہیں جن کا رزق سمندر سے وابستہ ہے۔

ان چیزوں کو مدنظر رکھ کر پوری دنیا کی خوشحالی کے لئے اقوام متحدہ نے ایک ادارہ انٹرنیشنل میری ٹائم آرگنائزیشن (آئی ایم او) بنایا ہے جس کا صدر دفتر لندن میں ہے اور جس کا کام جہاز اور جہاز رانوں کی حفاظت کا معیار بلند رکھنا اور دنیا کے سمندروں کو آلودگی سے بچانا ہے۔ اس کے علاوہ یہ ادارہ قانون سازی کا کام بھی کرتا ہے تاکہ سمندر پر تمام ممالک کے جہازران ایک ہی قانون پر عمل کریں۔ ایک انگریز یا پاکستانی اپنے ملک میں گاڑی بائیں ہاتھ پر چلاتا ہے، ایک امریکن یا جاپانی دائیں ہاتھ پر چلاتا ہے لیکن جہاز ایسی چیز ہے جسے چلانے کے لئے ہر ایک کو ایک ہی قانون پر عملدر آمد کرنا ہوتا ہے، چاہے وہ امریکی ہو یا بنگالی، فرانسیسی ہو یا جزیرہ فجی کا رہنے والا، ورنہ حادثے کا خطرہ رہتا ہے۔ مذکورہ ادارے کے حکام مختلف مسائل اور حادثات کو مدنظر رکھ کر قوانین بناتے ہیں اور رکن ممالک کو ان پر عملدر آمد کی ہدایت کرتے ہیں۔ اس وقت دنیا کے 156 ممالک آئی ایم او کے رکن ہیں۔

ایک زمانہ تھا دنیا کے صرف چند ملکوں کے پاس ہی بحری جہاز تھے اور انہی کی سمندر پر حکمرانی تھی بلکہ افریقہ اور ایشیا کے تمام ممالک ان کا حکم مانتے تھے۔ اب دنیا کے سارے ملک آزاد ہیں، ہر ملک کے پاس تھوڑا بہت

اپنے بحری جہاز اور جہاز راں بھی ان کے اپنے ہیں۔ 1963 ءمیں جب میں پاکستان میرین اکیڈمی چاٹگام (سابقہ مشرقی پاکستان) میں انجنیئرنگ کیڈٹ تھا تو جہاز رانی کا یہ کالج ایشیا میں روس اور بھارت (ڈفرن بمبئی) کے بعد تیسرا بڑاکالج تھا جس میں ایران، سنگاپور، سری لنکا، ملائیشیا کے لوگ تعلیم حاصل کرنے کے لئے آتے تھے۔ آج کل ہر ملک کی اپنی قومی جہازراں کمپنی اور اپنی میرین اکیڈمی ہے۔ یہاں تک کی فجی اور پاپوا نیوگنی جیسے جزیروں پر بھی جہاز رانی کی درسگاہیں ہیں جہاں پر ان ملکوں کے لوگ تعلیم حاصل کرکے اپنے اور دوسرے ممالک کے بحری جہازوں پر ملازمت کرتے ہیں۔ دنیا میں جہاز رانی بڑھنے اور ہر ملک کا اس میں حصہ لینے سے یہ ہونے لگا کہ ہر ملک کے لوگ اپنے قانون، اپنے تعلیمی ادارے، اپنی جہاز سازی کے علم اور تجربے وغیرہ کو بہتر سمجھنے لگے۔ ضرورت اس بات کی تھی کہ کوئی ایک ایساتعلیمی ادارہ ہو جو دنیا کے تمام ممالک کے جہاز رانوں اور بندرگاہوں میں کام کرنے والوں اور میری ٹائم اکیڈمیوں میں پڑھانے والے سینئر افسران کو ایک جگہ جمع کرکے ان کو اعلیٰ تعلیم دے اور پوری دنیا میں اس سے متعلق ایک ہی قانون اور معیار بنایا جائے تاکہ جہازوں پر ملازمت کرنے والے اپنی ترقی کے لئے دنیا کے کسی بھی ملک میں پڑھ کرکہیں سے بھی امتحان دیں سکیں۔

آئی ایم او حکام نے اس مقصد کے لئے سوئیڈن کی جنوبی بندرگاہ مالمو میں ورلڈ میری ٹائم یونیورسٹی قائم کی ہے۔ یہ دنیا میں اپنی نوعیت کی واحد یونیورسٹی ہے جہاں سمندری دنیا سے تعلق رکھنے والے سینئر لوگ اعلیٰ تعلیم کے لئے دو سال کیلئے آتے ہیں اور ایم ایس سی کی ڈگری حاصل کرتے ہیں۔ ہر سال دنیا کے ہر ملک سے ایک یا دو چیف انجینئر، کیپٹن، بندرگاہ کے ایڈمنسٹریٹر، انجنیئر یا بحریہ کے اعلیٰ افسران وغیرہ آتے ہیں جن کی عمر 35 سے 45 سال کے درمیان ہوتی ہے۔

تعلیم سے زیادہ دنیا کے 100 سے زیادہ ملکوں کے تقریباً 150 یا 200 نمائندوں کے ساتھ دو سال گزارنے کا تجربہ بھی لاجواب ہے۔ جب میں جہازپر تھا تو اس وقت کئی ممالک اور ان کے لوگوں سے ملنے کے مواقع ملے لیکن ایک ہی ساتھ کئی ملکوں کے لوگوں کے ساتھ رہنے کا اتفاق صرف سوئیڈن میں ہوا۔ یورپی گورے، کالے حبشی (افریقی) چھوٹے قد کے فلپینو، جاپانی، ملئی، عجیب زبانیں بولنے والے چینی، ویتنامی، برمی، جزائر کے رہنے والے (جن میں کچھ جمیکا، گرینیڈا، مارشل، سولومن، ونتولو جیسے بہت چھوٹے جزیروں کے تھے تو کچھ مڈغاسکر، کیوبا، پاپوانیوگنی جیسے بڑے جزائر کے تھے)۔ عربی زبان بولنے والے سعودی، یمنی، سوڈانی، الجیری تھے تو ہسپانوی زبان بولنے والے کولمبیا، چلی، میکسیکو اور کوسٹریکا کے لوگ تھے۔غرض یہ کہ ہر رنگ، زبان، مذہب، قدوقامت اور مزاج و خصلت کے لوگ تھے لیکن ہم سب ہم پیشہ ہونے کے باعث ایک دوسرے کے قریب تھے۔ اور اس کے ساتھ ہی ہم ایک ہی زبان یعنی انگریزی بولتے تھے۔کسی کی مادری زبان چاہے کوئی بھی ہو لیکن مالمو میں دو سال رہائش کے دوران ہر ایک کو انگریزی بولنا پڑتی تھی۔ جو انگریزی سے نابلد تھے ان کو چھ ماہ کے دوران انگریزی زبان کے کورس کرنا پڑتے تھے۔

مالمو میں ہماری رہائش

سوئیڈن کے شہر مالمو میں ہماری رہائش کا بندوبست شہر کے وسط میں ایک چھ منزلہ عمارت میں کیا گیا۔ ہر منزل پر سنگل روم والے تقریباً 20 فلیٹ تھے جن میں باتھ روم، کچن کے علاوہ چھوٹا سا اسٹور روم نما ڈریسنگ روم بھی تھا۔ پوری عمارت مرکزی طور پر ایئر کنڈیشنڈ تھی۔ گراؤنڈ فلور پر ایک بہت بڑی میس تھی۔ ہمیں ہفتے میں دو دن کھانا خود تیار کرنا پڑتا تھا جبکہ باقی پانچ دن ہم میس میں کھانا کھاتے تھے جہاں ہر روز مختلف ملکوں سے تعلق رکھنے والے بھانت بھانت کے لوگوں سے ملاقات کا موقع ملتا تھا۔ ان میں سے تقریباً آدھے مسلمان تھے جن کا خیال رکھ کر انتظامیہ نے خنزیر یا ایسی حرام چیز کے پکانے پر پابندی عائد کر رکھی تھی۔ شراب کی بھی ممانعت تھی لیکن دعوتوں اور دیگر تقریبات میں بیئر اور شراب بھی چلتی تھی۔ مسلمانوں کے لئے سیون اپ اور کوکا کولا منگوایا جاتا تھا (جو ان ملکوں میں اچھا خاصا مہنگا ملتا ہے۔ سوئیڈن، ناروے جیسے ملک میں کوک پینا بھی عیاسی میں شمار ہوتا ہے) لیکن افسوس کی بات یہ ہے کہ جن کے لئے شراب کو حرام قرار دیا گیا ہے وہی لوگ یہاں دوسروں سے زیادہ پیتے ہیں۔ ایک یا دو کو چھوڑ کر باقی سعودی عرب، یمن اور خلیجی ممالک کے لوگ بھی شراب پیتے ہیں۔ میں نے آج تک صرف دو ملکوں کے لوگوں کو یہاں شراب پیتے نہیں دیکھا۔ پاکستانی اور ایرانی۔ یہ بات میرے لئے باعث فخر ہونے کے ساتھ ساتھ تعجب انگیز بھی تھی ورنہ 60ءکے عشرے کے آخر میں جب میں نے ایک جونیئر انجینئرکی حیثیت سے جہاز کی ملازمت شروع کی تھی تو نہ صرف متعدد پاکستانی شراب پیتے تھے بلکہ اس بات پر فخر بھی محسوس کرتے تھے۔ لیکن اب حالات بدل چکے ہیں۔ گزشتہ چوتھائی صدی میں ایسا کبھی نہیں ہوا کہ ہمارے ملک کے ہوائی جہاز یا بحری جہاز کو ایسا حادثہ پیش آیا ہو جس کی وجہ عملے کی شراب نوشی ہو۔

بہرحال ہم لوگ یعنی میں اور کیپٹن سلیم قاسم مالمو پورٹ پر پہنچنے کے بعد یونیورسٹی کے نمائندے کے ساتھ رات کو تقریباً آٹھ بجے اس عمارت کے قریب پہنچے۔ دروازے کے پاس افریقہ کے کچھ ملکوں کے لوگ کھڑے تھے وہ بھی ہماری طرح دو سال کے لئے یہاں سوئیڈن کے شہر مالمو آئے تھے۔ کوئی جہاز کا کیپٹن یا چیف انجینئر تھا تو کوئی پورٹ کا ڈائریکٹر وغیرہ ان میں ایک دو خواتین بھی تھیں جن کا تعلق بندرگاہ سے تھا (بعد میں پتہ چلا کہ ان میں دو خواتین ایسی بھی تھیں جو جہازوں کی کپتان تھیں اور وہ جہاز رانی بھی کرتی رہی ہیں۔ ایک کا تعلق کینیڈا سے جبکہ دوسری خاتون کسی یورپی ملک سے تھیں۔ بہرحال ان افریقی افراد نے ہمارا زبردست خیرمقدم کیا۔

"کیوں بھئی۔" میں نے ان کے اس ردعمل پر حیرت سے استفسار کیا۔

"اس لئے کہ دنیا کے تمام ممالک کے باشندے ایک ہفتہ قبل ہی یہاں پہنچ چکے ہیں پاکستان ہی وہ واحد ملک تھا جس کی افتتاحی تقریب میں بھی نمائندگی نہیں ہو سکی۔" انہوں نے بتایا اور ظاہر ہے ہمیں یہ سن کر افسوس ہوا کہ ہمارے ملک میں بیوروکریسی کا اتنا پیچیدہ نظام ہے کہ یہاں ہم مار کھا جاتے ہیں۔ کئی دفعہ تو عالمی سیمینار یا وظیفے وقت گزر جانے کی وجہ سے منسوخ ہو جاتے ہیں۔ بہر حال ہم خاموش رہے ان کو یہ بتانے کی تو ضرورت نہیں تھی کہ ہمارے تیسرے ساتھی چیف انجینئر راحت عزیز کے تو ابھی تک سفری دستاویزات جمع کرانے کے عمل سے ہی آگے نہیں بڑھ پائے ہیں۔ (وہ مزید دو ہفتے کی تاخیر سے مالمو پہنچے(

ہمارا کمرہ نمبر معلوم ہونے پر وہ لوگ ہمارا سامان اٹھوا کر بذریعہ لفٹ تیسری منزل پر لے آئے۔ کمروں کی چابی پہلے ہی ہمیں دیدی گئی تھی۔ ہمیں بتایا گیا کہ ناشتے کا وقت صبح 7 بجے کا ہے جبکہ9 بجے تک یونیورسٹی

پہنچنا لازمی ہے۔ انہوں نے کمرے کی کھڑکی سے نظر آنے والی سڑک کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا "اس سڑک کے کونے پر 18 نمبر بس کا اسٹاپ ہے جو آپ کو مرکزی بس اسٹاپ پر لے جائے گی اور جہاں سے دوسرے نمبروں کی بسیں یونیورسٹی کے قریب سے ہی گذرتی ہیں۔"

یورپ کی سردی

دوسرے دن میں نے اور کیپٹن سلیم نے صبح صبح ناشتہ کیا اور اپنا اپنا بریف کیس لے کر باہر نکل آئے۔ ہم نہیں چاہتے تھے کہ پہلے دن ہی یونیورسٹی تاخیر سے پہنچیں۔ ساڑھے آٹھ بج چکے تھے لیکن سورج ابھی طلوع نہیں ہوا تھا یا ہو سکتا ہے ہو چکا ہو لیکن گہرے بادلوں کے باعث اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ ہاسٹل کا دروازہ کھولتے ہی سرد ہوا نے ہمارا استقبال کیا اور پھر ہمیں بھی یخ بستہ کردیا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اس وقت ہوا نہیں چل

رہی تھی۔ یورپی ممالک میں سردی اس وقت ناقابل برداشت ہوجاتی ہے جب سرد ہوا چلتی ہے۔ سوئیٹر، جیکٹ اور اوورکوٹ کے باوجود ایسے لگ رہا تھا جیسے ہم نہانے کے بعد ائیرکنڈیشنر کے سامنے برہنہ کھڑے ہوگئے ہوں۔

میں نے کیپٹن سلیم سے کہا کہ ایسا ہے کہ آج شام کو ایک تو سفری بیگ لے لیں گے تاکہ اسے گلے میں لٹکا کر ہاتھ جیبوں میں ڈال سکیں جیسا کہ دوسرے لوگوں نے کر رکھا ہے اور دوسرا یہ کہ مجھے دو منٹ دو تو میں ٹوپی تبدیل کرکے آؤں۔ میرے بالوں سے بے نیاز سر کے لئے یہ کچھ مناسب نہیں ہے۔

میں جلدی جلدی اپنے کمرے میں آیا اور بیگ کھول کر ایک اور گرم ٹوپی نکالی جو کسی جانور کی کھال کی بنی ہوئی تھی اور جس کی سائڈ سے لٹکتے ہوئے فلیپروں سے کانوں کو بھی ڈھانپا جاسکتا تھا۔ یہ ٹوپی کسی عجیب جانور کی کھال سے بنی ہوئی لگ رہی تھی۔ میں کوئی چمڑے کا تاجر یا ماہر تو ہوں نہیں لیکن اتنا جانتا ہوں کہ وہ گائے بکری کی کھال کی نہیں تھی کیونکہ ایسی کھال کی قراقلی ٹوپی مین بچپن میں عید پر پہنتا تھا اور جس کھال پر ہلکے سے گھنگھریلے بال ہوتے تھے۔ لیکن اس ٹوپی کے بال لمبے اور کھڑے تھے جو اکثر غصے میں ہوتے ہیں یا شاید محاورے کی حد تک ہے کہ مارے غصے کے اس کے سر کے بال کھڑے ہوگئے۔ مجھے یہ ٹوپی میرے ایک ساتھی کیپٹن بشیر وسطرو نے اس وقت دی جب میں کراچی سے روانہ ہورہا تھا۔

کیپٹن وسطرو سوئیڈن میں تقریباً دو سال رہ کر آئے تھے بلکہ یہاں برسبیل تذکرہ یہ بتاتا چلوں کہ کیپٹن وسطرو پہلے پاکستانی جہاز راں ہیں جنہوں نے مالمو کی اس یونیورسٹی سے جسے ورلڈ میری ٹائم یونیوسٹی کہا جاتا ہے، ایم ایس سی کیا تھا۔ بہرحال عجیب کھال والی گرم ٹوپی تھی جس کو پاکستان کی گرمی میں ہاتھ لگانے کو دل نہیں چاہتا تھا۔ اس لئے میں نے یہ ٹوپی کیپٹن وسطرو کو واپس کرنا چاہی تو انہوں نے میری ایک نہ سنی اور میرے بیگ میں زبردستی ڈالتے ہوئے مجھے سمجھایا۔ "یار تم اسے مذاق نہیں سمجھو میں نے دو سال اسے استعمال کیا ہے۔ سوئیڈن اور ناروے کی سردی کے لئے موٹے تلوؤں والے جوتے اور اس قسم کی ٹوپی بے حد ضروری ہے۔ یقین کرو یہ ٹوپی مجھے بڑی مشکلوں سے ملی تھی۔"

"کیا قطب شمالی میں کسی اسکیمو کی چوری کی تھی؟ وہ غریب مچھلی کا شکار کھیلنے گیا ہوگا اور آپ نے اس کے گھر (اگلو) سے اٹھالی ہوگی۔" میں نے اسے کہا

"چلو یار تم کچھ بھی سمجھو لیکن میری بات مانو اسے لے جاؤ، پھینکنا نہیں۔ بڑے کام کی چیز ہے۔"

اور اب میں اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کررہا تھا کہ اچھا ہوا اسے میں نے پھینکا نہیں مجھے سندھی کہاوت جس کا اُردو ترجمہ "سردی میں گدھوں کے ترپال بھی بھلے لگتے ہیں" سمجھ میں آگئی اور صحیح لگی۔ بہرحال مذکورہ ٹوپی پہن کر مجھے بے حد سکون ملا۔ ہاسٹل کا دروازہ کھول کر باہر نکلنے پر اب ایسا نہیں لگا کہ مجھے کسی نے ریفریجریٹر میں ڈال دیا ہو۔ ہاں البتہ بس اسٹاپ تک پہنچتے پہنچتے سر اور کانوں کے علاوہ پورے جسم کی قلفی ضرور جم گئی۔ ہمارے بس اسٹاپ پر پہنچنے سے قبل ہی 18 نمبر کی ایک بس نکل چکی تھی جبکہ دوسری کے لئے ہماری طرح بعض دیگر لوگ (جو ہمارے ہی ہاسٹل کے لگ رہے تھے) انتظار کررہے تھے۔ سردی کی وجہ سے سب کے منہ دیوار کی طرف تھے بلکہ بس اسٹاپ کے ساتھ والی دوکان کے زینے کے ساتھ لگے کھڑے تھے۔ ہم بھی برفیلی ہوا سے بچنے کے لئے زینے کے قریب جا کھڑے ہوئے۔ دوسروں نے لمحہ بھر کے لئے ہماری طرف دیکھا۔ ان میں سے ایک دو افریقی اور ایک دو یورپی لگ رہے تھے۔ ان میں سے ایک کو میں نے اور اس نے مجھے پہچان لیا۔

"ہائے! کیپٹن لی آپ بھی یہاں سوئیڈن آئے ہوئے ہیں؟" میرے منہ سے بے ساختہ جتنے الفاظ نکلے اس سے کئی گنا زیادہ بھاپ نکلی۔

چینی نژاد کیپٹن لی زی خیانگ کا تعلق ملائیشیا سے ہے۔ ملائیشیا کی جس نیول اکیڈمی (ALAM) میں، میں جہاز کے انجنیئروں کو پڑھاتا تھا کیپٹن لی بھی کپتان بننے کے بعد وہاں لیکچرار ہے۔ وہ زیادہ تر ان بحری جہازوں پر رہا جن میں پاکستانی اور بھارتی خلاصی تھے جن سے وہ اردو کے کافی الفاظ بلکہ جملے سیکھ گیا تھا، خاص طور گالیاں۔ ملائیشیا میں اکثر چائے کے وقت وہ ہم پاکستانیوں کے ساتھ آکر بیٹھتا تھا اور بحری جہازوں پر گذرے ہوئے دنوں کے لطیفے سناتا تھا۔ اور اب اسے اچانک یہاں سردی میں ٹھرتا دیکھ کر مجھے بڑی خوشی ہوئی کہ ایک اور جاننے والا بندہ مل گیا، گپ شپ لگانے کو۔

"بس یار آ تو گیا ہوں۔" کیپٹن لی نے اپنے مخصوص انداز میں مسکرا کر جواب دیا۔ "لیکن ماں باپ کو خط لکھا ہے کہ اگر میں زندہ واپس آگیا تو سمجھنا کہ آپ لوگوں کے ہاں دوسرا بیٹا ہوا ہے"

کیپٹن سلیم سے کیپٹن لی کا تعارف کراتے ہوئے میں نے اسے بتایا کہ "ملائیشیا وہ ملک ہے جہاں پورا سال بارشیں ہوتی ہیں۔ خط استوا کے قریب ہونے کی وجہ سے سردی قطعی نہیں ہوتی۔ یہاں تک کہ ملائیشیا کے کئی لوگوں کو کبھی کوٹ یا سوئٹر پہننے کا موقع نہیں ملتا۔"

کیپٹن لی نے گردن ہلاتے ہوئے میری بات کی تصدیق کی اور سلیم سے کہا۔ "یہ بالکل ویسے ہی ہے جیسے یہاں رہنے والے کئی سوئیڈش لوگوں نے پنکھا نہیں دیکھا ہے۔ انہوں نے اسے صرف تصویروں میں یا فلموں میں دیکھا ہوگا کیونکہ یہاں تو ہر کوئی پورا سال یہ چاہتا ہے کہ اس کا زیادہ تر وقت چولہے یا انگیٹھی کے قریب بیٹھ کر آگ تاپتے گزرے۔"

میں نے کیٹن لی سے کہا کہ ہمارے ملک کے کچھ سینئر جو یہاں دو سال گذار چکے ہیں وہ بتاتے ہیں کہ جون یا شاید جولائی میں بعض ایسے دن بھی آتے ہیں جن میں کافی گرمی پڑتی ہے اور کم از کم دن کے وقت کوٹ پہننے کی ضرورت نہیں پڑتی اور کمرے کی کھڑکی بھی تھوڑی سی کھول سکتے ہیں۔ لی نے سردی کے مارے اپنے دانت کچکچاتے ہوئے ایڑیوں کے بل کھڑے ہوکر بس تلاش کرنے کے لئے نظر دوڑائی اور کہا۔ "نامعلوم وہ دن کب آتے ہیں اور سال میں ایسے صرف دو یا تین دن ہی ہوتے ہیں یا کچھ زیادہ۔ میں نے تو آج تک سوئیڈن کے کسی ایک شہر کی بھی ایسی تصویر نہیں دیکھی ہے جس میں کوئی کھڑکی کھول کر جھانک رہا ہو یا بالکونی میں بیٹھا ہو۔"

"ویسے ان ملکوں میں گرمی نہ ہو تو اچھا ہے۔" کیٹن سلیم نے کہا۔

"کیوں بھئی آپ انگیٹھیاں بیچتے ہیں کیا؟" لی نے اس سے پوچھا۔

"اس لئے کہ اس صورت میں سخت گھٹن ہوگی۔ یہاں کی کسی بس میں کھڑکی کا وجود ہی نہیں۔ گھروں کی کھڑکیاں صرف 35 ڈگری کھلتی ہیں جن سے کیا خاک ہوا اندر آئے گی۔ نہ دکانوں پر پنکھے فروخت ہوتے ہیں نہ چھتوں میں ان کے لگانے کے کنڈے یا سوئچ ہیں۔ گرمی میں تو بندے کی حالت خراب ہو جائے۔" سلیم نے جذباتی انداز میں کہا۔

”کوئی بات نہیں۔“ کیپٹن لی نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ”میں تو ان گرمی کے دنوں میں بھی سردی کا تصور کرکے ہی ٹھٹھرتا رہوں گا۔“

تم نے گیدڑ کا شکار کیا ہے؟

18 نمبر بس آگئی جس کا ہمیں انتظار تھا اور جس کے ذریعے ہمیں گستاوو اڈولف نام کے بس اسٹاپ پر پہنچنا تھا جو مالمو شہر کا کراچی کے صدر یا ایمپریس مارکیٹ جیسا مرکزی بس اسٹاپ ہے جہاں سے سارے شہر کی طرف بسیں روانہ ہوتی ہیں۔ بس کا بورڈنگ کارڈ دکھا کر ہم بس میں آئے تو مزہ آگیا۔ بس اندر سے خاصی گرم تھی اور ہم لوگوں کو ہیٹر کے پاس ہی جگہ مل گئی۔ ”کیپٹن لی! اس کے بعد جس دوسری جس میں بیٹھنا ہے اس کا نمبر اور بس اسٹاپ کا نام تو معلوم ہے نا؟“

آپ بالکل بے فکر رہیں ”کیپٹن لی نے پر اعتماد لہجے میں جواب دیا۔ ”آپ آنکھیں بند کرکے مجھ جیسے کپتان کی تقلید کریں۔ میں کل جا چکا ہوں اور جہاز کا کپتان راستہ کبھی نہیں بھولتا۔ جو لوگ مجھ سے بھی پہلے

آچکے ہیں وہ بتاتے ہیں کہ ایک مختصر ترین راستہ بھی ہے۔"کیپٹن لی نے قریبی سیٹوں پر بیٹھے جنوبی امریکی لوگوں کی طرف اشارہ کرکے بتایاکہ "ان لوگوں نے مجھے راستہ کے متعلق بتایا ہے جو انگریزی سیکھنے کے لئے چھ ماہ قبل ہی مالمو پہنچ چکے تھے۔" یہ لوگ موزمبق کے افریقی لوگوں کے ساتھ پرتگالی یا شاید ہسپانوی زبان میں باتیں کر رہے تھے۔ پرتگالی اور ہسپانوی زبانیں ایسی ہیں کہ کوئی سرائیکی میں بات کرے اور دوسرا سندھی میں توکام چل جاتا ہے۔

کیپٹن لی کا ساتھ پاکر میں نے سکون کا سانس لیاکہ یہاں سوئیڈن میں آنے میں ایک ہفتہ کی تخیر ضرور ہوئی لیکن آج ہم یونیورسٹی وقت پر پہنچ جائیں گے۔ یہ سوچتے ہوئے میں نے بریف کیس سائیڈ میں رکھدیا اور دستانے اور ٹوپی اتارکر گود میں رکھے۔گرم بس میں بیٹھ کر کیپٹن لی کے بھی ہوش ٹھکانے آچکے تھے۔ وہ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر کھر درے قسم کے بالوں والی میری ٹوپی کو غور سے دیکھنے لگا جو ٹوپی کم اور خارپشت زیادہ لگ رہی تھی۔ شاید وہ سوچ رہا تھاکہ یہاں کی سردی میں اس قسم کی ٹوپی نہایت ضروری ہے۔ آخر اس سے رہا نہ گیا اور اس نے شرارتی انداز میں بحری جہاز کے خلاصیوں والی انگریزی لہجے میں مجھ سے پوچھا۔ "اے بھائی تم نے یہ ٹوپی کہاں سے لی۔"

اور پھر اس سخت بالوں والی ٹوپی پر ہاتھ پھیر کر کہنے لگا۔ "کیا تم نے کسی گیدڑ کا شکار کیا؟"

"نہیں میرے ایک دوست کو چڑیا گھر کے چوکیدار نے تحفے میں دی تھی۔" میں نے جواب دیا۔

بس کنگس گاٹن اسٹاپ پر رکی تو کیپٹن لی نے بتایا کہ اب صرف تین اسٹاپ رہ گئے ہیں جس کے بعد والے بس اسٹاپ پر اتر کر دوسری بس لینی ہے لیکن بس جیسے ہی اگلے اسٹاپ پر رکی تو **ایک** دو میکسیکن اور موزمبیق (افریقہ) کے لوگ وہاں اتر گئے۔ کیپٹن لی نے میرا بازو پکڑ کر کہا۔ "اس سے پہلے کہ بس کا دروازہ بند ہو جائے ہم لوگ اتر جائیں۔"

ہم جلدی جلدی بس سے اترے اور تیز قدموں سے آگے جانے والوں کے تعاقب میں سڑک عبور کر کے آگے بڑھتے گئے۔

"یہ کیا ہے؟ کہیں ہم راستہ نہ بھول جائیں۔" میں نے لی سے کہا۔

"سوئیڈن میں تم کبھی راستہ نہیں بھول سکتے۔" لی نے جواب دیا۔

"لی! یار تم آخر اترے کیوں؟ ہمیں اترنا تو کسی اور اسٹاپ پر تھا؟" میں نے کہا۔ لی نے اپنے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر مجھے خاموش رہنے کا اشارہ کیا اور ملئی زبان میں کہنے لگا۔

"جالان مچام اتیک تاک مچام ایام" (بطخ کی طرح پیچھے پیچھے آتے جاؤ مرغی کی طرح نہیں) پھر کیپٹن سلیم قاسم سے کہا۔ "ملائیشیا کی بطخوں اور مرغیوں کی بات الطاف سے پوچھنا کہ وہ کس طرح چلتی ہیں۔"

"کیپٹن لی یہ قصہ تم خود ہی سناؤ۔" میں نے ہنستے ہوئے کہا۔

"کیوں! یاد نہیں ہے کہ گاڑیوں کے رش کے باوجود بطخ کیسے پر سکون انداز میں سڑک پار کرتی ہے۔ اس کے پیچھے پیچھے اس کے ساتھ آٹھ بچے بھی ہوتے ہیں۔" کیپٹن لی نے کہا اور پھر کیپٹن سلیم سے مخاطب ہو کر کہا۔ "میرے دوست! بطخ ہمیشہ عزم کے ساتھ آگے بڑھتی ہے۔ مرغی اس معاملے میں بے وقوف ہے۔ وہ بیچ سڑک میں سامنے سے آتی گاڑی دیکھ کر شش و پنج میں پڑ جاتی ہے کہ آگے بڑھوں یا واپس چلی جاؤں اور اس چکر میں وہ اکثر گاڑی کے نیچے آ جاتی ہے۔"

یہ سن کر کیپٹن سلیم ہنسنے لگا۔

"ہاں بالکل سچ کہہ رہا ہوں۔" لی نے کہا۔ "الطاف سے پوچھو ملائیشیا میں اس نے کبھی سڑک پر مری ہوئی بطخ دیکھی؟ کبھی نہیں۔ لیکن مردہ مرغیاں تمہیں سڑک پر بچھے ہوئے قالین کی مانند نظر آئیں گی۔"

ہم جنوبی امریکہ اور افریقہ کے لوگوں کا یہ سوچ کر تعاقب کر رہے تھے کہ شاید وہ ہم سے زیادہ عقلمند ہیں اور انہوں نے ضرور کوئی مختصر ترین راستہ ڈھونڈ نکالا ہو۔ لیکن وہ لوگ جب سڑک عبور کر کے سیدھے ہاتھ کی طرف ڈپارٹمنٹل اسٹوروں کی طرف بڑھنے لگے تو ہمارا رہنما یا گائیڈ کیپٹن لی بھی پریشان ہو گیا۔ چلا کر ان سے پوچھنے لگا: "دوستو کہاں کا قصد ہے؟"

موزمبیق والا جو سب سے آخر میں تھا، لی کی چیخ و پکار سن کر ہماری طرف منہ کر کے طرح طرح کی شکلیں بنانے لگا لیکن کوئی آواز نہ نکالی۔ ہمارے اظہار حیرت پر کیپٹن لی نے کہا کہ دراصل یہاں مصیبت یہ ہے کہ ہر کوئی انگریزی بولنے والے **ملک** سے تو ہے نہیں جیسے کہ ہم لوگ ہیں۔ یعنی اپنے **ممالک** پاکستان، بھارت، ملائیشیا، سنگاپور، کینیا، نائیجیریا وغیرہ میں قومی زبان کے علاوہ دوسری زبان انگریزی ہے۔ لیکن یہاں افریقہ کے

کئی ملکوں سے لوگ آئے ہوئے ہیں جن میں فرانسیوں، اطالویوں، پرتگالیوں وغیرہ کی حکومت تھی اور وہ لوگ انگریزی سے ناواقف رہے۔ اب یہاں آکر تھوڑی بہت انگریزی سیکھی ہے اور جب بھی ان سے کوئی سوال کرو تو اس کا جواب پہلے اپنی مادری زبان میں سوچ کر اپنی بات کا فرانسیسی یا پرتگالی میں ترجمہ کرتے ہیں تب تک سوال پوچھنے والا بیزار ہو جاتا ہے۔

کیپٹن لی موزمبیق (افریقہ) کے اس جہاز راں سے جو ہماری طرح ایم ایس سی کرنے سوئیڈن آیا تھا، اپنے سوال کا جواب حاصل کرنے کے لئے اپنے سوال کو آسان کرکے اسے پیش کرنے کے لئے Objective صورت میں بنایا تاکہ جواب میں اسے صرف Yes یا No کہنا پڑے۔

مثلاً Going to University

جواب میں انہوں نے انکشاف فرمایا "نو پوسٹ آفس۔"

کیپٹن لی نے یہ سن کر سر پیٹ لیا۔

"مرواد یا ان لوگوں نے پہلا پیریڈ تو گیا۔ واپس لوٹو اسی لئے تو کہتے ہیں کہ نئے ملک اور سمندر پر شارٹ کٹ، رانگ کٹ ہوتا ہے۔ آپ نے ہماری غلط رہنمائی کی۔" میں نے کیپٹن لی سے کہا۔

"اس کا مطلب یہ ہوا کہ ایک کپتان کی بے عزتی ہوئی۔" کیپٹن لی نے افسردہ ہونے کی اداکاری کی۔

"کیپٹن لی اب جلدی اسی بس اسٹاپ پر چلو جہاں بس چھوڑی تھی۔" کیپٹن سلیم قاسم نے کہا۔ "سردی سے حالت خراب ہو رہی ہے کل کوئی چاہے ہمیں عقلمند بطخ کہے یا کندذہن مرغی۔"

"سر! ویری سوری! کیپٹن ہمیشہ صحیح راستہ دکھاتا ہے لیکن آج ذرا غلطی ہوگئی۔" کیپٹن لی نے کہا اور اس کے بعد اس نے میری منت سماجت کی " یار الطاف اس بات کو یہیں ختم کردینا، کہیں ملائیشیا کے کسی ساتھی کے سامنے تذکرہ کرنے نہ بیٹھ جانا۔"

جہاز رانی کے لئے کیا ضروری ہے؟

معاشیات کے انگریز پروفیسر الڈرٹن نے جہازوں کی دنیا کا مختصر تعارف کرانے کے دوران ہم سے سوال پوچھا۔

© © جہاز رانی شروع کرنے کیلئے آپ سب سے پہلے کیا کریں گے؟"

"جہاز خریدیں گے۔" آگے کی قطار میں بیٹھے ہوئے وسطی امریکہ کے ملکوں کے شاگردوں میں سے نکارا گوا یا شاید ہونڈورس کے نمائندے نے جواب دیا۔

"جواب غلط ہے۔ بیٹھ جاؤ" پروفیسر نے اس جواب کو رد کرتے ہوئے کہا۔

"جہازوں کے نقشے۔" اگلی نشستوں پر بیٹھنے والوں میں سے ایک خاتون نے جواب دیا۔

"کیا ہیں آپ؟" پروفیسر نے پوچھا۔

”سر میں کولمبیا (امریکہ) سے تعلق رکھتی ہوں اور وہاں پورٹ اتھارٹی کی کنٹرولر ہوں۔“ خاتون نے اپنا تعارف کرایا۔

”جواب غلط ہے۔“ پروفیسر نے اسے بھی بٹھادیا۔

”سامان درآمد برآمد کرنے والے تاجر۔“ ملاوی (افریقہ) سے آئے ہوئے ایک طالب علم نے کہا۔

پروفیسر صاحب اس کے جواب کو غلط یا صحیح قرار دے اس سے پہلے پیچھے بیٹھے ہوئے ترکی سے تعلق رکھنے والے حسن بقال نے کہا۔ “سر اس کا جواب تو سو فیصد غلط ہوگا۔“

حسن بقال جہازوں کا چیف انجنیئر ہے اور ہر وقت ہنسی مذاق میں وقت گزارتا ہے۔

”کیوں بھئی آپ یہ بات اتنے وثوق سے کیسے کہہ سکتے ہیں؟“ پروفیسر نے حسن بقال سے پوچھا۔

”اس لئے کہ چاڈ، زائر اور زیمبیا کی طرح ملاوی کا بھی اپنا سمندر نہیں ہے اس لئے اسے جہاز رانی کا کیا علم۔“

”آپ اپنے ملک میں کس عہدے پر کام کررہے ہیں؟“ پروفیسر نے ملاوی کے نمائندے سے پوچھا۔

”میں وزارت مواصلات میں ماہر معیشت ہوں۔“

”بہر حال جواب غلط ہے، بیٹھ جائیں۔“ بوڑھے پروفیسر نے کہا۔

”سر ہمت، محنت اور ایمانداری کی ضرورت ہے۔“ ایران سے آئے ہوئے ایک شاگرد نے کہا جو اپنے ملک کی ایک بندرگاہ کا ڈائریکٹر ہے۔

”بیٹھ جائیں۔“ پروفیسر نے اسے بٹھاتے ہوئے کہا، “اس کے بغیر تو کوئی بھی کام نہیں چل سکتا۔“

”اخبارات میں اشتہار۔“ نائیجیریا کی میرین اکیڈمی کی پروفیسر جولی نے کہا۔

”غلط۔“

”سر مجھے کچھ کہنے کی اجازت ہے؟“ ترکی کے حسن بقال کے ساتھ بیٹھے ہوئے آذر بائیجان کے چنگیز تیمورلو نے کھڑے ہوکر پوچھا۔

روس کی سابقہ ریاست آذر بائیجان اور ترکی کے درمیان سیاسی دوستی ہے یا نہیں لیکن ایک ہی زبان ترکی بولنے کی وجہ سے چنگیز اور حسن کی دوستی بہت اچھی ہے۔ ان کی دوستی کی اور بھی کئی مشترکہ وجوہات ہیں۔ مثلاً تھوڑی تھوڑی دیر کے بعد سگریٹ پینا، اچھے کپڑے پہننا، شراب اور لڑکیوں میں دلچسپی رکھنا۔ سوئیڈن میں دو سال گزارنے کے بعد وطن واپس جاکر ایک دوسرے کے ملک سے ضرورت کے مطابق درآمد و برآمد کا کاروبار شروع کرنا وغیرہ۔

”بھئی جواب دینے سے میں نے کسی کو بھی نہیں روکا ہے۔“ پروفیسر نے چنگیز سے کہا۔

”میرا مطلب ہے میرا جواب سن کر آپ برا تو نہیں منائیں گے؟“ چنگیز نے باادب چیلے کی اداکاری کی۔

”میں سمجھ گیا کہ آپ کیا کہنا چاہتے ہیں چنگیز خان، لیکن اب کھڑے ہوگئے ہو تو دوسروں کو بھی سنادو اس سے کم از کم تمہاری انگریزی اچھی ہو جائے گی۔“

"سر جہاز رانی کا دفتر کھولنے کے لئے ایک خوبصورت سیکریٹری رکھنا اولین ضرورت ہے۔"

"غلط۔"

"سر آپ ہی بتادیں خواہ مخواہ لوگوں کو پتہ چل جائے گا کہ آپ کی پوری کلاس نکمی ہے۔" ترکی کے حسن بقال نے سب کی نمائندگی کی۔

"تو سنو۔" پروفیسر نے جواب دیا۔ "سب سے پہلے ٹیلیفون، فیکس، انٹرنیٹ وغیرہ ضروری ہیں تاکہ با آسانی ہر کسی سے رابطہ رکھا جاسکے۔ اس بات کو سب نے دلی طور پر تسلیم کیا کہ تجارت، جہاز رانی اور دیگر شعبوں کے لئے آج کل کے دور میں مواصلاتی نظام ضروری ہے جب تک جہاز کا مالک، سامان بیجھنے اور منگوانے والے اور جہاز راں ایک دوسرے کے رابطے میں نہیں رہیں گے تو پیسے کے ساتھ وقت کا بھی زیاں ہوگا۔

پرانے زمانے میں جہاز کا مالک خود ہی جہاز راں بھی ہوتا تھا۔ اور صرف اپنا سامان ہی اٹھاتا تھا۔ جب لنگر اور رسیاں کھول کر چل پڑتا تو اس کے واپس آنے کی امید تب ہوتی تھی جب دوسرے سمت سے ہوائیں چلنا شروع ہوتی تھیں اور اس کے زندہ سلامت لوٹنے کا پتہ تب چلتا تھا جب اس کا جہاز بندرگاہ میں پہنچتا تھا لیکن آج سب کچھ بدل چکا ہے۔ مواصلات یعنی فون، تار، فیکس، انٹرنیٹ وغیرہ نے جہاز رانی کی دنیا میں انقلاب برپا کردیا ہے اور رابطوں کے بغیر جہاز رانی کا کاروبار چلانا اندھے کنویں میں چھلانگ لگانے کے مترادف ہے۔

دنیا کا پرانا کاروبار

ہمارے ان پروفیسر صاحب کو لیکچر کے دوران تھوڑے تھوڑے وقفے کے بعد سوال کرنے کی عادت ہے۔ ویسے تو پڑھانے کے خیال سے یہ اچھی بات ہے اس سے لیکچر سننے والا چوکنا رہتا ہے اور ایک اچھے استاد کے لئے ضروری ہے کہ وہ تدریس کے دوران سوال ضرور کرے۔ اب ان پروفیسر الڈرٹن کے سوال واقعی اس مہم کے تحت ہیں یا پڑھاتے وقت مذاق کرنا ان کی عادت ہے یا وہ ہمیں ذلیل کرنا چاہتے تھے۔ بہر حال اس سوال و جواب کی نشست میں وہ اور ہم دونوں ہی لطف اندوز ہوتے تھے۔

چائے کے وقفے سے قبل انہوں نے ایک اور سوال کیا

”گاہک سامان بھیجتے وقت کیا چاہتا ہے؟“

”وہ جہاز دیکھنا چاہتا ہے کہ نیا ہے یا پرانا۔“ ہم لوگوں نے جواب دیا۔

”غلط ہے۔“ پروفیسر نے اپنی سفید بھنوؤں پر انگلیاں پھیرتے ہوئے کہا۔

”وہ جہاز ران کمپنی کی عمارت دیکھنا چاہتا ہے۔“ ہم نے اندھیرے میں ایک اور تیر چلایا۔

”نہیں۔“ صحیح جواب یہ ہے “گاہک ہمیشہ یہ چاہتا ہے کہ اس کا سامان منزل تک صحیح سلامت پہنچ جائے۔ اسے اس سے کوئی غرض نہیں کہ آپ کے پاس چھوٹے جہاز ہیں یا بڑے، آپ کی کمپنی کا دفتر صرف دو کمروں پر محدود ہے یا دو منزلوں پر۔“

تجارت کی بنیادی تھیوری پر لیکچر دیتے ہوئے ایک دن کہا۔ “تجارت انسان کی سب سے قدیم سرگرمی ہے۔“

پیچھے بیٹھے ہوئے کچھ شاگردوں نے خاص طور پر برازیل اور وینزویلا کے نمائندوں نے باجماعت “نہیں نہیں”کا نعرہ بلند کیا۔ Prostitution ” سب سے قدیمی کاروبار ہے۔“

پروفیسر الڈرٹن نے ایک دم ہتھیار ڈال دیئے۔

”چلیں تجارت کا نمبر اس کے بعد سہی۔“

اس کے بعد انہوں نے صنعت اور تجارت سے متعلق کچھ اہم نکات بتائے۔ وہ ممالک جو معدنیات کی دولت سے مالا مال ہیں جیساکہ تیل، لوہا، سونا، یورینیم وغیرہ وہ دوسروں کے مقابلے میں خوش نصیب ہیں اور ان کو دوسروں سے تجارت کرنے میں فائدہ ہے لیکن اس کو دائمی طاقت نہ سمجھا جائے۔ ہو سکتا ہے ان کے پاس معدنیات کے ذخائر محدود ہوں۔ کچھ عرصے کے بعد تیل، لوہے، تانبے، پیتل وغیرہ کی کمی بھی ہو سکتی ہے یا ہو سکتا ہے دوسرا کوئی ملک جس کے پاس کچھ بھی نہ ہو اپنی بقاء کے لئے ان چیزوں کا کوئی نعم البدل ایجاد کرلے جو اصل پیداوار سے بہتر اور سستا ہو۔ جیسے کہ آج کل کئی ممالک ریشم اور ربڑ بنانے کے چکر میں لگے ہوئے ہیں۔ بنگلہ دیش نے جوٹ کی اور ملائیشیا نے ربڑ کی قیمتوں میں اتنا اضافہ کر دیا ہے کہ کئی لوگ ان چیزوں کی کیمیائی طریقے سے بنانے کی کوشش میں لگے ہوئے ہیں۔ یہی حال عرب ممالک کا ہے۔ تیل کی وجہ سے عرب ممالک اپنا معیار بہتر سے بہتر

کرتے جارہے ہیں۔ کل ان کی یہ زیر زمین تیل کی ندیاں کم یا خشک ہو جائیں گی تو انہیں پچھتانا پڑے گا۔ بہر حال وہ ممالک جن کے پاس معدنیات کے ذخائر نہیں ہیں انہیں ہم بدنصیب نہیں کہہ سکتے بلکہ ایسے ممالک کے لوگ جفاکش ہوتے ہیں اور اپنی بقاءکی جدو جہد میں کوئی نہ کوئی نئی چیز ایجاد کرلیتے ہیں۔ جاپان کی مثال سب کے سامنے ہے۔

اچھی آب و ہوا اور زرخیز زمین بھی قدرت کی نعمت سمجھی جاتی ہے۔ ان ممالک کے لوگ ایسی چیزیں مثلاً پھل، سبزیاں وغیرہ پیدا کرسکتے ہیں جو دوسرے ملکوں میں نہیں اگتیں مثلاً ناروے، سوئیڈن، کینیڈا جیسے ملکوں میں آپ آم، کھجور، خربوزہ وغیرہ پیدا نہیں کرسکتے کیونکہ وہاں کی زمین اور موسم ان چیزوں کو پیدا کرنے کے لئے ناموزوں ہے۔

ویسے تو آج کل جدید سائنسی طریقوں سے فائدہ اٹھا کر ناروے جیسا ملک بھی چاہے تو خربوزہ اور موسمیوں جیسے پھل اگا سکتا ہے جس کے لئے اسے درختوں کی چاروں طرف چٹائیوں جیسی چیزیں لگا کر گرمی پہنچانے کا بندوبست کرنا پڑے گا لیکن اس سارے اہتمام کی وجہ سے وہ چیزیں اتنی مہنگی پڑیں گی کہ اس کے مقابلے میں دور دراز کے ملکوں سے منگوانے میں کم لاگت آئے گی۔

ویسے سب سے بڑا پیر پیسہ ہے جس کا ہونا سب سے اہم بات ہے۔ آپ کے ملک میں پیسہ ہے تو آپ سب کچھ کرسکتے ہیں۔ پیسہ آنے سے ٹرانسپورٹ کی ضرورت بڑھ جاتی ہے۔ 1973ءمیں تیل کی قیمتیں بڑھیں، عربوں کے پاس خوب دولت آئی۔ 1976ءتک عرب ملکوں کی طرف سامان جانے کی وہ دھوم مچ گئی کہ سامان اٹھانے کے لئے جہاز کم پڑ گئے۔ جو جہاز تھے ان کے کھڑے ہونے کے لئے جدہ، دمام، دبئی جیسی بندرگاہوں میں جگہ نہیں مل پارہی تھی۔ جہازوں کو چلانے کے لئے افسر نہیں مل رہے تھے۔ ہر ایک کا رخ عرب ممالک کی طرف تھا جہاں پیسے کی ریل پیل تھی۔

تجارت کے معاملے میں ایک چیز ذہن نشین کرلینی چاہیے کہ تجارت دو طرفہ تبادلے کا نام ہے۔ اگر کوئی خریدار نہ ہو تو آپ کی لاکھوں ڈالروں کی سرمایہ کاری برباد ہو جائے گی۔ اس لئے یہ امیر ممالک اور لوگوں کے فائدے کی بات ہے کہ وہ غریب کو زیادہ غریب ہونے سے بچائیں۔ امیر ملک اگر غریب ممالک کی امداد نہیں کرسکتے تو ان کو کچھ ادھار ہی دے دیا کریں تاکہ وہ زندہ رہ سکیں۔

آذربائیجان کے نمائندہ شاگرد نے کھڑے ہو کر کہا۔ "جیسے امریکہ کررہا ہے افریقہ اور ایشیا کے ملکوں کا خون چوس کر کبھی کبھی کیڑا لگی ہوئی گندم دے دیتا ہے۔"

اس کی اگلی نشست پر بیٹھے ہوئے رومانیا کے کیپٹن کانستروت نے ایک دم آذربائیجان والے سے کہا۔

"اور آپ لوگ کونسے خدا کے نیک بندے ہیں۔ اب روس الگ الگ ریاستوں میں بٹ گیا ہے تو آپ میں سے ہر ایک خود کو فرشتہ سمجھنے لگا ہے۔"

روس کمیونزم کے نام پر کئی برس تک رومانیہ، بلغاریہ، پولینڈ جیسے ملکوں کو تنگ کرتا رہا۔ اس کا بدلہ شاید رومانیہ کا نمائندہ آج بھری محفل میں لینے کے موڈ میں تھا۔ لیکن اس کے ساتھ بیٹھے ہوئے وینز والا سے تعلق رکھنے والے ایک شاگرد نے اسے خاموش کراتے کہا۔

"چھوڑو یار یہ معاشیات ہے۔"

"میں بھی معاشیات کی بات کررہا ہوں جو روس نے اپنی بھی اور ہمارے ایسے ملکوں کی بھی تباہ کردی۔ سیاست کو تو میں چھو بھی نہیں رہا۔"

یہ تو تو میں میں کو سُن کر پروفیسر صاحب نے اعلان کیا کہ بہتر ہوگا آپ لوگ چائے اور سگریٹ نوشی کے لئے وقفہ کرلیں۔

عید کب منائیں؟

ملائیشیا سے آئے ہوئے چیف انجینئر ذوالنورین نے ایک دن لائبریری میں مجھ سے پوچھا کہ یہاں سوئیڈن میں ہم روزے تو رکھے جارہے ہیں لیکن عید کی آمد کا کیسے پتہ چلے گا؟

ذوالنورین کے ساتھ ملائیشیا کی میرین اکیڈمی میں میں نے تقریباً آٹھ نو سال گزارے تھے۔ ملائیشیا کی حکومت نے یہاں کی ورلڈ میری ٹائم یونیورسٹی میں سمندر سے متعلق مختلف مضامین میں ایم ایس سی کرنے کے لئے جو تین چار سینئر آفیسر بھیجے تھے، ذوالنورین ان میں سے ایک تھا۔ ملئی زبان جاننے کی وجہ سے ملائیشیا سے آیا ہوا ذوالنورین بھی میرا مقرب تھا۔ میں نے اسے سمجھایا کہ بھائی چپ چاپ روزے رکھے جاؤ۔ مختلف عرب ممالک سے آئے ہوئے عربوں میں جب بحث زور پکڑ جائے تو سمجھ جانا کہ عید نزدیک آگئی ہے۔

اور پھر ایک دن ذوالنورین دوڑتا ہوا میرے پاس آیا اور کہا کہ تھوڑی دیر کے لئے کینٹین میں چلئے۔

"کیوں بھئی خیریت تو ہے۔کسی کی ہاتھا پائی ہوگئی ہے۔" میں نے پوچھا۔

"بس وہ ہی اب ہونے والی ہے۔ سعودی عرب، اردن، بحرین کے عربوں میں سخت گرما گرم بحث چھڑ گئی ہے شاید عید کے سلسلے میں۔" ذوالنورین نے بتایا۔

یونیورسٹی کینٹین میں پہنچے تو عربی زبان میں سب کے سب ایک ساتھ ہی بول رہے تھے اور کوئی بھی قائل نہیں ہورہا تھا۔ ہم عربی سے نابلد صرف دو الفاظ سمجھ سکے۔ Latitude واحد Longitude واحد!

میں نے ذوالنورین سے کہا۔ "سو فیصد عید کی بات ہورہی ہے اب صرف یہ دعا کرو کہ عید کا ایک ہی دن مقرر ہو۔"

تھوڑی دیر کے بعد اردن کے ایک صاحب اس بحث سے اٹھ کر ہماری میز پر آبیٹھے۔ میں ان کے لئے کافی لے آیا اور خیریت دریافت کی۔

"یار عید کا تنازعہ ہے۔" اس نے صاف انگریزی میں بتایا۔ "ہم لوگ کل عید کررہے ہیں لیکن الجیریا، تیونس، مراکش وغیرہ کے افریقی عرب پرسوں کرنا چاہتے ہیں۔ کم ازکم ایک ہی درجہ طول اور عرض پر رہنے والے لوگوں کو تو ایک ہی دن عید کرنی چاہیے۔"

"اور اس شہر مالمو میں رہنے والے مقامی مسلمان عید کب کررہے ہیں۔" ذوالنورین نے پوچھا۔

"یہاں کے لوگ پرسوں عید کررہے ہیں لیکن ہم اردن، مصر، عمان کے لوگ فیریوں (چھوٹے بحری جہازوں) کے ذریعے پڑوسی ملک ڈنمارک کی مسجد میں عیدنماز پڑھ آئیں گے کیونکہ ڈنمارک میں عید کل ہے۔ سعودی عرب، یمن، تیونس والے سوئیڈن میں رہنے والے مسلمانوں کے ساتھ یہاں مالمو میں پرسوں عید نماز پڑھیں گے۔"

اتنے میں بنگلہ دیش کا کیپٹن امین الرحمان وہاں آپہنچا۔ وہ سوئیڈن کی اس یونیورسٹی میں Ship Management کے مضمون مین ایم ایس سی کررہا ہے۔ کیپٹن امین بنگلہ دیش شپنگ کارپوریشن کے منیجر ہیں۔ انہوں نے مشورہ دیا کہ ایسے کرتے ہیں کہ ہم لوگ یہاں کے مسلمانوں کے ساتھ مل کر پرسوں عید کرلیتے ہیں۔

"ایسا ہرگز نہیں ہوگا۔" اردن والے نے ضد میں کہا۔ "اکتیس روزے رکھنا حرام ہے۔ میں نے آپ لوگوں سے ایک دن پہلے روزے رکھنے شروع کئے تھے۔" "لیکن رمضان کے مہنے سے ایک دن پہلے والا تمہارا روزہ دراصل رمضان کا تو نہیں ہوگا۔ وہ تو تم نے ایسے ہی رکھا۔"کیپٹن امین نے اسے سمجھانے کی کوشش کی۔

"لیکن میں نے وہ روزہ اپنے ملک میں رمضان کی نیت سے رکھا تھا جہاں رمضان دوسرے ملکوں سے ایک دن پہلے ہی شرع ہوچکا تھا۔"

"تو پھر ایسا کرو کل روزہ نہ رکھو خوب کھاؤ پیو لیکن صبح صبح اس سردی میں فیری میں سوار ہوکر ڈنمارک جاکر نماز پڑھنے کی بجائے پرسوں یہاں مالمو میں عید نماز پڑھنا۔" لیکن کوئی بھی فیصلہ نہ ہوسکا۔ اسی اثناءمیں افریقہ کے بعض مسلمان ملکوں‌کے لوگ بھی آگئے۔ اپنے قریب کھڑے ایک حبشی شاگرد سے میں نے اس کا ملک پوچھا۔ "میں بینن (Benin) کا رہنے والاہوں وہاں کی بندرگاہ میں ہاربر ماسٹر ہوں۔ یہاں پر Port & Shipping Admin میں ایم ایس سی کررہا ہوں۔"

"بینن کہاں ہے؟" میں نے سوال کیا۔

"نائیجیریا کے قریب ہے۔ بینن کا اصل نام ذہومی تھا۔" اسنے بتایا۔

"چلیں کوئی بات نہیں کیپٹن صاحب یہ بتائیں کہ عید کا کیا کیا جائے؟"کیپٹن سلیم قاسم نے اس سے پوچھا۔

"یار مجھے تو سمجھ میں نہیں آتا کہ ہم چاند اور عید کا دن مقرر کرنے میں اتنا پریشان کیوں ہوتے ہیں۔" بینن کے ہاربر ماسٹر نے کہا "ناٹیکل المانک ایسی کتاب ہے جس میں چاند کی پوزیشن واضح انداز میں دی ہوئی ہے کہ سال کے فلاں دن بلکہ فلاں گھنٹے اور فلاں منٹ میں کہاں ہوگا۔ تو پھر بحث کس بات کی اور اس حساب سے پرسوں سوئیڈن میں عید ہوگی۔"

"نہیں جناب یہاں پر آپ غلط ہیں عید کیلئے چاند دیکھنا ضروری ہے یعنی سورج غروب ہونے کے بعد اس کا نظر آنا ضروری ہے ورنہ ایسے تو کئی مرتبہ ہوتا ہے کہ سورج کی موجودگی میں نیا چاند ہوتا ہے لیکن سورج کی تیز روشنی میں ہم اسے دیکھ نہیں پاتے اور پھر جیسے ہی سورج غروب ہونے لگتا ہے تو چاند بھی اپنا مختصر سفر طے کرکے سورج کے ساتھ غائب ہو جاتا ہے۔" سلیم قاسم نے سب کو سمجھانے کی کوشش کی۔

"حد ہوگئی" بنگلہ دیش کے کپتان امین نے کہا۔ "ایسے موسم میں چاند تو کیا سورج بھی نظر نہیں آتا؟ چھ دن سے سخت برف باری ہورہی ہے مجھے بتائیں چاند کیسے دیکھا جاسکتا ہے؟"

سکندریہ (مصر) کے نیول اکیڈمی سے آئے ہوئے کیپٹن حنفی نے فتویٰ صادر کیا کہ چاند کو اوپر جاکر دیکھا جاسکتا ہے۔

کیپٹن امین مجھے اپنی طرف کھینچ کر چلنے لگا۔ "چلو چلیں یہ بحث شام تک ختم نہیں ہوگی۔ شام کو اپنے شہر (مالمو) کی مسجد کا امام جو کہے گا اسے مانیں گے۔ ایسے تو سال میں ایک ایسی رات بھی آتی ہے جس میں چاند دو مرتبہ نظر آتا ہے۔"

"واقعی؟" میں‌نے کہا کیونکہ یہ بات میرے لئے بالکل نئی تھی۔

"ہاں۔ سچ کہہ رہا ہوں۔ مجھ سے امتحان میں بھی یہ سوال پوچھا گیا تھا۔ دراصل چاند والا سال سورج والے سال سے چھوٹا ہوتا ہے۔ اور سال میں ایک دن مثال طور HOURS 0004 پر چاند ابھرتا ہے پھر اسی دن (یعنی اسی انگریزی تاریخ پر) HOURS 2330 کے قریب دوسری دفعہ چاند طلوع ہوتا ہے۔"

ذوالنورین نے کتابوں کا تھیلا اٹھایا اور کہا کہ "اچھا بھئی میں چلتا ہوں میری طرف سے خدا حافظ اور عید مبارک۔" اور پھر مجھ سے کہا۔ "الطاف عید والے دن ناسی لیما اور ایام گورینگ (ملائیشیا کے کھانے) کھانے ہوں تو میرے گھر ضرور آنا۔"

ذوالنورین اہل خانہ کے آنے کے بعد ہاسٹل چھوڑ کر کرائے کے گھر میں رہنے لگا تھا۔ گھر دور ہونے کی وجہ سے میں شش و پنج میں پڑ گیا کہ وہاں جاؤں یا نہ جاؤں۔

"ہاں کیا سوچ رہے ہو؟ آؤ گے یا نہیں؟" ذوالنورین نے ایک مرتبہ پھر پوچھا۔

"انشاءاللہ۔" میں نے جواب دیا۔

"اس کا مطلب یہ کہ تم نہیں آؤ گے۔" ذوالنورین نے کہا اور اس سے قبل کہ میں جواب میں کچھ کہتا سعودی عرب کے یحییٰ جباری نے ذوالنورین کو سمجھایا کہ اس کا مطلب ہے کہ" اگر اللہ نے چاہا تو۔"

"یہ تو میں بھی سمجھتا ہوں۔" اس نے یحییٰ جباری سے کہا جو سعودی عرب کی نیوی میں کمانڈر ہےں لیکن اس وقت الطاف کا مطلب وہ ہے جو تمہارے جدہ، دمام وغیرہ کی پورٹ اتھارٹی والوں کا ہوتا ہے اور ہمارے جہاز آنے پر ہمیں کسی چیز کا ویزا یا راہداری نہیں دیتے ہیں۔ زور دینے پر یہ ہی کہتے ہیں۔ اوکے انشاءاللہ کل دینگے یعنی اس وقت تو دفع ہو جاؤ۔ سر نہ کھاؤ کل دیکھا جائے گا۔"

یحییٰ جو ویسے ہی شرمیلا تھا یہ سن کر شرما گیا۔ "یار کیسی باتیں کرتے ہو کیا ہماری سعودی عرب کی پولیس اور بندرگاہ کے افسر ایسے ہیں۔"

"نہیں بہت اچھے ہیں لیکن انگریزوں اور گوروں کے ساتھ۔" کیپٹن سلیم قاسم جو ابھی تک خاموشی سے سن رہا تھا بلکہ اپنے دن یاد کررہا تھا جب وہ کپتان کی حیثیت سے جہازوں کو سعودی عرب کی بندرگاہوں میں لے آتا تھا اور اسے کافی پریشانی کا سامنا کرنا پڑتا تھا۔ ان دنوں کا غصہ نکالنے کے لئے اس نے یہ موقع غنیمت سمجھا۔ ہم جیسے پاکستانی، بھارتی اور بنگہ دیشی غریب لوگوں کے ساتھ سیدھے منہ بات نہیں کرتے۔ اب کے جہاز مجھے دمام لے آنا پڑا تو جہاز کا ای ٹی اے تمہیں بھی بھیج دوں گا تاکہ چار پانچ دن میرے ساتھ آکر جہاز پر رہنا۔"

ای ٹی اے سے مراد بندرگاہ میں جہاز کی آمد کا متوقع وقت ہے جو بندرگاہ اور جہاز راں کمپنی کے دفتر کو پہلے ہی بھیج دیا جاتا ہے تاکہ وہ جہاز کے قیام کا بندو بست کر سکیں۔

سوئیڈن میں پہلی عید

آخر عید کا مبارک دن آ ہی گیا۔ بلکہ یوں کہیے کہ عید کا فیصلہ ہوگیا۔ آخری بحث شام کو کھانے سے پہلے ہوئی اور سعودی عرب، اردن، مصر اور مراکش کے لوگوں نے فیصلہ کیا کہ چونکہ ان کے ملکوں میں عید دوسرے دن ہورہی ہے اس لئے وہ لوگ یہاں بھی ایسا ہی کریں گے، چاہے مالمو کے لوگ تیسرے دن منائیں۔

سحری کے وقت میس میں حسب معمول چہل پہل تھی۔ پاکستانی، انڈونیشی، بنگالی اور افریقہ کے کئی ملکوں کے مسلمان سحری کے لئے آئے ہوئے تھے۔ بعض ملکوں کے لوگ غیر حاضر تھے لیکن محسوس نہیں ہورہا تھا اور نہ کوئی دھیان دے رہا تھا۔ جیسے ہی سحری کا وقت ختم ہوا تو دوسرے لوگوں کے ناشتے کا وقت شروع ہوگیا اور سب لوگ تیار ہوکر یونیورسٹی روانہ ہونے لگے۔

روزانہ شروع کے دو تین پیریڈ یونیورسٹی کے پانچویں منزل پر مین لیکچر ہال میں ہوا کرتے تھے جہاں دنیا کے تمام ممالک کے تقریباً ڈیڑھ سو طالب علم جمع ہوتے تھے۔ بقیہ پیریڈ ہر گروپ کے الگ الگ کلاس روم، بندرگاہ، جہازوں یا جہاز سازی کے کارخانوں میں ہوتے تھے۔ اس بڑے لیکچر ہال میں میں ہمیشہ پیچھے بیٹھا کرتا تھا۔ اس دن میرے ساتھ ملائیشیا کا ذوالنورین اور کیپٹن رزالی یعقوب آ بیٹھے۔ کافی نشستیں خالی تھیں اور اس کے بعد آگے پیچھے ایشیا کے مختلف ممالک ویتنام، برما، چین وغیرہ کے لوگ تھے۔

ایک لیکچر جیسے ہی ختم ہوا تو عقبی دروازے سے شور کی آواز آئی۔ پیچھے مڑ کر دیکھا تو سعودی عرب سے تعلق رکھنے والے چار طالب علم فرسٹ کلاس سوٹوں میں ملبوس اندر داخل ہوئے۔ ان کے پیچھے اردن اور مصر وغیرہ کے طلبہ بھی تھے وہ بھی آج چمکیلے کپڑوں میں تھے ورنہ سوئیڈن وہ ملک ہے جہاں بڑے سے بڑا افسر بھی لباس کے معاملے میں مست ملنگ نظر آتا ہے۔ ہم سب لوگوں کا گزارہ بھی سال بھر جینز میں ہوتا ہے اور پھر ان کے پیچھے آخر میں کوئی تین ایرانی تھے وہ بھی مکمل سوٹ میں ملبوس تھے لیکن انہوں نے ٹائی نہیں باندھ رکھی تھی۔ عید کی بات تو میرے ذہن سے نکل چکی تھی لہٰذا میں تعجب سے انکو دیکھتا رہا۔ اگر وہ صرف سعودی عرب کے ہوتے تو میں یہ سمجھتا کہ ان کے سفیر یا وزیر آئے ہیں کیونکہ اس سے پہلے بھی ایک دفعہ جب سعودی وزیر

مواصلات آئے تھے تو اس موقع پر سعودی طلبہ نے بہترین لباس زیب تن کیا تھا لیکن اس وقت سعودی عرب کے علاوہ دوسرے ممالک کے لوگ بھی شامل تھے۔ میں نے ذوالنورین سے پوچھا۔

"خیر تو ہے آج ہمارے یہ عرب لندن جارہے ہیں کیا؟"

"نہیں۔" ذوالنورین نے جواب دیا۔ "مجھے لگتا ہے یہ لوگ عید کی نماز پڑھ کر آئے ہیں۔"

"مکمل سوٹ میں!" میں نے حیرت کا اظہار کیا۔ جس پر میرے پیچھے بیٹھے انڈونیشیا کے مسلمان نے کہا "ہوائی جہازوں کی ہائی جیکنگ کے واقعات میں اضافے کے بعد اب کون عرب اپنا روایتی لباس پہن کر یہاں کے مقامی لوگوں پر جن میں آدھے لوگ یہودی ہیں--- اپنی ثقافت ظاہر کرے گا۔"

سعودی عرب کے صالح الشہری نے پیچھے مڑ کر مجھے دیکھا اور میں نے اسے اردو میں عیدمبارک کہا۔

صالح سعودی نیوی میں سینئر افسر ہے۔ اس نے نیوی کی بنیادی تربیت اور انجینئرنگ میں B-E کی ڈگری کراچی میں چار سال رہ کر پاکستان نیول اکیڈمی منوڑہ سے حاصل کی تھی۔ اس لئے کافی حد تک اردو سمجھ اور بول سکتا ہے۔ صالح میری مبارک بادکا جواب منہ سے دینے بجائے اپنی سیٹ سے اٹھ کر میرے پاس آیا اور عربی انداز مین گلے مل کر میرے دونوں گالوں پر بوسوں سے دیا۔ اس کے اس عمل سے ہال میں موجود سارے لوگ سمجھ گئے کہ ایک مہینے سے مسلمانوں کو جس دن کا انتظارتھا وہ آخر آگیا۔ دو قطاریں آگے بیٹھے حسن بقال نے تصدیق کیلئے کانوں پر ہاتھ رکھ کر تکبیر کا اشارہ کرکے پوچھا کہ یہ عید کی نماز پڑھ چکے ہیں۔

"ہاں اور آپ لوگ؟" میں نے اس سے پوچھا۔

"کل" اس نے مختصر جواب دیا۔

ذوالنورین نے سرگوشیانہ انداز میں مجھ سے کہا۔ "سارے ترک لوگ کل نماز عید ادا کریں گے کیونکہ اس شہر مالمو کی جامع مسجد کا امام ترک ہے۔ اس نے عید کے لئے کل کا اعلان کیا ہے۔"

"پھر ان کو کس نے نماز عید پڑھائی؟" میں نے پوچھا۔

"یہ لوگ اپنے کسی عربی امام کو لے گئے تھے۔" ذوالنورین نے کہا۔

"اور ان ایرانیوں نے بھی عید آج ہی منائی ہے؟"

"ہاں آج ہی منائی ہے اور وہ بھی عربوں کے ساتھ۔"

"ماشاءاللہ" میں نے خوشی کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔ "چلو یہاں کی تاریخ میں کوئی ایک کام تو ایسا ہوا جس پر عرب اور ایرانی متفق ہوئے۔"

دوسرے دن ہم لوگوں نے سوئیڈن کے اس جنوبی شہر مالمو میں رہنے والے مسلمانوں کے ساتھ نمازعید ادا کی۔ اس شہر میں کچھ پاکستانی نژاد سوئیڈش بھی رہتے ہیں جن میں سے ایک ممنون صاحب ہیں جو مالمو کے قریبی شہر لونڈ کی یونیورسٹی میں پروفیسر ہیں۔ دوسرے مسعود ضیغم صاحب ہیں جن کی شہر کے وسط میں کپڑوں کی دکان ہے۔ یہ لوگ ہمیں صبح صبح اپنی کاروں میں لینے آگئے۔ ویسے تو مسجد تک بسیں بھی چلتی ہیں۔

اس شہر میں بہت سی چھوٹی چھوٹی مساجد ہیں یہاں تک کہ ہماری یونیورسٹی میں بھی ایک کمرے کی مسجد ہے لیکن شہر کی یہ جامع مسجد بہت بڑی ہے۔ اس کی دو منزلیں ہیں اوپر کا حصہ خواتین کے لئے مخصوص ہے۔ جمعہ کے روز نمازیوں سے تقریباً بھر جاتی ہے۔ لوگ جوق در جوق عید نماز پڑھنے آئے ہوئے تھے۔

لوگ نماز کے لئے مسجد کے باہر کھلے آسمان کے نیچے کھڑے ہوگئے تھے۔ کئی دن کی پڑی ہوئی برف سخت ہوگئی تھی جس پر لوگوں نے نماز ادا کی۔ ایسے ٹھنڈے ملک میں برف پر نماز پڑھنا ایسا ہی ہے جیسے جیکب آباد یا سبی جیسے شہروں میں شدید گرمی اور دھوپ میں کوئی پکی سڑک پر نماز پڑھے۔ مسجد سے گاڑی میں بیٹھنے تک لوگ کپکپا رہے تھے لیکن اللہ کے نیک بندوں نے ایسی سردی میں بیٹھ کر عید کی نماز پڑھی اور خطبہ بھی سنا۔

مسجد میں جاتے وقت میں نے چاروں طرف غور سے دیکھا۔ انگلینڈ کی مسجدوں میں زیادہ تر ہمارے پاکستانی، بھارتی اور بنگلہ دیشی ہوتے ہیں لیکن اس مسجد میں یہ لوگ آٹے میں نمک کے برابر تھے۔ اتنے بڑے ہجوم میں افریقہ کے حبشی لوگ بھی اکادکا تھے جن میں سے کچھ لوگ ہماری یونیورسٹی کے تھے یا وہ چند لوگ جو یہاں محنت مزدوری کی وجہ سے یا سیاسی پناہ حاصل کرنے کے لئے رہائش پذیر تھے۔ عراقی اور فلسطینی عربوں کے بعد یورپ کے گوروں کی تعداد زیادہ تھی۔ نماز کے بعد کئی ایسے لوگوں سے عید ملتے ہوئے میں نے دریافت کیا تو پتہ چلا کہ یہ گورے لوگ یہیں کے رہائشی ہیں یہ اور بات ہے کہ ان میں سے کچھ لوگ ماضی قریب یا ماضی بعید میں البانیہ، یوگوسلاویہ، بلغاریہ جیسے ملکوں سے یہاں آ کر بس گئے ہیں لیکن کئی لوگ یہاں کے مقامی سوئیڈش بھی تھے جنہوں نے اپنے نئے مسلم ہمسائیوں اور دوستوں کی تبلیغ اسلام کے باعث اسلام قبول کیا تھا۔

میں پچیس تیس سال پرانا مالمو اور اس ملک سوئیڈن کے دوسرے بڑے شہروں کے بارے میں سوچنے لگا جب یہاں کی گلی گلی میں شراب خانے اور شباب خانے ہوتے تھے۔ جہاں ناچ گانوں اور Peep Shows کے کلب ہوتے تھے۔ پوری دنیا میں ننگے پن اور جنسی آزادی کیلئے سوئیڈن مشہور تھا۔ کتنی تبدیلی آگئی ہے اس ملک کے شہروں اور اس ملک کے رہنے والوں میں! جب ہمارے ملک مادیت اور دنیاوی لطافتوں کے پیچھے بھاگ رہے ہیں تو یہ لوگ روحانیت اور سکون کی طلب میں ہیں۔ کہاں گئے وہ کلب جہاں پوری پوری رات عریانیت کا مظاہرہ ہوتا تھا۔ شراب چلتی تھی۔ آج یہاں کا ہر کلب رات دس بجے تک بند ہو جاتا ہے۔ بیئر تک میں پانی ملاکر مزید ہلکا کیا جاتا ہے اور شراب کی قیمتیں بڑھائی گئی ہیں تاکہ پینے والوں کے حوصلہ شکنی ہو اور اگر پیئیں بھی تو نشہ نہ ہو یا اتنا نہ ہوکہ ہوش حواس کھو بیٹھیں۔ کئی کلبوں میں مردوں کے اکیلے آنے پر پابندی ہے کیونکہ بیوی کے ساتھ آنے سے کوئی ناشائستہ حرکت نہیں کرسکے گا اور اٹھارہ سال کے بچوں کے لئے بھی کلب میں آنے کی مکمل پابندی ہے۔ لوگوں کا مذہب اسلام کی طرف رجحان بڑھ رہا ہے جس کے پیش نظر حکومت نے مالمو میں دوسری مسجد بنانے پر پابندی لگادی ہے کیونکہ اس ملک کے کئی لوگ حلقہءاسلام میں آچکے ہیں۔گورنمنٹ یہ نہیں چاہتی کہ ان کے لوگ اپنا مغربی کلچر اورثقافت چھوڑکر حلقہ بگوش اسلام ہوں۔ یہی حال فرانس کا ہے جہاں گذشتہ دس سال میں مساجد کی تعداد سو سے بڑھ کر ایک ہزار سے زائد ہوگئی ہے۔ نماز عید کے بعد مسجد سے باہر نکلتے وقت میں نے ممنون سے کہا۔

”اچھا ہوا عربوں نے ایک دن پہلے عید نماز پڑھ لی ورنہ تو آج اور بھی زیادہ بھیڑ ہوتی۔“

”ویسے سوئیڈن میں مسلمانوں کی تعداد بڑھتی جارہی ہے۔“ ممنون نے کہا۔

”آپ کے خیال میں باہر سے آرہے ہیں یا مقامی لوگ مسلمان ہورہے ہیں۔“ میں نے ممنون سے معلوم کرنا چاہا۔

”باہر سے بھی کافی آرہے ہیں کچھ چوری چھپے اور کچھ سیاسی پناہ لینے کے لیے لیکن ان کے اپنے لوگ سوئیڈش بھی روز بروز مسلمان ہوتے جارہے ہیں۔ ایک دن ٹی وی پر بتایا جارہاتھا کہ ہفتے میں اوسطاً تین چار سوئیڈش مسلمان ہوتے ہیں۔“ ممنون نے بتایا۔

”جی ہاں۔“ مسعود نے اس کی تائید کرتے ہوئے کہا۔“سوئیڈن میں تین چار اورفرانس میں ہفتے میں دس بارہ افراد مسلمان ہوتے ہیں۔“

”کچھ دن پہلے میں نے لندن کے ایک اخبار میں اسلام پر ایک مضمون پڑھا تھا۔“کیپٹن سلیم قاسم نے بتایا۔“ اس میں اس بات کا اظہار تھاکہ یورپ اور امریکہ کی حکومتیں اسلام سے خائف ہیں۔“

”یہ بات صحیح ہے۔“ مسعود نے بتایا۔“مالموکی یہ مسجد بھی بڑی مشکلوںسے مکمل ہوئی ہے کیونکہ حکومت نے دلچسپی لینا چھوڑ دی تھی۔ قریب کے ایک اور شہرگوتا برگ میں تو مسجد بننے پر مقامی لوگوں نے کھلی مخالفت کی اور اخباروں میں شکایتیں لکھیں۔ یہاں تک کہ اس علاقے کے نمائندے کاٹی وی پر انٹرویو بھی آیا تھا۔ اس سے جب مسجد بننے کی مخالفت کا سبب پوچھاگیا تو اس نے جواب میں کہا۔‘مجھے ڈر ہے کہ ہماری ثقافت، رسم و رواج وغیرہ تباہ ہوجائیں گے۔’اس سے مزید پوچھاگیاکہ آپ کوکس سے ڈر ہے ان مسلمانوں سے جو باہر سے آکر یہاں بس گئے ہیں؟ تو اس نے جواب دیا۔‘نہیں ان سے نہیں۔ ان مقامی لوگوں سے ہے جو مسجد بننے کے بعد روز بروز مسلمان ہوتے جارہے ہیں؟’“

میں نے ہنستے ہوئے مسعود سے کہا۔“یہ لوگ خواہ مخواہ ڈرتے ہیں۔ یورپ میں روز جتنے نئے مسلمان ہوتے ہیں ان سے کئی گنا زیادہ مسلمان تو پاکستان، برما اور عرب ملکوں میں مارے جاتے ہیں۔ اخبار اٹھاکر دیکھو سندھ میں کتنے لوگ روزانہ گاڑیوں کے حادثات، چورڈاکوؤں کے ہاتھوں اور پولیس کے لاک اپ میں مرتے ہیں۔ پنجاب میں کتنے مسلمان شیعہ سنی کے چکر میں مارے جاتے ہیں۔کشمیر اور بھارت میں آزادی حاصل کرنے اور مساجد کی حفاظت کی خاطر شہید ہوجاتے ہیں۔ بنگلہ دیش میں ہر آنے والے سمندری طوفان میں کیا حشر ہوتا ہے۔ اس لیے یورپ والوں کو فکر مند نہیں ہونا چاہیئے۔

پاسپورٹ کی پریشانی

ملک سے باہر جانے والوں کے لئے ضروری ہے کہ وہ اپنی رقم اور پاسپورٹ کی جان سے زیادہ حفاظت کریں۔

پردیس میں بٹوہ کھو جانے کے بعد کوئی پُرسا ن حال نہیں ہوتا اور اللہ خیر کرے پاسپورٹ گم ہو جائے تو اس سے بڑھ کر اور کوئی پریشانی نہیں ہو سکتی، خاص طور پر ایک پاکستانی کے لئے۔ ایک پاکستانی کے پاس چاہے سفر کے سارے کاغذات موجود ہوں' پیسوں سے بھی جیب بھری ہو پھر بھی دوسرے ملک کے ایئر پورٹ پر امیگریشن آفیسرز اور سیکورٹی پولیس کسٹم کے عملے سے لے کر سامان اٹھانے والے پورٹرز تک اسے شک کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔

یورپی ممالک کے ہوائی اڈوں پر کالے بالوں یعنی غیر یورپی لوگوں کی ویسے بھی خیریت نہیں اور اگر سیکورٹی عملے کو پتہ چل جائے کہ مسافر کا تعلق پاکستان سے ہے تو ان کو دنیا کی ساری برائیاں اس میں نظر آنے لگتی ہیں۔ جتنا ہو سکے گا اس کے کاغذات اور سامان کی اچھی طرح چھان بین کریں گے کہ کہیں پاسپورٹ جعلی تو نہیں ہے' ان کے ملک میں آنے کے لئے ویزا بھی ہے یا نہیں اور ایسا ہونے کا خطرہ تو نہیں کہ یہ مسافر ان کے ملک میں گھس کر باہر نکلنے یعنی واپس اپنے وطن جانے سے انکار کردے، سامان میں کوئی نشے والی چیز یا بم بارود یا الیکٹرونک کا چھپا ہوا سرکٹ تو موجود نہیں جس سے جہاز یا ایئر پورٹ پر دھماکہ ہو جائے۔

اور اب لندن میں آئی ایم او کے اجلاس میں شرکت کرنے کے بعد میں اپنے گروپ کے ساتھ واپس سوئیڈن جارہا تھا۔ ہمارے گروپ میں کچھ عرب آفیسر بھی تھے کچھ ایشیا اور افریقہ کے اور ایک دو وسطی امریکہ کے ممالک کوسٹاریکا اور میکسیکو کے تھے۔ سب کے سب اپنے ملک کے جہازراں اداروں کے سینئر آفیسر تھے جو اقوام متحدہ کے پروگرام کے تحت سوئیڈن میں دو سال کے لئے جہازوں اور سمندر سے مستقلاً کورسز میں شرکت کیلئے آئے تھے جس میں سے تقریباً چھ یا آٹھ مہینے یورپ کے مختلف ملکوں میں بھی رہنا تھا۔ اس سلسلے میں لندن مین کچھ دن رہنے کے بعد اب ہم سوئیڈن واپس جارہے تھے۔ کئی مہینے اکٹھا رہ کر ہم لوگ اچھے دوست بن گئے تھے اور اب ہنستے باتیں کرتے لندن کے ٹاٹنہام کورٹ زمین دوز ریلوے اسٹیشن پر جانے کے لئے آکسفورڈ اسٹریٹ سے پیدل آرہے تھے۔ اسٹیشن پہنچ کر ٹرین پکڑی جس نے ہمیں ہیتھرو ائیر پورٹ پہنچایا۔ ہم ایک ہاتھ میں پاسپورٹ اور ٹکٹ دوسرے ہاتھ میں سامان کا بیگ پکڑے دوسرے مسافروں کے ساتھ قطار میں کھڑے ہوگئے۔

چار پانچ لوگوں کے بعد ہمارے گروپ والوں کا نمبر شروع ہوا۔ آگے تھائی لینڈ کے کمانڈر سوتی چائی تھے۔ ڈیسک پر بیٹھے ہوئے صاحب نے جلدی جلدی سامان لیا۔ پاسپورٹ پر نظر ڈالی۔ ٹکٹ پھاڑا اور ٹھپے لگا کر بورڈنگ کارڈ تھمادیا۔ اس کے بعد فلپائن کا اور ملائیشیا کا تھا۔ ۔۔۔۔جلدی جلدی پاسپورٹ دکھاتے گئے۔ سامان دیتے

اور آگے بڑھتے گئے پھر میری باری آئی، بیگ میں نے چلتے ہوئے بیلٹ پر رکھا۔ مشین نے وزن نوٹ کیا اور ڈیوٹی پر موجود آفیسر نے میرے پاسپورٹ کو دیکھ کر یعنی اس پر پاکستان کا نام پڑھتے ہی Moving Belt کو بریک مارکر بیگ کو آگے بڑھنے سے روک دیا۔

"یہ بیگ آپ کا ہے؟" اس نے مجھ سے پوچھا۔

"جی ہاں" میں نے جواب دیا۔

"آپ ہی نے اس میں سامان پیک کیا ہے؟"

"جی ہاں" میں نے مسکراتے ہوئے جواب دیاکیونکہ اس سوال پر ذرہ برابر بھی میرے ذہن میں یہ نہیں آرہا تھاکہ یہ ایسے سوالات مجھ سے کیوں کررہا ہے۔ میں تو جلدی کررہا تھاکہ وہ مجھے بورڈنگ کارڈ دے تو میں اپنے دیگر ساتھیوں سے جا ملوں اور ساتھ ساتھ میرے پیچھے کھڑے ہوئے بقیہ دوستوں کے سامان دینے کی باری آئے جو بے چینی سے میرا آگے بڑھنے کا انتظار کر رہے تھے۔ لیکن کاؤنٹر پر بیٹھا ہوا گورا بڑے آرام سے مجھ سے سوال پر سوال کئے جارہا تھا۔ اور اب میں سمجھ گیاکہ یہ میرے بارے میں کیا سوچ رہا ہے۔ چاہے میں دوسرے ساتھیوں کی طرح اس وقت اقوام متحدہ جیسے ایک بین الاقوامی ادارے سے تعلق رکھتا تھا لیکن انگلینڈ یا امریکہ کی پولیس کے لئے ایک پاکستانی چاہے کسی گر جا گھر کا پادری کیوں نہ ہو وہ مجرم اور قابل نفرت ہی سمجھا جاتا ہے۔ اور یہ ساری مہربانی میرے ساتھ اس لئے ہورہی ہے کہ میں ایک پاکستانی ہوں۔ میں اپنی اوقات سمجھ کر سیدھا کھڑا ہوگیا۔

آپ بذات خود چاہے بڑے چور' لفنگے اور موالی ہی کیوں نہ ہوں لیکن اگر آپ کے ملک کا نام اونچا ہے تو آپ دنیا کے لوگوں کی نظروں میں قابل احترام ہیں۔ آپ کی ہر بات اور ہر ادا قابل تعریف ہے۔ اور آپ کے ملک کا نام بدنام ہے تو آپ کتنے ہی اچھے کیوں نہ ہوں چاہے آپ اپنے ملک کے ایک قابل انجینئر، ڈاکٹر یا پروفیسر ہی کیوں نہ ہوں لیکن یورپ، امریکہ اور یہاں تک کہ ہمارے عرب حضرات بھی آپ کو چور اور ٹھگ سمجھیں گے۔ یہ ہماری بڑی بدقسمتی ہے اس لئے کہ ہمارا تعلق پاکستان جیسے غریب ملک سے ہے۔ یہی سبب ہے جو میرے آگے قطار میں کھڑے ہوئے سعودی عرب، پرتگال، جاپان یہاں تک کہ ملائیشیا اور تھائی لینڈ کے کسی مسافر کو رکنے کے لئے نہیں کہا گیا۔

"پیک کرنے کے بعد یہ سامان کسی اور کے حوالے تو نہیں کیا تھا؟" کاؤنٹر پر بیٹھے ہوئے آفیسر نے پھر سوال کیا اور میں خیالوں کی دنیا سے جاگ پڑا۔

"نہیں بالکل نہیں" میرے دل میں اس سوال پوچھنے والے کے لئے اب نفرت پیدا ہونے لگی۔

"اس میں کوئی ریڈیو یا الیکٹرانک کی کوئی چیز تو نہیں ہے؟" اس نے پوچھا۔

"میں خواہ مخواہ اس بھلے انسان کے سوالوں کا غلط مطلب نکال رہا ہوں۔" میں نے دل میں سوچا۔ "یہ شریف انسان تو میرا خیال کررہا ہے تاکہ میرا بیگ صحیح جگہ پر رکھوا سکے کیونکہ جہاز کا سامان رکھنے والے پورٹرز کبھی کبھی سامان لاپروائی سے رکھ دیتے ہیں۔ جس کے باعث بیگوں اور اندر رکھے ہوئے سامان کی توڑ پھوڑ ہوتی رہتی ہے۔"

"جی ہاں ریڈیو ہے" میں نے اسے بتایا اور پھر ایک دم سے کہا "لیکن کوئی ایسا خاص یا نیا نہیں ہے۔"

"کیا ہم لوگ سامان کھول کر دیکھ سکتے ہیں؟" اس نے اجازت چاہی۔ یہ سوال صرف تکلف کی حد تک سوال یا اجازت نامہ ہوتا ہے۔ جس کے جواب میں آپ کو ہاں ہی کرنی پڑتی ہے کیونکہ بھینس اسی کی ہی ہوتی ہے جس کے پاس لاٹھی ہو۔ انکار کی صورت میں کیا وہ کھولنے سے باز آجائیں گے۔ بلکہ الٹا شک میں مبتلا ہو جائیں گے۔

اب قطار میں کھڑے کھڑے میری اور میرے بقیہ ساتھیوں کی حالت خراب ہورہی تھی لیکن سرکار! آپ کر بھی کیا سکتے ہیں۔ دوسرے کے ملک میں آپ کونسا انصاف جہانگیر کا طبل بجا سکتے ہیں۔ وہ میرے بیگ میں سے ایک ایک چیز نکال کر غور سے چیک کرنے لگا۔ ایک دن پہلے کھانے کے لئے پکڈلی سے کیک خریدا تھا جس کے بچے ہوئے دو ٹکڑے پلاسٹک کی چھوٹی سی تھیلی میں رہ گئے تھے وہ اسے بھی نکال کر دیکھنے لگا۔ ایسے لگا جیسے اس شخص کو جس چیز کی تلاش تھی وہ مل گئی ہو۔ مانتا ہوں کہ یورپ کے امیر ملکوں میں بچی ہوئی کھانے کی چیزوں کو کوڑادان میں پھینکا جاتا ہے لیکن میں ایک غریب ملک کا غریب شہری ہوں۔ سوئیڈن کے اسٹاک ہوم ائیر پورٹ پر جہاں پہنچنے میں تین چار گھنٹے لگتے ہیں اور وہاں سے دوسری پرواز لے کر جنوب کے شہر مالمو جہاں میری رہائش تھی پہنچنے میں مزید دو گھنٹے لگیں گے میں کھانا تو افورڈ نہیں کرسکتا۔ ٹوکیو اور پیرس سے بھی مہنگے اسٹاک ہوم ائیرپورٹ پر میں زیادہ سے زیادہ چائے کی پیالی خرید سکتا ہوں اور اس کے ساتھ یہ کل کا بچا ہوا کیک جو یورپ اور انگلینڈ کے معیار سے چاہے زائد المیعاد اور مضر صحت ہی کیوں نہ ہو لیکن فی الحال میرا پیٹ تو بھر سکتا ہے۔ اب بہتر ہے کہ یہ ساری چیزیں یہ گورا خود ہی سمجھ جائے مجھ سے پوچھ کر میرے دوستوں کے سامنے مجھے شرمندہ نہ کرے۔ میرے دل کی باتیں شاید اس نے سن لی تھیں اور کیک کو چھوڑ کر دوسری چیزیں ٹٹولنے لگا۔ ان میں ریڈیو بھی تھا جس کو کسی آلے سے چیک کرکے واپس رکھا۔ وہ جان گیا ہوگا کہ اس کے ساتھ کوئی ایسا ویسا بم نہیں ہے جو دس بارہ دن پہلے اس ائیرپورٹ پر ایک عرب مسافر کے چھوڑے ہوئے تھیلے میں پھٹا تھا۔ اس نے ایک مہربانی ضرور کی کہ میرے سامان کی چیکنگ کرنے کے بعد ہر چیز کو بیگ میں اسی طرح پیک کیا جس طرح بیگ میں پہلے سے رکھی تھیں۔ بیگ بند کرکے' پاسپورٹ اور بورڈنگ کارڈ میرے ہاتھ میں دیتے ہوئے تھینک یو کہا۔ اس نے مجھے اتنی دیر پریشان کیا لیکن میں اس کے چہرے پر اس بات کی پشیمانی ذرا برابر بھی نہ محسوس کرسکا!

بہر حال اس چیکنگ کے مراحل سے فارغ ہوا تو سامنے کھڑے ہوئے میرے ساتھی جو میرا انتظار کررہے تھے خفگی کا اظہار کرتے ہوئے مجھ سے کہنے لگے۔

"تم نے کیوں بتایا کہ تمہارے پاس ریڈیو ہے۔"

"بھئی اسکے پوچھنے پر میں نے بتایا۔ کیا میں جھوٹ بولتا کہ میرے پاس ریڈیو نہیں ہے؟" میں نے انہیں سمجھایا۔

"تو اور کیا۔ کہہ دیتے کہ میرے پاس اس قسم کی کوئی چیز نہیں ہے۔ آپ کی وجہ سے کتنی دیر ہوئی۔ ہم سے پوچھتا تو ہم صاف صاف کہہ دیتے کہ نہیں ہے۔" انہوں نے کہا اور میں نے دل ہی دل میں سوچا کہ میرا پاسپورٹ سعودی عرب' کوسٹاریکا' پرتگال یہاں تک کہ تنزانیہ یا تھائی لینڈ کا نہیں ہے جس کے زور پر میں رعب جھاڑتا۔ ہمارا ملک تو تھرڈ ورلڈ کا نہیں بلکہ فورتھ ورلڈ کا ہے۔ "بیگ کھولنے پر جھوٹ ظاہر ہو جاتا تو ویسے نہیں تو اس بہانے مجھے یہاں بٹھا دیتے۔ وہ بھی لاک اپ میں۔" میں نے ہنستے ہوئے ان درویشوں کو سمجھانے کی کوشش کی۔

"تو کیا ہوا اپنے سفارتخانے کو فون کردیتے اور وہ ایک دم مدد کے لئے آجاتے۔ غیر ملکوں میں سفارتخانے آخرکس لئے ہیں؟"

اپنے ساتھیوں کو اس سوال کا جواب دینے کے بجائے میں ہنستا رہا لیکن دل میں اپنے آپ سے کہا کہ ان یاروں کو کیا پتہ ہمارا اور ہمارے سفارتخانوں کے احوال کا۔ اللہ خیر کرے کسی پاکستانی کو پردیس کے ملکوں میں کبھی کوئی پر ابلم نہ ہو۔ جب پاسپورٹ کے ساتھ یہ حال ہے تو بغیر پاسپورٹ کے کیا حشر نہیں ہوسکتا۔ ذرا تصور کیجئے غیر ملک میں پاسپورٹ کھو جانے پر کیا نیا پاسپورٹ حاصل کرنا آسان بات ہے؟ عوام یہی کہتے رہتے ہیں کہ ایسی صورت میں پاکستانی سفارتخانے ہماری مدد نہیں کرتے اور سفارتخانوں کا عملہ یہ ہی کہتا ہے کہ کام زیادہ ہے' عملہ کم ہے اور گم ہو جانے والے پاسپورٹ کے لئے تو بہت دن لگ جاتے ہیں کیونکہ اس کے لئے کافی معلومات کرنی پڑتی ہے کہ درخواست گزار واقعی پاکستانی ہے یا نہیں کیونکہ قانونی یا غیر قانونی طور پر لندن پہنچنے والے کئی افغان' بنگالی' برمی وغیرہ پکڑے جانے پر خود کو پاکستانی کہلواتے ہیں تاکہ اپنے ملک جانے کی بجائے ان کو پاکستان بھیجا جائے جہاں کی حالت پھر بھی ان کے ملک سے بہتر ہے۔

ہمارے سفارتخانوں کا حال

سوئیڈن میں رہنے والے پاکستانیوں سے اس قسم کی کئی شکایات سننے میں آتی ہیں کہ پاسپورٹ کی تجدید کرانے کے لئے ان کو اپنا پاسپورٹ اسٹاک ہوم میں موجود ہمارے سفارتخانے میں بذریعہ ڈاک بھیجنے سے ادھر ادھر ہو جاتا ہے۔ یہ لوگ اس میں یہاں کے ڈاک کے نظام پر تنقید کی بجائے ہمارے سفارتخانے کے نچلے عملے پر الزام عائد کرتے ہیں جو جان بوجھ کر پاسپورٹ گم کردیتے ہیں اور پھر بنگالیوں اور برمیوں وغیرہ کو بیچا جاتا ہے۔

"اس سے ان کو کیا فائدہ ہوتا ہے؟" میں نے سوئیڈن میں رہنے والے ایک پاکستانی سے پوچھا۔

"تاکہ ان کو اگر سوئیڈن میں رہنے کی اجازت نہ ملے تو پاکستان آجائیں جہاں کے حالات پھر بھی ان کے ملکوں سے اچھے ہیں۔" اس نے بتایا "ہمارے ملک کا پاسپورٹ جرائم پیشہ یا جاسوسی کرنے والے لوگ بھی حاصل کرتے ہیں۔" ایک اور پاکستانی نے بتایا" تاکہ اگر وہ پکڑے جائیں تو ان کے اصل ملک کے بجائے ہمارا ملک بدنام ہو جائے۔"

سوئیڈن کے دارالحکومت اسٹاک ہوم جاکر پاسپورٹ بنوانا یہاں مالمو میں رہنے والے پاکستانیوں کے لئے آسان کام نہیں ہے۔ سوئیڈن پاکستان کی طرح بڑا ہے اور شمال سے جنوب تک پھیلا ہوا ہے اور اسٹاک ہوم اسلام آباد کی طرح جنوبی سوئیڈن سے بہت دور ہے۔ سوئیڈن کی زیادہ آبادی جنوب میں ہے کیونکہ شمال سے پھر بھی جنوب کی آب ہوا بہتر ہے۔ ہم لوگ بھی جنوبی شہر مالمو میں رہتے ہیں جو اسٹاک ہوم سے اتنا دور ہے جتنا اسلام آباد سے کراچی۔ ویسے مالمو سے ڈنمارک کا جزیرہ نما ملک اتنا قریب ہے جتنا کیماڑی سے منوڑہ۔ لیکن افسوس سوئیڈن میں رہتے ہوئے پاسپورٹ وغیرہ کیلئے ڈنمارک کے دارالحکومت کوپن ہیگن نہیں جاسکتے۔ آلو' ٹماٹر یا گوشت خریدنے کے لئے تو مالمو کے لوگ ہر وقت کوپن ہیگن جاتے رہتے ہیں جہاں جانے کے لئے ہر آدھے گھنٹے کے وقفے پر کوئی نہ کوئی موٹر بوٹ' فیری یا ہوور کرافٹ ملتا رہتا ہے لیکن پاسپورٹ کے لئے اسٹاک ہوم ہی جانا پڑتا ہے اور

اسٹاک ہوم جانے کے لئے ہوائی، سمندری، چاہے ریل کا سفرہو اتنا سستا نہیں ہے جتنا ہمارے ملک میں ہے اور کسی طرح اسٹاک ہوم پہنچنے کیلئے کوئی پاکستانی خرچہ کر بھی لے تو اس کے لئے رہائش کا مسئلہ ہے۔ یہاں کے کسی معمولی سے معمولی درجے کے ہوٹل کا یومیہ کرایہ کسی صورت بھی تین چار ہزار روپے سے کم نہیں ہے اور کھانے پینے کا مسئلہ الگ ہے۔ بقول ایک دل جلے پاکستانی کے "ہمارے ملک کے دفتر اور افسر ہر جگہ ایک جیسے ہوتے ہیں چاہے پاکستان میں ہو یا چین اور جاپان میں۔ صرف ان تک پہنچنے اور ان سے فارم حاصل کرنے میں ہی ہمارے دو تین دن ضائع ہوجاتے ہیں۔ ہم غریب لوگوں کے پاس کہاں سے اتنا پیسہ آئے گا اور کون ہمیں اتنے دن کی چھٹی دے گا۔"

اور اس میں کوئی مبالغہ نہیں ہے کہ بہت ساری چیزوں میں سوئیڈن اور ناروے جیسے ملک جاپان سے بھی زیادہ مہنگے ہیں۔ ایک مہنگائی'دوسرا سخت سردی اور اندھیرے کی وجہ سے ایک غریب پاکستانی مزدور اپنا شہر چھوڑکر اسٹاک ہوم کیسے جاسکتا ہے جو زیادہ شمال میں ہونے کی وجہ سے انتہائی ٹھنڈا رہتا ہے۔ ہم گرم ممالک کے رہنے والوں کا یہاں کی سردی میں یہ حال ہے کہ اپنے ہی شہر میں گھر سے دفتر جاتے ہوئے حالت خراب ہوجاتی ہے۔

میرے پاسپورٹ کی مدت بھی جب ختم ہونے کے قریب پہنچی تو میں نے اس کی تجدید کرانے کا سوچا لیکن مجھے کوئی ایسی فکر نہ تھی کیونکہ پاسپورٹ کی تجدید کرانے والے متعلقہ دفتر سے میری فون پر دو چار مرتبہ علیک سلیک ہوچکی تھی اور ان کو معلوم تھا کہ ان کے سفیر میرے ایک قریبی عزیز (جو خود بھی سفیر ہیں) کے اچھے دوست ہیں۔

لیکن جب میں نے تجدید پاسپورٹ کے فارم کے لئے خط لکھا تو مجھے احساس ہوا کہ شاید میری بقیہ زندگی انتظار میں ہی گزرجائے گی۔ مجبوراً دو تین مرتبہ فون بھی کیا۔ سوئیڈن میں رہنے والوں کو معلوم ہے کہ یہاں پر لوکل فون کرنا بھی بہت مہنگا ہے جس کے لئے کئی بار سوچنا پڑتا ہے۔ اسٹاک ہوم دو تین فون کرنے میں جتنے پیسے خرچ ہوتے ہیں اتنے پیسوں میں تو بندہ پاکستان میں ٹرین کے ذریعے کراچی سے اسلام آباد پہنچ سکتا ہے۔ بہر حال جب بھی فون کیا تو 'ہاں جناب ابھی بھیجتے ہیں' ابھی آپکا خط پہنچا ہے'اس قسم کے جوابات سے نوازا گیا۔ بقول شاعر "وہ آیا نہ اس کا کوئی پیغام آیا" والا حساب رہا۔ اور پھر دن پر دن گزرنے پر مجھ پر ایک انجانا سا خوف طاری ہونے لگا کہ اتنی جان پہچان کے باوجود صرف ہاں ہاں ہو رہی ہے اور ایک فارم تک نہیں بھیجا جارہا ہے۔ کل پاسپورٹ رکھ کر بیٹھ جائیں گے یا کہیں گے کہ ان کو ملا ہی نہیں ہے یا مجھے نہ ملنے پر وہ کہیں گے کہ انہوں نے توپوسٹ کردیا تھا،تو اس یخ بستہ دنیا میں میرا کیا حشر ہوگا۔ میرے تو ہاتھ پاؤں کٹ جائیں گے۔ بغیر پاسپورٹ کے کتنے دن گذارہ کیا جاسکتا ہے۔ یہاں کے ممالک میں تو ہمارے لوگوں کی جیب میں ہر وقت پاسپورٹ موجود ہونا چاہیے۔ موجود ہونے کی صورت میں بھی ہم پاکستانیوں کو شک کی نگاہ سے دیکھا جاسکتا ہے کہ مذکورہ پاسپورٹ واقعی ملک کے بااختیار حکام نے جاری کیا ہے یانقلی بنوالیا ہے۔ جہاں پر صابن' عطر اور گھڑیوں سے لے کر ویزوں' یونیورسٹی ڈگریاں اور ڈالرکے نوٹ تک جعلی بنتے رہتے ہیں۔

میں نے دو دن مزید انتظار کرنے کے بعد اپنی یونیورسٹی (ورلڈ میری ٹائم یونیورسٹی مالمو) کی سوئیڈش انتظامیہ کو سارا حال سنایا کہ ڈاک کا خرچہ اور پاسپورٹ کی تجدیدی فیس وغیرہ سب کچھ مجھ سے لے لیں لیکن میرے پاسپورٹ کی تجدید کروادیں۔ ایڈمن آفیسر نے مجھے بہت سمجھایا کہ اس میں کوئی ایسی مشکل نہیں ہونی چاہیے۔ سوئیڈن میں ایسے کام تو گھنٹوں میں ہوجاتے ہیں ہمارا ڈاک کا محکمہ بہت ایماندار اور چست

ہے اور ڈاک والوں کے لئے ایسے کام انجام دینے میں کوئی دقت نہیں ہوتی۔ وغیرہ وغیرہ۔ اور میں دل ہی دل میں سوچتا رہا کہ آپ کا محکمہءڈاک ایماندار ضرور ہوگا بقول سندھی کہاوت کے "دیکھا پیر پوری ہوئی امید" والا حساب ہے۔ برائے مہربانی یہ کام آپ ہی کروادیں۔ کیونکہ اگر آپ یہ کام کرائیں گے تو سوئی کے سوراخ سے اونٹ بھی آسانی سے گزر جائے گا ورنہ بقول ایک دکھیارے پاکستانی کے کہ ہمارے ملک کے ادارے ایسے سلجھے ہوئے ملکوں میں تو کیا ہر جگہ ضرورت مندوں کا تیل نکال لیتے ہیں۔

دنیا کا شاید ہی کوئی ایسا ملک ہو جہاں پاکستانی نہ رہتے ہوں اور ان کی دکھ بھری داستانیں پاکستان اور پاکستان سے باہر کے اخبارات اور رسائل میں نہ چھپتی ہوں۔ جنگ، ڈان اور اخبار جہاں باقاعدگی سے سوئیڈن کے اس شہر مالمو کی پبلک لائبریری میں آتے ہیں اور میں بھی پڑھتا ہوں۔ اخبار جہاں میں اس ہفتے ناروے میں رہنے والے ایک پاکستانی مزدور کا خط چھپا ہے جس نے ان ممالک یعنی ناروے، ڈنمارک، سوئیڈن، فن لینڈ وغیرہ میں موجود پاکستانی سفارتخانوں سے متعلق شکایات لکھی ہیں۔ یونیورسٹی کے سلسلے میں میرا ان ملکوں میں آنا جانا لگا رہتا ہے۔ کچھ ہفتے قبل سفر کے دوران ایک فیری میں، یہاں کی دو خواتین فن لینڈ کی مسز نور اہلی برگ اور ناروے کی معروف ماہر تعلیم مسز تورون سے ملاقات ہوئی جو آج کل پی ایچ ڈی کررہی ہیں۔ ان کو اپنے تحقیقاتی مقالے میں یہاں کے (Scandinavian) ملکوں میں رہنے والے پاکستانیوں کے مسائل کا جائزہ لینا تھا۔

دنیا کے مختلف ممالک میں تقریباً نصف کروڑ پاکستانی رہتے ہیں لیکن اس کے باوجود ان کو پاکستان کی سمندر پار پاکستانیوں سے متعلق وزارت سے کچھ حاصل نہیں ہوسکا ہے۔ دوسرے ممالک کی ان جیسی خواتین کو کریڈٹ دینا چاہئے جنھوں نے پاکستانیوں کے مسائل پر قلم اٹھایا ہے۔ پاکستانی سفارتخانوں سے یہ پردیس میں رہنے والے پاکستانی نہ کوئی امید رکھتے ہیں اور نہ سفارتخانوں کے اہلکاروں‌میں اتنی اہلیت ہوتی ہے جو ان کے الجھے ہوئے مسائل سلجھا سکیں۔ تقریباً سارے ملکوں میں موجود پاکستانی سفارتخانوں کی مجموعی صورتحال کا جائزہ لیا جائے تو یہی تاثر ملتا ہے کہ ہر سفارتخانے میں سفیر صاحب اپنے وقت کا زیادہ حصہ اپنے ماتحت عملے کی زندگی تباہ کرنے' ان کو ناکارہ ثابت کرنے' ان سے ذاتی کام لینے' سفارتی طور پر ملی ہوئی سہولیات سے اپنی جیب بھرنے' سفارتخانے کے فنڈوں کو اپنے ذاتی کاموں میں استعمال کرنے اور مقامی لوگوں کو تنگ کرنے میں ضائع کرتا ہے۔ اسی طرح سفیر صاحب کا ماتحت عملہ اپنے کالے صاحب کی خوشامد میں غیر سرکاری کاموں میں زیادہ اور ملکی خدمات میں کم وقت دیتے ہیں۔ پاکستان کے سفارتخانوں میں کئی کام کرنے والے قابل اعتراض کاموں میں پھنسے رہتے ہیں۔ اس ملک میں آنے والے پاکستانیوں کے ساتھ رعیت والا سلوک کرتے ہیں اور وہ پاکستانی برادری جو اس ملک کی شہریت اختیار کرچکی ہے' ان سے خود کو بہتر اور اعلیٰ ثابت کرنے کی کوششوں میں لگے رہتے ہیں۔

کچھ نسل پرستی اور تعصب پر....

یورپی ممالک میں مقیم پاکستانیوں نے بتایا کہ ناروے میں اس وقت نسل پرستی اور تعصب کی بڑی لہر آئی ہوئی ہے۔ کالوں (افریقی) اور کلرڈ (ایشیائی) پر نارویجن نوجوانوں کے حملے معمول بن گئے ہیں۔ ناروے میں آنے

والا شاید کوئی خوش نصیب پاکستانی ایسا ہو جو یہاں کے کسٹم اور امیگریشن کے ذلت آمیز سلوک کا نشانہ نہ بنا ہو۔ اگر کسی پرواز میں کوئی ایک بھی پاکستانی آتا ہے تو کسٹم کا سارا عملہ مل کر اس کے کپڑے اترو الیتا ہے اور ادھر گورے اسمگلر اطمینان سے ہیروئن لے کے بازار میں پاکستانی ہیروئن کے نام سے بیچتے پھرتے ہیں۔ ایسا بھی نہیں ہے کہ پاکستانی کوئی جرم نہیں کرتے۔ چوری اور نشے کے جرم میں ناروے کے ڈھائی ہزار قیدیوں میں سے تقریباً چالیس پاکستانی بھی ہیں لیکن بھارت اور اسرائیل کا یہی پروپیگنڈہ ہے کہ ناروے میں جو ہیروئن اسمگل ہوتی ہے اس میں پاکستانیوں کا ہاتھ ہے اور ہیروئین کا سارا دھندا پاکستانی کرتے ہیں۔

ناروے میں پاکستانیوں کی ایک فلاحی انجمن بھی ہے۔ انجمن کے ارکان سعودی عرب،لیبیا، انڈونیشیا' مصر اور ترکی کے سفیروں کی مدد سے شہر کے مرکز میں ایک بڑا پلاٹ مفت حاصل کرنے میں کامیاب ہوگئے جہاں وہ اسلامی سینٹر اور اعلیٰ قسم کی مسجد بنانا چاہتے تھے۔ لیکن انجمن میں اقتدار کی رسہ کشی کی وجہ سے یہ پلاٹ تنازعے کا شکار ہوگیا اور مسجد کی تعمیر کے لئے مزید چندہ جمع کرنے کا مسئلہ حل نہ ہو سکا۔ اس طرح کئی برس تک آپس میں جھگڑے چلتے رہے۔ بالآخر شہر کے لارڈ میئر نے مسجد کیلئے مختص پلاٹ کو ختم کرکے کروڑوں ڈالر کی مالیت کا یہ پلاٹ ایک ہوٹل کے حوالے کردیا۔یہ ہوٹل اس وقت اس علاقے (Scandinavia)کا سب سے بڑا ہوٹل ہے۔ یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ پاکستانی سفیر نے تو اس پلاٹ کے حصول میں کوئی مدد کی اور نہ پلاٹ منسوخ ہونے پر کچھ کیا۔ بلکہ اس سلسلے میں ساری مدد سعودی عرب کے سفیر نے کی۔ اس طرح بیرون ملک ہمارے سفارت کاروں کی بے حسی او ر ان کی کارکردگی یہاں تو کیا پاکستان میں بھی کسی سے ڈھکی چھپی نہیں ہے۔ دوسرے ملکوں میں پاکستانیوں کی مشکلات میں دن بدن اضافہ کی بڑی وجہ یہی ہے۔ لیکن یہاں تو ہم پاکستانیوں کے آپس کے جھگڑوں نے سعودی عرب کے سفارتکاروں کو بھی بے بس کردیا۔

اس طرح لیڈر بننے کی جنگ اور داخلی فسادات نے اس انجمن کو کئی حصوں میں تقسیم کردیا۔ یہ حصے فرقے، برادری، زبان، ذات اور عقیدوں کی بنیادوں پر کئے گئے۔ اس طرح 'سب پاکستانی مسلم ایک ہیں' والے فلسفے کو ناکام بنادیا گیا اور ناروے کے متعلقہ حکام سے اچھی طرح بات چیت نہیں ہو پانے کی وجہ سے کئی بنیادی مسائل جوں کے توں ہیں۔

فن لینڈ کے دارالحکومت ہیلسنکی میں کچھ عرصہ رہنے کے بعد سوئیڈن کے جنوبی شہر اور بندرگاہ مالمو لوٹے۔ ہیلسنکی سے بذریعہ ہوائی جہاز مالمو آنے کی بجائے ہم ڈنمارک کے دارالحکومت کوپن ہیگن میں اترے جو تین گھنٹے کا سفر ہے۔ کوپن ہیگن سے مالمو ایسے ہے جیسے دادو مورو' یا حیدر آباد کوٹری۔ درمیان میں بالٹک سمندر کا کچھ حصہ ہے جس کو پار کرنے کے لئے کوپن ہیگن کی بندرگاہ سے کوئی سواری مل جاتی ہے اور اس سواری (موٹر بوٹ' فیری' ہوور کرافٹ وغیرہ) کو لینے کے لئے ہمیں کوپن ہیگن کے ایئر پورٹ سے سی پورٹ (بندرگاہ) پہنچنا تھا۔ ہوائی جہاز سے اتر کر کسٹم اور امیگریشن کی پل صراط سے گزر کر ہوائی اڈے سے باہر نکلے جہاں بسوں اور ٹیکسیوں کی قطاریں ایسے لگی ہوئی تھیں جیسے جامشورو کے ریلوے اسٹیشن کے باہر کراچی جانے کے لئے ہوتی ہیں۔ ہمارے گروپ میں کوئی سات آٹھ ایشیائی اور افریقی افسر (میرین انجینئر' نیول آرکیٹکٹ' بندرگاہ کے ڈائریکٹر' منیجر' سرویئر وغیرہ) تھے۔

کوپن ہیگن کے بین الاقوامی ہوائی اڈے سے ایک بس نے بندرگاہ کے پاس اتارا۔ شام کا وقت اور رش ہونے کی وجہ سے بس نے بندرگاہ کے دروازے کے پاس اتارنے کے بجائے کافی دور اتارا۔ ہم اپنا سامان اٹھا کر جلدی جلدی فیری اسٹیشن کے گیٹ کی طرف بھاگے۔ ہمیں کسی بھی صورت میں یہ فیری لینا تھی کیونکہ کوپن ہیگن سے مالمو جانے والی یہ آخری فیری تھی اور ہم ہرگز نہیں چاہتے تھے کہ یہ فیری چھوٹ جائے اور رات ہوٹل میں ٹھرنے کا خرچہ ہم اپنی جیب سے بھریں' جو بقول تھائی لینڈ کے نیول افسر کمانڈر سوتی چائی کے کم از کم اتنا ہے جتنا بنکاک میں ایک پتلون کوٹ کی قیمت۔ ہر ایک کی یہ خواہش تھی کہ نہ صرف فیری کا ٹکٹ مل جائے بلکہ بیٹھنے کی جگہ بھی مل جائے۔ ہم سب لوگ بہت تھکے ہوئے تھے اور فیری میں ڈیڑھ گھنٹے کھڑے ہوکر سفر کرنے کے موڈ میں نہ تھے۔

بس میں سوتی چائی اور میرا سامان سب سے نیچے ہونے کی وجہ سے ہمیں آخر میں ملا۔ اس وقت بس کے باقی مسافر تیز تیز قدموں سے فیری اسٹیشن کے دروازے کی طرف چل پڑے۔ بس اسٹاپ اور فیری اسٹیشن کے درمیان ڈیوٹی فری دکانوں سے ایک دکان پر سوتی چائی سگریٹ لینے چلا گیا جس سے مزید دیر ہوگئی اس فیری پر سوار ہونے کے لئے ایئر پورٹ سے آنے والے مسافروں کے علاوہ شہر کے بھی کئی لوگ تھے اور بہت سارے لوگ ہمارے پیچھے آتے ہوئے نظر آرہے تھے۔ لگ رہا تھا کہ فیری کی گنجائش 300 سے زیادہ ہے۔ کئی ایسے تھے جو مالمو رات گزارنے کے لئے جارہے تھے اور کچھ ایسے تھے جو مالمو کے رہنے والے تھے اور اب رات ہونے پر واپس جارہے تھے۔ سوائے ہمارے' باقی سب اڑوس پڑوس (Scandinavian) اور یورپی ملکوں کے گورے تھے۔ اس لئے دور دور تک ہم اپنے کالے اور گندمی رنگ کے ایشیائی ساتھیوں کو دیکھ رہ تھے۔

سگریٹ لے کر فیری اسٹیشن کے دروازے کے قریب پہنچے تو اعلان ہوا کہ "مالمو جانے والی فیری کے چلنے میں چند منٹ رہ گئے ہیں۔ مسافروں کی تعداد بڑھ رہی ہے اس لئے ہم فیری اسٹیشن کا دروازہ بند کرنے والے ہیں۔ رہ جانے والے مسافر کل صبح کی فیری سے بالٹک عبور کرسکتے ہیں۔"

سوتی چائی سے میں نے شکایت کرتے ہوئے کہا تمہارے سگریٹوں کے پچاس کرونا (تقریباً 200 روپے) کی بچت کی خاطر آج کی رات کوپن ہیگن میں گزارنا پڑے گی۔ یہاں تو سستے سے سستا ہوٹل بھی پانچ سو کرونا (دو ہزار روپیہ) سے کم نہیں ہے۔ یہ کراچی بنکاک یا سنگاپور نہیں ہے کہ ساری رات کسی ریلوے اسٹیشن' پارک یا کسی دکان کی دہلیز پر بیٹھ کر گزاریں۔ یہاں کی سخت سردی میں بس سے اتر کر صرف آدھا فرلانگ کا فیری اسٹیشن تک کا راستہ طے کرنے میں ہاتھ پاؤں یخ ہوگئے تھے۔

کوپن ہیگن سے مالمو جانے والی یہ تمام فیریوں میں تقریباً 300 نشستیں ہوتی ہیں جبکہ سو مسافر کھڑے ہو کر سفر کرتے ہیں۔ بپھرے ہوئے سمندر (Rough Sea) اور سمندر کے سخت قوانین کی وجہ سے گنجائش سے زیادہ مسافر بٹھانا خطرے سے خالی نہیں ہوتا۔ اس لئے جہاز کا عملہ پہلے آئیے پہلے پائیے کی بنیاد پر مسافر بٹھاتے ہیں۔ صبح آٹھ بجے سے شام آٹھ بجے تک یہ فیریاں ہر گھنٹے بعد چلتی ہیں۔ آخر میں بچ جانے والے مسافروں کو دوسرے دن جانا ہوتا ہے۔

بہر حال ہم سامان اٹھائے ہوئے فیری اسٹیشن پر پہنچنے اور جیسے ہی دروازہ کے اندر گھسے تو ایک یا دو منٹ بعد فیری اسٹیشن کا دروازہ بند ہوگیا۔ سوتی چائی نے ایک لمبی سانس لے کر کہا۔

"آج کی رات ہوٹل میں گزارنے کے خرچ سے تو بچ گئے بس یہ ہے کہ بیٹھنے کی جگہ نہیں ملے گی۔"

"جناب سوتی چائی فکر کرنے کی کوئی بات نہیں۔ بیٹھنے کے لئے سیٹ ملنے کا بہت بڑا آسرا ہے۔" میں نے کہا۔

"وہ کیسے؟ مسافروں کی لمبی قطار میں سب سے آخر میں ہم لوگ ہیں۔" سوتی چائی نے حیرت سے پوچھا۔

"وہ اس طرح۔ ذرا سامنے دیکھو جہاز پر چڑھنے والے مسافروں کی لمبی قطار کے آخری سرے پر جہاز کی سیڑھیاں چڑھنے والے مسافروں کی طرف۔" میں نے اشارہ کرکے اسے بتایا۔ "وہ دیکھ رہے ہو اپنا فلپینو ساتھی لیفٹیننٹ کمانڈر گلبرٹ' تنزانیہ کا چیف میرین انجینئر دو بیلو' ڈاکار (گھانا) کی بندرگاہ کی ڈائریکٹر مس ایمی اور سعودی عرب کے کوسٹ گارڈ کمانڈر خالد الجھلمی۔"

"لیکن ان میں سے کسی کو ہم نے اپنے لئے سیٹ رکھنے کے لئے نہیں کہا ہے۔" سوتی نے کہا۔

"وہ ہمارے لئے سیٹ رکھیں یا نہ رکھیں لیکن آپ کیا سمجھتے ہیں کہ سفید چمڑی والا یورپی دو مسافروں کے بیٹھنے والی ان ڈبل سیٹ والی کرسیوں پر ہمارے ایشیائی یا افریقی ساتھیوں کے ساتھ بیٹھے گا؟ ہرگز نہیں۔ مرجانے کی خواہش کرے گا لیکن ہم لوگوں کے ساتھ بیٹھنا پسند نہیں کرے گا۔ ہمارے ساتھی جو پہلے پہنچ چکے ہیں ان کے ساتھ والی سیٹیں آخر تک خالی رہیں گی۔ میری بات سن (اور سمجھ کر) سوتی چائی بہت زور سے ہنسا۔ اس کو شاید مالمو کی بسیں یاد آگئی جہاں اس قسم کے نظارے روز دیکھنے کو ملتے ہیں۔ بس میں اور تو اور بوڑھی عورت بھی کھڑی ہونا پسند کرے گی لیکن ہم ایشیائی یا افریقی کے قریب والی سیٹ پر بیٹھنا گوارا نہیں کرے گی۔ ہمارے اٹھ جانے کے بعد بھی کافی دیر کھڑا رہنے کے بعد یہاں کے سفید چمڑی والے یورپی بیٹھتے ہیں جیسے انہیں ہمارے اُٹھنے کے بعد بھی اس سیٹ پر جراثیم کی موجودگی کا خیال ہوتا ہے۔

"یار بات تو آپ نے زبردست کی ہے۔ چلو ان کی نفرت کا یہ تو فائدہ ہوا کہ آج ہمیں بیٹھنے کے لئے جگہ مل جائے گی۔ تنزانیہ کا دو بیلو تو نہ صرف رنگ بلکہ شکل صورت سے بھی کالا ریچھ لگتا ہے۔ مس ایمی بھی کالی ہے بلکہ جیٹ بلیک ہے۔ سعودی عرب کا خالد کالا نہیں ہے لیکن پاکستانیوں کی طرح گندمی لگتا ہے۔ ان تین کو تو افریقی اور ایشیائی سمجھ کر ان کے ساتھ کوئی ماں کا لال گورا نہیں بیٹھے گا۔ ہاں باقی فلپائن کا گلبرٹ جو بہت

گورے رنگ کا ہے اسے یہاں کے یورپی لوگ شاید میلے میں کھویا ہوا اپنا بھائی سمجھ کر اس کے ساتھ والی سیٹ پر بیٹھ جائیں۔"

"ہرگز نہیں۔" میں نے پورے وثوق سے سوتی چائی سے کہا۔ "تم مجھ سے اسٹامپ پیپر پر لکھوالو۔ اس کے پاس بھی کوئی یورپی نہیں بیٹھے گا۔"

"یہ تم کیسے کہہ سکتے ہو؟" سوتی چائی نے پوچھا۔

"اس لئے کہ اس کے بال تو کالے ہیں۔" میں نے سوتی چائی کو منطق سمجھاتے ہوئے کہا۔ "یہاں کے لوگ ہمیں بالوں کے رنگ سے پہچانتے ہیں۔ کیونکہ بہت سارے عرب' ترک' چینی' موراکن وغیرہ رنگ کے گورے ہیں لیکن پھر بھی یہاں کے لوگ ان کے کالے بالوں سے انہیں پہچان لیتے ہیں کہ یہ یورپ کے باسی نہیں ہیں۔"

فیری کا ٹکٹ لے کر سیڑھی سے چڑھ کر جہاز کے مرکزی ہال میں پہنچے جو مسافروں سے کھچاکھچ بھرا ہوا تھا۔ ہمیں آگے بڑھنے کی جگہ نہیں مل رہی تھی۔ سوتی چائی نے ایک بار پھر مایوس ہوکر کہا۔ "اب کیا ہوگا۔ بیٹھنا تو دور کی بات ہے کہیں کھڑے ہونے کو جگہ مل جائے تو غنیمت ہے۔"

میں سوتی چائی کا ہاتھ پکڑ کر ہجوم کو چیرتے ہوئے آگے بڑھتا گیا۔ "سوتی چائی تم میرے پیچھے پیچھے آؤ تو ہم اپنے کالے بھائیوں کو ڈھونڈیں۔" ہم ہال پار کرکے فیری کے اس حصے میں پہنچے جہاں مسافروں کے لئے سیٹیں لگی ہوتی ہیں ساری سیٹیں مسافروں سے بھری ہوئی تھیں لیکن ان سیٹوں کے درمیان کہیں کہیں کوئی سیٹ خالی نظر آرہی تھیں جو ہمارے ایشیائی اور افریقی دوستوں کی ساتھ والی سیٹیں تھیں۔ ہم شہد کی مکھی کی طرح سیدھے ان سیٹوں پر جاپہنچے۔ جب آرام سے کرسیوں پر جم کر بیٹھ چکے تو میں نے قریب ہی بیٹھے ہوئے سوتی چائی سے کہا۔

"دیکھا میرے ایشیائی کالے بھائی! ہم چاہے کتنے بھی بن ٹھن کر چلیں' خوشبو دار صابنوں سے نہائیں دھوئیں' کمپلیٹ سوٹ اور ٹائی لگائیں اور چہروں پر لوشن اور عطر ملیں، پڑھ لکھ کر چاہے ڈاکٹر، انجینئر، پائلٹ یا پروفیسر بن جائیں لیکن افسوس کہ یہاں کے لوگوں کی نظروں میں ہم کالے ہی رہیں گے، جن کے لئے یورپیوں کے دماغ میں یہ بات بیٹھی ہوئی ہے کہ ہم ایشیائی بیماری، بھوک اور بیروزگاری کی علامت ہیں۔ اور ان کے حق میں بہتر ہے کہ وہ ہمارے سائے سے بھی دور رہیں۔"

جاپانیوں کی طرف سے نفرت

پچھلے مضامین میں میں یورپ میں بڑھتی ہوئی نسل پرستی (Racism) اور اہل ایشیاءکے لئے نفرت کا ذکر کر چکا ہوں۔ یورپ والوں کی اس نفرت اور غصے سے ایشیاءکا صرف ایک ملک بچا ہوا ہے اور وہ ہے جاپان۔ وہ بھی اس وجہ سے کہ آج کل یعنی پچھلی صدی کی آخری چوتھائی سے جب سے وہ معاشی طاقت بنا ہے اس کی کچھ اہمیت ہوگئی ورنہ دوسری عالمگیر جنگ کے دوران بلکہ اس کے بعد کافی عرصے تک وہ بھی گالیاں کھاتا رہا۔ بہر حال افسوس کی بات یہ ہے کہ ایشیاءکے لوگوں سے نہ صرف یورپی ممالک نفرت اور تعصب کا رویہ اختیار کرتے ہیں بلکہ اپنا ایشیائی ملک جاپان بھی نفرت کرتا ہے۔۔۔۔ خصوصاً برصغیر کے لوگوں سے جن میں ہم پاکستانی’ بھارتی’ بنگلہ دیشی اور سری لنکن آجاتے ہیں۔ یہ دوسری بات ہے کہ جاپانی کاروباری ذہن ہونے کی وجہ سے مجبور ہیں اور ہمارے ملکوں سے تجارت اور آمدنی کے باعث وہ ڈپلومیسی سے کام لے کر ظاہری طور پر دانت نکال کر ہم لوگوں سے مسکرا کر بات کرتے ہیں کیونکہ ہم گاہک کی صورت میں ان کے سامنے آتے ہیں۔ بہر حال جاپان کی ہم لوگوں سے نفرت اور نسل پرستی کا پتہ مجھے بھی اب چلا ہے۔ جس جاپان سے میں واقف ہوں یا جن دنوں میں میرا جاپان آنا جانا لگا رہتاتھا وہ زمانہ شاید کچھ اور تھا۔ شاید اس لئے جب سوئیڈن میںرہنے والے ہم دو تین پاکستانی ساتھیوں نے یورپ کی نسل پرستی پر گفتگو شروع کی تو میں نے کھٹ سے کہہ دیا۔ “یورپ سے تو جاپان اچھا ہے۔ اتنا جدید، امیر اور خوبصورت ملک ہونے کے باوجود وہاں کے لوگ اچھی طرح ملتے ہیں۔ یہاں یورپ میں خاص طور اسکینڈنیوین ملکوں میں کسی سے صرف کسی جگہ کا راستہ پوچھو تو وہ یہ بتاتے ہوئے بھی تکلیف محسوس کرتا ہے۔کوئی چھوٹی موٹی بات کرنے یا دوستی کرنے کے لئے تیار نہیں ہے۔ جاپان میں تو لڑکیاں بھی زبردستی بات کرنے کے بہانے ہم جیسے جہاز رانوں’ سیاحوں اور غیر ملکیوں کو ڈھونڈتی رہتی تھیں۔“

جاپان والوں کے بارے میں میرا یہ پیار بھرا انداز گفتگو ہمارے پاکستانی دوست چیف انجینئر راحت عزیز کو شاید اچھا نہیں لگا۔ پہلے تو وہ مجھے غور سے سنتا رہا پھر طنزیہ مسکراہٹ کے ساتھ مؤدبانہ انداز میں دریافت کیا۔

”سرکار یہ باتیں کس کی جوانی کی ہیں؟“

”کیا مطلب!“ میں نے حیرت سے کہا۔ ”میں اپنی جوانی کی بات کررہا ہوں کسی اور کی نہیں۔“

”معلوم نہیں! ہم تو جب جوان ہوئے یعنی ہمارا تو جب جہازوں کو لے کر جاپان جانا ہوا تو دنیا ہی کچھ بدلی ہوئی تھی۔ لگتا ہے آپ کو جاپان گئے ہوئے کافی عرصہ ہوا ہے۔ میری طرح اب جاکر دیکھیں تو آپ کو پتہ چلے کہ وہاں کے لوگ ہم سے کتنی نفرت کرتے ہیں۔ میں آخری دفعہ 1991ءمیں چیف انجینئر کی حیثیت سے جہاز کو ٹوکیو، ناگویا اور کوبے لے گیا تھا۔ حالت یہ تھی کہ سڑک پر چلتے کسی جاپانی کو معلوم ہوتا کہ ہم پاکستانی ہیں تو وہ دور ہٹ جاتا تھا۔“

”کیوں بھئی؟“ میں نے پوچھا۔

”بس اس میں بھی ہم پاکستانیوں کی غلطیاں ہیں۔ جاپانی قوانین کی ہم لوگوں نے اتنی خلاف ورزی کی ہے کہ اب ان کو سختی کرنا پڑتی ہے۔ جاپان جانے کے لئے پہلے ہمیں ویزا کی ضرورت نہیں پڑتی تھی۔ ٹوکیو ایئر پورٹ پر پہنچتے ہی ویزامل جاتا تھا۔ ہمارے بھائیوں نے اس سہولت کے پیش نظر اسی(80 ئ(کے عشرے میں غلط قسم کی ٹریول ایجنسیوں کی معرفت جاپان آکر واپس جانے کا نام نہ لیا۔ کچھ لوگ تو خود اپنی مرضی سے یہ ایڈونچر کرنے لگے۔ یہ لوگ گھومنے کی غرض سے وزٹ ویزے لیکر وہاں نوکریوں کی تلاش میں لگ گئے۔ ویزا ختم ہونے پر بھی وہ چوری چھپے رُکے رہے۔ اس وقت جاپان کے کارخانے داروں اور ہوٹل مالکان نے اپنے فائدے کے لئے ایسے غیر قانونی طور پر رہنے والوں کو ہراساں کر کے استعمال کیا کیونکہ یہ لوگ ڈر کے مارے کم تنخواہ پر کام کرنے پر راضی ہوجاتے تھے یہاں تک کہ وہ ایسے مشکل کام بھی خوشی سے کرتے جن کو جاپان میں تھری ڈی (3 (D–جاب کہتے ہیں۔ یعنی ڈینجرس (خطرناک) ڈرٹی (خراب) اور ڈمانڈنگ (سخت محنت والے)۔ ان نوکریوں میں جاپانی معیار کے مطابق کوئی خاص تنخواہ نہیں تھی لیکن پاکستانی روپے میں دس بیس ہزار بنتی تھی۔ اتنی زیادہ رقم کا سن کر پاکستان سے اور بھی لوگ غیر قانونی طریقے سے جاپان آنے لگے۔ یہ تنخواہ جاپان میں رہنے والے کے لئے اتنی نہیں بنتی تھی۔ اتنی زیادہ رقم کا سن کر پاکستان سے اور بھی لوگ غیر قانونی طریقے سے جاپان آنے لگے۔ یہ تنخواہ جاپان میں رہنے والے کے لئے اتنی نہیں بنتی جس سے وہ ٹوکیو جیسے شہر میں کسی ہوٹل میں دو وقت کا کھانا بھی کھا سکے۔ اچھی رہائش اور کپڑے لینا تو دور کی بات ہے۔ نتیجتاً ہمارے ملکوں کے غریب مزدور پیشہ ور لوگوں نے اس تنخواہ سے پیسے بچانے’ قرض اتارنے (جو لالچی ایجنٹوں کو دے آئے تھے) اور باقی بچے ہوئے پیسوں سے جاپان جیسے مہنگے ملک میں اپنے آپ کو زندہ رکھنے کے لئے کارخانوں کے تہہ خانوں’گوداموں وغیرہ میں رہ کر زندگی گزارنا شروع کی جہاں چھوٹے سے مضر صحت اور اندھیرے کمروں میں آٹھ آٹھ دس دس لوگ مل کر کرایہ بچاتے۔ ان ہی کمروں میں جہاں رہتے کپڑے دھونے کھانا پکانے کا کام بھی وہیں کرتے۔ جاپان میں پینے یا نہانے کا پانی خاص طور پر گرم پانی ’مہنگا ہونے کی وجہ سے یہ ہمارے ملکوں سے آئے ہوئے لوگ اپنے کپڑے اور جسم کو دھونے اور صاف رکھنے میں کنجوسی سے کام لینے لگے۔ ایک ہی سونے کے کمرے میں سردی سے بچنے کے لئے دروازہ اور کھڑکیاں بند رکھ کر کھانا پکاتے’ وہیں برتن اور کپڑے دھوتے’ سگریٹ پینے اور ایک آدمی کے غسل خانے کو دس آدمی استعمال کرتے جس کی وجہ سے ان کو سوجن اور خارش جیسی جلد کی اور پھیپھڑوں اور آنتوں کی سوجن جیسی بیماریاں ہونے لگی۔ علاج کے لئے وہ ڈاکٹر کے پاس نہیں جاسکتے تھے کیونکہ جاپان میں ڈاکٹری علاج کے لئے ایک تو خرچہ زیادہ ہے

دوسرا یہ کہ مریض کو اپنا شناختی کارڈ یا (غیر ملکی کی حیثیت سے) پاسپورٹ دکھانا ضروری ہے۔ پاسپورٹ پر ویزا کے ختم ہونے کی وجہ سے پکڑے جانے کے ڈر سے یہ لوگ اپنا علاج صحیح طور پر نہیں کروا پاتے تھے۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ان کی بیماریاں پھیلنے لگیں۔ اس دوران جاپان کی حکومت نے جاپان میں غیر قانونی طور رہنے اور نوکریاں کرنے والوں کی پکڑ دھکڑ شروع کردی۔ پکڑے گئے پاکستانیوں سے جاپان میں غیر قانونی طور پر آنے اور نوکری کرنے کی پوچھ گچھ کے ساتھ ساتھ ٹی وی پر دکھانے کے لئے فلم بھی بنائی گئی جسے دیکھ کر جاپان کے لوگ حیران رہ گئے کہ سائنس اور صحت کے اس دور میں جاپان جیسے جدید ملک میں ان کے شہروں میں کچھ پاکستانی ایسی گندگی اور غلاظت میں رہتے ہیں، اور ان کو کئی ایسی بیماریاں ہیں جن کے پھیلنے کا خدشہ ہے اور اب یہ حال ہے کہ سامنے سے کوئی پاکستانی نظر آتا ہے تو جاپانی راستہ بدل لیتے ہیں۔ متعدد افراد ہم پاکستانیوں سے ہاتھ ملاتے ہوئے بھی ڈرتے ہیں کہ کہیں ان کو کوئی بیماری نہ لگ جائے۔"

مجھے قے آتی ہے

میں اپنے ساتھی سے جاپان کے تازہ حالات سن رہا تھا کہ اتنے میں ہمارا تیسرا ساتھی کیپٹن سلیم قاسم آ پہنچا۔ سوئیڈن کے کئی شہروں کی پبلک لائبریریوں میں دنیا بھر کے اخبار آتے ہیں۔ سلیم ہمارے شہر مالمو کی لائبریری سے روزنامہ جنگ پڑھ کر آتا تھا۔ ہمیں جاپان پر باتیں کرتے ہوئے سن کر جنگ میں جاپان پر پڑھی ہوئی تازہ خبر کی رو سے راحت عزیز صاحب کی بتائی ہوئی باتوں پر متعجب ہونے کی بجائے تائید کرنے لگا۔ اس نے بھی یہی بتایا کہ جاپان میں آج کل نسل پرستی کا رجحان دن بدن بڑھتا جارہا ہے۔

دوسرے دن مجھے بھی وہ خبر پڑھنے کا اتفاق ہوا جس میں اخبار کے جاپان میں موجود پاکستانی نمائندے کے حوالے سے یہ خبر تھی کہ یورپ کی طرح جاپان میں پیسے اور ٹیکنالوجی میں غریب ملکوں سے' خاص طور پر ہم لوگوں سے نفرت بالخصوص نسلی نفرت کا تناؤ بڑھتا جارہاہے۔ جس کا اظہار نہ صرف عام جاپانی بلکہ سیاستدان اور پڑھے لکھے لوگ بھی کررہے ہیں۔ اس سلسلے میں جاپان کے ایک سیاستدان اور رکن پارلیمنٹ مسٹر ماساد کا تبصرہ قابل غور ہے۔

ساٹھ سالہ مسٹر ماساد کوکوبو جاپان کی ایک اہم سیاسی شخصیت ہیں۔ آپ ہیگو صوبے کی اسمبلی میں لبرل ڈیموکریٹک پارٹی سے تعلق رکھنے والے رکن ہیں۔ ماساد 1950ءمیں تعلیم کی خاطر لندن گئے تھے جہاں پر انہوں نے بی بی سی کے جاپانی شعبے میں بھی کام کیا تھا۔ اس کے بعد انہوں نے روم (اٹلی) میں جاپان ایئر لائنز کے دفتر میں کام کیا۔ روم سے واپسی پر غیر ملکی زبانیں اور لوگوں کی پہچان ہونے کی بناءپر وہ صوبائی اسمبلی کی ایک سیٹ پر منتخب ہوئے۔ ماساداس کے بعد بھی چھ مرتبہ صوبائی اسمبلی کے رکن منتخب ہوچکے ہیں۔ آپ اسمبلی

میں نہایت اہم کمیٹی یعنی بجٹ کمیٹی کے رکن ہیں۔ انہیں نہ جانے کیا سوجھی کہ دو چار دن پہلے بجٹ کمیٹی کے اجلاس میں کھڑے ہوکر کہنے لگے۔

"میں جب کہیں پاکستانیوں اور بھارتی باشندوں کو دیکھتا ہوں تو مجھے متلی ہونے لگتی ہے۔" اور مزید یہ بھی کہا "مجھے معلوم ہے کہ کچھ ایسی بیوقوف جاپانی عورتیں بھی ہیں جو ان کالوں سے شادیاں رچاتی ہیں۔"

اس تبصرے کے بعد کچھ پاکستانی اور بھارتی لوگوں نے ان سے ملنے کی کوشش کی جس میں وہ بڑے مشکل سے بالآخر کامیاب ہوئے۔ ماساد صاحب نے اپنے اس تبصرے پر کہ جاپانی عورتیں کالوں سے کیوں شادیاں کرتی ہیں پر معافی طلب کی لیکن پہلے والے تبصرے پر وہ ابھی تک قائم ہیں کیونکہ بقول ان کے پاکستان اور بھارت کے لوگ بہت گندے رہتے ہیں۔ اور ہر وقت ٹولیوں میں پھرتے ہیں۔

وہ صاحب بقول اخبار کے ہمارے پاکستانی نمائندہ کے دوران گفتگو پاکستانیوں کے لئے "پاکی" لفظ استعمال کرتے رہے۔ "پاکی" کی اصطلاح کا استعمال ان کا پاکستانیوں کیلئے اس نفرت کا اظہار ہے جو انگلینڈ میں رہنے کے دوران ان کے دماغ میں پیدا ہوئی اور وقت کے ساتھ ساتھ بڑھتی چلی گئی۔

اُلو ----ایک باعزت پرندہ

آج کل یورپی عوام پر یہ جنون سوار ہے کہ جیسے امریکہ کا نشان عقاب ہے' چین کا اژدھا اور نیوزی لینڈ کا کیوی یا متحدہ روس کا نشان ریچھ اس طرح یورپ کا بھی کوئی نشان ہونا چاہیے۔ اس سلسلے میں یہاں (سوئیڈن، جرمنی، فرانس وغیرہ) کے اخبارات میں شائع ہونے والے خطوط میں لوگ اپنی رائے کا اظہار کر رہے ہیں اور اکثریت کی متفقہ رائے یہ ہے کہ یورپ کا نشان الو ہونا چاہیے۔

ڈائناسارس جیسے دیوہیکل پرندے جو اب ناپید ہوچکے ہیں اور دیگر جانوروں اور پرندوں کو جو اس کرئہ ارض پر موجود ہیں چھوڑ کر یورپی قوم کو الو ہی سب سے زیادہ باعزت اور عقلمند لگتا ہے حالانکہ ہمارے ہاں الو وہ منحوس پرندہ ہے جو کسی ملک کی نشانی تو کیا کسی شہر یا دیہاتی کا نام بھی تصور نہیں کیا جاسکتا۔ برصغیر میں کئی لوگوں کے نام پرندوں پر بھی ہیں جیسے کہ طوطا' مور وغیرہ بلکہ یہ تو بہت ہی پیارے نام ہیں۔ اگر کسی کو ذہین اور چالاک قرار دینا مقصود ہو تو اسے کوا کہا جاتا ہے۔ اپنی مردانگی کا اظہار کرنے والے خود کو جھرک (چڑا) کہلواتے ہیں۔ چھوٹے قد والے کو پدی کہتے ہیں۔ مردوں کے علاوہ خواتین کو بھی بعض پرندوں کے نام دیئے جاتے ہیں اور وہ ان پر فخر محسوس کرتی ہیں۔ جیسے کسی خاتون کی صراحی دار گردن ہو تو اسے کونج سے تشبیہہ دی جاتی ہے جو خوبصورتی کی علامت ہے۔ چھوٹے قدم اٹھا کر ناز سے چلنے والی لڑکی کو مورنی یا بطخ بھی کہا جاتا ہے۔ لیکن جس پرندے کا پڑھے لکھے یورپیوں نے انتخاب کیا ہے وہ پرندہ ہمارے ملکوں میں کیریکٹر سرٹیفیکیٹ تک حاصل

نہیں کرسکتا' جسے حاصل کرنا ایک لوفر لفنگے کے لئے بھی مشکل کام نہیں ہے۔ بڑے اور سمجھدار لوگ تو درکنار کسی بچے کو بھی الو کے نام سے پکارینگے تو پٹاخ سے جواب دے گا۔ "آپ خود ہونگے۔"

الو ہم ایشیائی لوگوں کے پاس' خصوصاً پاکستان، بھارت، ایران اور عرب ممالک میں باگڑی، بھیل سے بھی کم ذات کا سمجھا جاتا ہے، کسی کو گالی دینا مقصود ہو تو اس پرندے سے منصوب کیا جائے اور اگر اس سے بھی بڑی گالی دینی ہو تو اسے اس پرندے کی اولاد یعنی الو کا پٹھا کہا جائے جو زبانی گالیوں میں سیڑھی کا آخری زینہ ہے کیونکہ اس گالی کا جواب دینے والا منہ سے نہیں تھری ناٹ تھری (بندوق) سے دے سکتا ہے۔

الو اندھیرے میں نکلنے والا پرندہ ہے۔ الو پرانے اور اجڑے ہوئے درختوں کے سوراخوں اور بوسیدہ اور ویران عمارتوں میں رہنے والا پرندہ ہے۔ ہمارے ہاں الو مایوسی تباہ حالی اور دیوالیہ پن کی علامت سمجھا جاتا ہے لیکن یورپ میں الو ایک باعزت پرندہ بلکہ پرندوں میں بڑی شخصیت مانا جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اہل یورپ اس پرندے کو اپنی شناختی علامت بنانا چاہتے ہیں۔ ہالینڈ کے ایک شہر ایمسٹرڈیم سے کسی Joroen Van Blaaderen نام کے شخص نے اخبار' یورپین' میں لکھا ہے "الو ایک خوبصورت اور پرکشش پرندہ ہے۔ وہ ذہین اور اچھے اخلاق والا ہے۔ اس میں صبر اور قوت برداشت بہت زیادہ ہے۔ کوئی بھی فیصلے کرنے میں بہت تیز اور ہوشیار ہے اور یہ تمام یورپی ممالک میں پایا جاتا ہے۔"

ناروے کی پولیس آفیسر لبنیٰ علی

ناروے' سوئیڈن' ڈنمارک اور فن لینڈ جیسے دور دراز شمالی اور برفانی ملکوں میں برصغیر کے لوگ سب سے آخر میں آئے اور ان میں بڑی تعداد ان پڑھ اور مزدور طبقے کی تھی۔ پڑھے لکھے اور ہنر مند افراد کو تو ان دنوں امریکہ' انگلینڈ' فرانس' جرمنی جیسے ممالک میں روزگار مل جاتا تھا جہاں کا موسم قدرے بہتر ہے۔ مزدور یعنی غیر ہنر مند طبقہ بھی پہلے یورپ اور عرب ممالک کی طرف جاتا رہا بعد میں جب ان کے لئے روزگار کا حصول مشکل ہوگیا تو غریب لوگوں کو مجبوراً ان قطبی ملکوں کا رخ کرنا پڑا۔ اور ان محنت کش لوگوں نے ان ممالک کے خراب موسم میں اجنبی زبان بولنے والوں کے ساتھ رہ کر محنت مزدوری کی اور اپنے خاندان کا پیٹ پالا۔ خود تو زیادہ نہ پڑھ سکے لیکن تکلیفیں سہہ کر اپنے بچوں کو بہتر تعلیم دلانے کی کوشش ضرور کی اور بچوں نے بھی ماں باپ کے جذبات کی قدر کرتے ہوئے سخت محنت کی اور معاشرے میں اچھا مقام حاصل کیا۔ آج ہمارے ملک کے کئی لوگ جو ان ملکوں میں رہتے ہیں' ان کی دوسری نسل اس ملک کے رہنے والوں کے مقابلے میں امتحانات میں اچھے نمبر حاصل کرکے اعلیٰ عہدوں پر فائز ہیں۔

ان میں سے ایک نام لبنیٰ علی کا ہے۔ یہ پہلی پاکستانی دوشیزہ ہے جو ناروے کی پولیس اکیڈمی میں چار ہزار امیدواروں میں کامیاب ہونے والے 300 کیڈٹوں میں سے ایک ہے۔ اس کا انٹرویو اور تصویر یہاں کے ایک مقامی اخبار میں شائع کی گئی جو پاکستان کے لئے اعزاز کی بات ہے۔ ناروے کی پولیس اکیڈمی کا داخلہ ٹیسٹ انتہائی مشکل سمجھا جاتا ہے۔ اس میں امیدوار کا پرانا ریکارڈ بھی چیک کیا جاتا ہے کہ وہ اسکول اور کالج کے دنوں میں پڑھائی اور کھیل کود وغیرہ میں کیسا تھا۔ لبنیٰ علی نے اپنے انٹرویو میں بتایا کہ "میں نے داخلہ ٹیسٹ میں بہت زیادہ نمبر حاصل کئے اور میرا ریکارڈ بھی شروع سے بہت اچھا رہا ہے۔ میں اسکول اور کالج میں ہر سال پوزیشن حاصل کرتی رہی ہوں اور یونیورسٹی کی تیاری والے سیمسٹر میں میرا مضمون کرمنالوجی رہا۔" اس نے بتایا کہ "میں کراٹے کے اسٹائل تائی کوانڈو میں ریڈ بیلٹ حاصل کرچکی ہوں۔"

انہوں نے بتایا کہ پولیس اکیڈمی سے گریجویشن کرنے پر مجھے ایک سال کے لئے اوسلو سے 25میل دور ایک گاؤں میں رکھا گیا۔ جہاں مجھے دیہاتی ماحول میں رہنا پڑا۔ صرف چند لوگوں کو پتہ چل سکا تھا کہ میں دنیا کے ایک بڑے شہر (اوسلو) کی رہنے والی ہوں اور یہ بھی کم لوگوں کو معلوم ہوسکا کہ مقامی زبان یعنی نارویجن کے علاوہ بین الاقوامی زبان انگریزی اور مادری زبان اردو بھی آتی ہے۔ دوران گشت یا پولیس اسٹیشن میں جب بھی میں کسی سے ملتی ہوں تو میں پولیس آفیسر کی حیثیت سے پہلے اور خاتون کی حیثیت سے بعد میں ملتی ہوں۔

"جس وقت میں ڈیوٹی پر یا اپنی پولیس اکیڈمی میں ہوتی ہوں یا اپنی نارویجن سہیلیوں کے ساتھ ہوتی ہوں تو میری سوچ اور کام کا طریقہ ناروے کے ایک عام باشندے کی طرح ہوتا ہے۔ گھر میں یا اپنی پاکستانی سہیلیوں کے ساتھ میں ایک پاکستانی ہوتی ہوں۔ نارویجن پولیس اکیڈمی میں پڑھائی کے دوران ایک مسلمان کی حیثیت سے مجھے کسی قسم کی کوئی دقت یا پریشانی نہیں ہوئی۔" انہوں نے بتایا کہ اب یہاں کے لوگ رمضان المبارک میں روزے رکھنے اور خنزیر کے گوشت کو ہاتھ نہ لگانے کو نہ صرف سمجھ گئے ہیں بلکہ اب وہ اس پر نہ تنقید کرتے ہیں اور نہ ہی اس کا مذاق اڑاتے ہیں۔

بندر روڈ کے خاص درخت

سنگاپور اور جاپان کی طرح یورپ کے کئی ممالک میں سائیکل چلانے والوں کے لئے علیحدہ سڑکیں بنائی گئی ہیں اور سائیکل چلانے والوں کی حوصلہ افزائی کی جاتی ہے۔ بسوں یا کاروں کی بجائے سائیکل سواری کرنے سے آدمی تندرست رہتا ہے۔ حادثے کم ہوتے ہیں' پیٹرول کی بچت ہوتی ہے اور سب سے بڑی بات دھواں اور گیس کم ہونے کی وجہ سے ماحول صاف ستھرا رہتاہے۔ صاف ہوا صرف انسانی پھیپھڑوں کو ہی نہیں بلکہ درخت اور پودوں کو بھی صحت مند اور فطرت کے عین مطابق رکھتی ہے۔

یہ سوچ کر مجھے اپنے ملک کے کئی شہروں کے آلودہ ماحول کا خیال آتا ہے۔ کراچی کسی زمانے میں دنیا کے صاف ستھرے شہروں میں شمار ہوتا تھا جب کراچی کا میئر جمشید نسرونجی تھا تو اس شہر کی سڑکوں کو گلاب کے پانی سے دھویا جاتا تھا اور آج جگہ جگہ گٹر ابل رہے ہیں۔ اب تو پوش علاقوں میں بھی کوڑے کے ڈھیر نظر آتے ہیں اور تو اور بندر روڈ (ایم اے جناح روڈ) پر لگے درختوں کے پتوں کو بھی فطری حالت میں دیکھتے ہوئے زمانہ

بیت گیا۔ ان پتوں پر کاربن اور مٹی کی اتنی موٹی اور سخت تہہ جم چکی ہے کہ شدید بارش میں دھلنے کے بعد بھی وہ جوں کے توں رہتے ہیں۔ ایسے کالے پتوں والے درخت آپ کو بنکاک' کلکتہ' ینگون' اور سیول جیسے ایشیائی شہروں میں نظر نہیں آئیں گے جہاں کی ٹریفک ہمارے شہروں سے کہیں زیادہ ہے۔

روسی ہمارے رشتے دار

سوئیڈن میں پہلے دن یونیورسٹی کی میس میں ہمارے میز پر جو تیسرا شخص آکر بیٹھا اس کے بارے میں میرے ایک پاکستانی ساتھی کیپٹن سلیم قاسم نے مجھے کہاکہ معلوم کرو کہ اس کا تعلق کس ملک سے ہے۔ یہ شخص لمبا تڑنگا اور گورے رنگ کا تھا اور یقیناکسی یورپی ملک کا لگ رہا تھا یا کینیڈا، امریکہ کا۔

میرے پوچھنے پر اس نے کہا۔

"میں سابق سوویت یونین (یو ایس ایس آر) کا ہوں۔"

ہم لوگ ایک لمحے کے لئے چونکے پھر نارمل ہوگئے۔ سوویت ریپبلک کے ٹوٹنے سے پہلے اگر وہ یہ بات کرتا تو ہم اسے یقیناکوئی جاسوس یا خفیہ ایجنسی کے جی بی کا ایجنٹ سمجھ کر ناشتہ کئے بغیر ہی کھسک لیتے۔ اپنے یا کسی دوسرے ملک میں کسی روسی سے دوستی تو کیا بات چیت کرنے پر سی آئی ڈی یا ایف بی آئی جیسے ادارے پیچھے لگ جاتے تھے۔ یونین آف سوویت سوشلسٹ ریپبلک ایک ہی ملک سمجھا جاتا تھا جس کو ہم روس بھی کہتے تھے۔

اسکول کالج کے زمانے میں مغربی اخبارات اور رسالے پڑھ کر روس کے لئے ذہن میں یہ نقش بیٹھ گیا تھاکہ روسی لوگ بہت ظالم اور کافر ہیں۔ خداکو نہیں مانتے' خصوصاً مسلمانوں کے بدترین دشمن ہیں' پڑوسی ممالک پر قبضہ کرنے کے شوقین ہیں۔ وغیرہ وغیرہ۔ اس کے ساتھ روسی ادب اور Sputinik ڈائجسٹ جیسے اخبارات اور رسائل پڑھ کر اور خصوصاً اپنے ملک کے شعراءادیبوں سے سن کر یہ تاثر بھی ابھراکہ روس ایک طاقتور ملک ہے جس کی معیشت انتہائی مستحکم ہے جو اس نے کمیونزم پر عمل کرکے حاصل کی ہے اور ہمارے ملک کو بھی ان تمام باتوں سے رہنمائی لینا چاہیے اسی میں قوم کی خوشحالی ہے۔ سائنسی علوم اور سرمایہ میں روس بہت امیر ہے یہاں تک کہ وہ اپنی فالتو دولت ایشیا اور افریقہ کے کئی غریب ممالک میں بانٹتا پھر رہا ہے۔ اتفاق ہے کہ تعلیم سے فارغ التحصیل ہونے کے بعد مجھے جس جہاز پررکھاگیا اس کا روٹ ایسا تھا جس سے مجھے پہلے ہی سال روس دیکھنے کا موقع مل گیا۔ یہ 1968ءکی بات ہے۔ اس وقت میں‌نے سندھی اخبار عبرت میں کالم لکھنے شروع کئے تھے۔ میں ہر بندرگاہ اور سمندر سے کچھ نہ کچھ جو مجھے متاثر کرتا تھا اس اخبار کے لئے لکھ کر بھیجتا رہتا تھا۔ ہمیں جہاز کو کراچی لانے سے پہلے اوڈیسا سے مشینری لانے کی ہدایت دی گئی۔ ان دنوں ہم رومانیہ کی بندرگاہ کانسترہ میں تھے جو بحیرہ اسود (Black Sea) کی بندرگاہ ہے اور روسی بندرگاہ اوڈیسا کے قریب ہی واقع ہے۔

رومانیہ کی بندرگاہ سے رات بھر کے سفر کے بعد صبح کے وقت روسی بندرگاہ اوڈیسا پہنچے۔ جہاز کی مشینوں میں کافی کام تھا اس لئے ہم پورا دن انجن روم میں ہی مصروف رہے۔ شام کے وقت گھومنے کے لئے نکلے۔ یہاں

ہم نے ہر وہ رونق دیکھی جو کسی بھی بندرگاہ کی زینت ہوتی ہے۔ لیکن حیران کن بات یہ تھی کہ بندرگاہ پر کام کرنے والا پولیس اور کسٹم کا عملہ ہم سے سگریٹ اور چیونگم جیسی چیزیں مانگنے لگا اور سگریٹ کا ایک پیکٹ کیا صرف ایک سگریٹ دینے پر خوش ہونے لگا اور کاغذات اور ڈالر دیکھے بغیر ہمیں چھوڑ دیا۔ جہاز پر مقامی پولیس نے ہمیں تنبیہہ کی تھی کہ ڈالر صرف بینکوں سے تبدیل کرائیں لیکن بندرگاہ سے باہر نکل کر دیکھا توکئی لوگ یہاں تک کہ پولیس آفیسر بھی بلیک میں ڈالر خرید رہے تھے اور ہمارے ساتھ دوسرے ممالک کے جہاز راں بھی ان سے ڈالر تبدیل کراکر روسی سکہ روبل لے رہے تھے۔ فرض کریں کہ بینک میں ایک ڈالر کی مقررہ سرکاری قیمت ایک روبل ہے تو یہ لوگ ہمیں ایک ڈالر کے دس روبل دے رہے تھے۔ میرے دریافت کرنے پر پتہ چلا کہ یہ لوگ ہم سے خریدے ہوئے ڈالر مزید مہنگے داموں بیچتے ہیں اور وہ لوگ جو روس سے بھاگنا چاہتے ہیں اپنے پاس ڈالر جمع کرتے جاتے ہیں۔

اس کے علاوہ شہر میں جگہ جگہ کئی لوگوں نے ہم سے پرانی اشیاءمثلاً جوتے، موزے،کوٹ وغیرہ مہنگے داموں خریدنے کی خواہش ظاہر کی اور دوسرے جہازوں کے ملاح جو یہاں پہلے بھی آچکے تھے وہ ڈالر تبدیل کرانے کی بجائے اپنی پرانی بیکار اشیاءاچھے داموں میں بیچ کر اپنا خرچہ پانی نکال رہے تھے اور ایسے ایسے لوگ جن سے دوسرے کسی ملک میں کوئی لڑکی بات کرنا گوارہ نہ کرے وہ لوگ اس بندرگاہ کے مختلف مَے خانوں میں لڑکیوں کے گلے میں بانہیں ڈال کر ووڈکا (Vodka) کی چسکیاں لے رہے تھے۔ یعنی یہاں پر پرانی چیزوں سے زیادہ سستے انسان ہیں تبھی تو چند ڈالروں کے بدلے میں یہاں کی عورتیں خود کو بیچتی پھررہی تھیں۔ بہر حال روس جیسے ملک میں یہ حالات دیکھ کر مجھے بڑی حیرت ہوئی۔ ظاہر ہے وہ ملک جو خلاءمیں راکٹ بھیج رہا ہے، دنیا کے کئی ممالک کو امداد دے رہا ہو، جو مغربی ممالک کو محض اس لئے گالیاں دے رہا ہو کہ وہاں پر قمار بازی اور مے کشی کے اڈے ہیں--- تو اس ملک میں جب میں نے مقامی لوگوں کو بھیک مانگتے دیکھا، سخت سردی میں پھٹے پرانے گرم کپڑے مہنگے داموں خریدنے پر مجبور دیکھا اور ہر قسم کی بدعنوانی دیکھی تو بہت تعجب ہوا اور دوسرے دن بغیر سوچے سمجھے جو کچھ دیکھا وہ اخبار کے کالم کے لئے لکھ کر بھیج دیا۔

دو تین مہینے کے بعد جب جہاز اپنے وطن پہنچا تو پتہ چلا کہ ہمارے ملک کے کچھ سینئر ادیب مجھ سے ناراض ہیں کہ روس جیسے عظیم ملک کے لئے میں نے یہ کیا اول فول لکھ دیا۔ ایک دو نے مجھے سمجھایا کہ بھئی ایسا نہیں کرتے اور ایک دو نے تو مجھ سے رازدارانہ انداز میں پوچھا کہ روس کے خلاف یہ غلط سلط پروپیگنڈا لکھنے پر مجھے کس نے مجبور کیا---کسی نے یہ سب کچھ لکھنے کے لئے پیسے تو نہیں دیئے۔ ان کا اشارہ امریکہ کی طرف تھا۔ میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ ان کا مقصد کیا ہے اور مجھ جیسے نو آموز لکھاری کے لکھنے سے کیا فرق پڑتا ہے۔ اس وقت میری عمر تقریباً 23 سال تھی اور میں نے بمشکل بیس پچیس کالم یا مضمون لکھے ہوں گے۔ بہر حال روس اور کمیونزم کے حامی لوگوں کا یہ تاثر تھا کہ میں نے کسی کے کہنے پر یہ سب جھوٹ لکھا ہے اور آئندہ ایسی حرکت سے گریز کروں اور میں ان کو خوش کرنے کے لئے ہاں کر کے آخر میں بڑی معصومیت سے کہہ دیتا۔

”لیکن جناب یہ جھوٹ نہیں ہے میں نے جو کچھ دیکھا لکھ دیا۔“

بہر حال اس کے کئی برس بعد تک نہ تو میرا جہاز روس گیا اور نہ اس ملک کے حالت پر مجھے مزید لکھنے کا موقع ملا۔

روس۔۔۔ یعنی پوری سابق یو ایس ایس آر سے متعلق میرا تاثر یہ تھا کہ یہاں مذہب نام کی کوئی چیز نہیں تھی اور اب اس کے ٹکڑے ہونے کے بعد آذربائیجان، قازقستان، ازبکستان، ترکمانستان جیسے ممالک کے نام سنتے ہیں تو لگتا ہے کہ جیسے یہ تو ہمارے قریبی عزیز ہیں۔ دیکھتے ہی دیکھتے وہ یو ایس ایس آر جس کے سائے سے بھی ہم دور بھاگتے تھے اس کے آذر بائیجانی، ترکمانستانی یا دوسرے مسلم ممالک کے لوگ مذہبی اور پرہیزگار لگتے ہیں۔ آخرکار یہ وہی علاقے تو ہیں جہاں سے کئی علمائ، بزرگان دین، اولیاءوصوفیائے کرام ادیب و شعراءمرزا قلیچ بیگ سے لے کر شہباز قلندر جیسی نابغہ روزگار شخصیات برصغیر میں آئیں اور یہیں کی ہو رہیں اور سمرقند اور بخارا جیسے تاریخی شہروں کا تعلق بھی ان ممالک سے تو ہے جنہیں ہم قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ 1917ءمیں کمیونسٹ انقلاب سے قبل یہاں 26 ہزار مساجد تھیں جن میں سے 400 مساجد انقلاب کے بعد بھی قائم رہیں۔ تقریباً ستر سال کی پابندی کے باوجود یہاں کے مسلمان آج بھی مذہب کے معاملے میں وہی جوش اور جذبہ رکھتے ہیں۔

سابق سوویت یونین کی پندرہ ریاستوں میں سے چھ مسلم ریاستیں تھیں جن میں سے ہر ایک ریاست اب ایک ملک کی حیثیت رکھتی ہے۔

آزربائیجان:— یہ بحیرئہ کیپسن کے مغربی کنارے پر ایران کے شمال میں ہے۔ اور اسکی آبادی تقریباً 80لاکھ ہے جس میں سے 85فیصد لوگ مسلمان ہیں۔ آزربائیجان کے لوگوں کا اپنے مغربی پڑوسی ملک آرمینیہ کے عوام سے کافی عرصے سے نگورونو کا راباخ پر جھگڑا چل رہاہے جو آذربائیجان کی سرحد میں آرمینیہ کا چھوٹا سا علاقہ ہے۔ آرمینیہ کے لوگ عیسائی ہیں جن کا مغربی پڑوسی ترکی ہے۔ آزربائیجان کے مسلمان زیادہ تر اہل تشیع مسلک کے ہیں۔ ثقافت اور رسم و رواج میں بھی یہ لوگ ایران کے قریب ہیں لیکن یہاں فارسی سے زیادہ ترکی زبان بولی جاتی ہے۔

دراصل کسی زمانے میں آزر بائیجان ایران کا حصہ تھا۔ آذربائیجان کا بیشتر حصہ آج بھی ایران کا حصہ ہے۔ آزاد آذربائیجان کا دارالحکومت باکو (Baku) ہے جو تیل کی آمد و رفت کے باعث اہم بندرگاہ ہے۔

قازقستان:— متحدہ روس سے علیحدہ ہونے والے اس ملک کی سب سے اہم چیز اس کا رقبہ ہے۔ قازقستان روس کے بعد دوسرے نمبر پر بڑا ملک ہے جس کا رقبہ 27لاکھ مربع کلومیٹر ہے۔ یعنی پاکستان جیسے تین ملک اس میں سما جائیں۔ 17 ملین کی آبادی ہے جن میں آدھے مسلمان ہیں۔ اس کا دارالحکومت الماتے ہے۔ اس میں رہنے والے لوگ اپنی زبان قازق کے علاوہ ترکی اور روسی زبانیں بولتے ہیں۔ قازقستان کا کافی حصہ بحیرئہ کیپسن کے ساحل پر ہے۔ دنیا کی مشہور جھیل بلخاش بھی اسی ملک میں ہے اور بحیرہ ارل (Aral Sea) کا آدھا حصہ قازقستان اور آدھا ازبکستان میں آجاتا ہے۔

کرغزستان:— یہ ایک پہاڑی ملک ہے جس کی سرحد چین سے ملی ہوئی ہے یہاں کے پہاڑیوں کی چوٹیاں 24000 فٹ بلند ہیں 50 لاکھ کی آبادی میں سے آدھے سے زیادہ مسلمان ہیں۔ اس کا دارالحکومت بشکک ہے۔ یہاں کی سرکاری زبان پہلے روسی تھی لیکن اب ان کی اپنی زبان کرغ ہے۔

تاجکستان:— تاجکستان ہمارے ملک کے بالکل شمال میں واقع ہے۔ ہمارے شمالی علاقے کی طرح یہ بھی پہاڑی علاقہ ہے۔ پامیر رینج جو دنیا کی چھت کہلاتی ہے اس کا ایک حصہ تاجکستان تک پھیلا ہوا ہے۔ یہاں کے

فارسی بولنے والے تاجک وسطی ایشیا کے سب سے قدیم رہائشی ہیں اور سب سے پہلے (تقریباً 1200 سال قبل) مسلمان ہوئے تھے۔ تاجکستان میں تقریباً 60 لاکھ لوگ رہتے ہیں جن میں سے 70 فیصد لوگ مسلمان ہیں۔ یہاں تاجک اور ہمسایہ ملک افغانستان کی دری زبان بولی جاتی ہے۔

ترکمانستان:- سابق سوویت یونین کی یہ سابق ریاست اب ایک آزاد ملک کی حیثیت اختیار کر چکی ہے اور اس کا دارالحکومت اشک آباد ہے اور اس کی سرحدیں ایران اور افغانستان کے شمالی سرحد سے ملی ہوئی ہیں۔ ترکمانستان کا کافی حصہ کاراکم بیابان (Kara Kum Desert) ہے اور یہاں پانی کی شدید قلت ہے۔ جہاں جہاں نہروں کا نظام ہے صرف وہاں گندم اور کپاس اگائی جاتی ہے۔

40لاکھ آبادی میں سے 70 فیصد لوگ مسلمان ہیں۔ یہاں ترکی زبان بولی جاتی ہے۔

ازبکستان:- ازبکستان کا دارالحکومت تاشقند ہے۔ یہ وہ ملک ہے جس میں سمر قند اور بخارا جیسے تاریخی شہر ہیں جن میں وقت کے بادشاہوں اور شہنشاہوں نے دنیا کی معروف اسلامی عمارات بنائیں۔ آج بھی سمر قند میں وہ 365 مسجدیں موجود ہیں جو تیمور کے پوتے نے بنوائی تھیں تاکہ مسلمان ہر روز نئی مسجد میں نماز پڑھ سکیں اور بخارا کے لوگ یہ دعوی کرتے ہیں کہ ان کا شہر اتنا صاف ستھرا ہے کہ اس کی روشنی خلاءمیں بھی نظر آتی ہے۔ سمر قند اور بخارا دونوں سلک روڈ پر ہیں اور زمانہ عروج میں (تقریباً 200ءمیں) تجارتی قافلے کیڈیز سے مشرقی چین تک اپنا لمبا سفر اس راستے کے ذریعے کرتے تھے۔ 1917ءوالی انقلابی توڑ پھوڑ کے باوجود سمر قند اور بخارا اسلامی فن تعمیر کے لحاظ سے دنیا بھر میں مشہور ہیں۔

اس ملک کا نام ازبکستان اس کے ایک حاکم ازبک خان کی وجہ سے پڑا جس نے 14 ویں صدی کے اوائل میں یہاں اسلام کی تبلیغ کی۔ ازبکستان میں کپاس اور چاول کی کاشت کی جاتی ہے۔ 200 لاکھ کی آبادی میں سے 70 فیصد مسلمان ہیں۔

عرب بھی دیدئہ بینا رکھتے ہیں

سوئیڈن میں برسوں سے مقیم ایک پاکستانی جوہر زمان نے پڑوسی ملک ڈنمارک کے بارے میں بتایا کہ یہ چھوٹا سا ملک ہے لیکن پوری دنیا کو دودھ' مکھن اور گوشت فراہم کرتا ہے۔ یہاں کے جانوروں کے گوشت کے سب سے بڑے خریدار عرب ہیں۔ بڑے اور چھوٹے گوشت کے علاوہ مرغیاں بھی ڈنمارک سے برآمد کی جاتی ہیں۔

"ارے بھئی یہ عرب بھی کمال کے لوگ ہیں۔" ہمارے ساتھ موجود کیپٹن عاشق نے کہا۔ "یہ ڈنمارک سے گوشت منگوالیں گے لیکن اپنے قریبی مسلمان ملک پاکستان سے نہیں لیں گے۔ وہ نہین چاہتے کہ اپنے کسی غریب پڑوسی ملک کو بھی فائدہ ہو۔"

"غریب پڑوسی ملک کے عوام کے پاس اپنے کھانے کے لئے بھی گائیں اور بکریاں نہیں ہیں۔" جوہر نے ہنستے ہوئے کہا۔ "دوسروں کو کیا دیں گے۔ اسی لئے تو منگل اور بدھ دو دن گوشت کے ناغے ہوتے ہیں۔"

"نہیں یار ایسی بات نہیں ہے۔ عرب اگر ہم سے جانوروں کا گوشت خریدنے پر آمادہ ہوجائیں تو ہم آسٹریلیا سے گائیں بکریاں خرید کر' ذبح کرکے ان کو حلال گوشت فراہم کرسکتے ہیں۔" عاشق نے کہا۔ کیپٹن عاشق کچھ عرصہ ان جہازوں کا بھی کپتان رہ چکا ہے جو آسٹریلیا سے بھیڑ بکریاں انگلینڈ اور ڈنمارک پہنچاتے ہیں۔

"پاکستان سے گوشت منگوانا عربوں کو سستا پڑے گا۔ چاہے وہ ہوائی جہاز یا بحری جہاز سے منگوائیں۔" میں نے کہا۔

"میرے بھائیو! عرب اندھے تو ہیں نہیں" جوہر نے ہماری توجہ مبذول کراتے ہوئے کہا "وہ نہ صرف ہمارے کسائیوں کی کند اور زنگ آلودہ چھریوں اور دیگر ہتھکنڈوں سے واقف ہیں بلکہ بوڑھے اور بیمار جانوروں کی بھی پہچان رکھتے ہیں اوراس کے علاوہ اخبارات پڑھ کر بھی وہ کراچی کی گوشت منڈیوں کے بارے میں خاصے باخبر ہوگئے ہیں۔ انہیں پتہ ہے کہ گائے اور بکرے کے گوشت کے نام پر نواب شاہ کے گدھے اور نیو کراچی کے کتے بھی بک جاتے ہیں۔ مردہ مرغیوں کے تکے تو زیادہ تر ہوٹلوں میں عام چلتے ہیں۔ عربوں کو ہیضے اور پیٹ کی بیماریاں پالنے کا شوق ہو تو وہ بنگلہ دیش' پاکستان اور بھارت سے گوشت منگوا کر دیکھ لیں۔"

"کم ازکم پھل تو ہمارے ملک سے منگوا سکتے ہیں؟" عاشق نے کہا

"یہ بھی سن لو۔ جدہ ایئر پورٹ یا بندرگاہ پر جو کیلی فورنیا سے گوبھی اور برازیل سے جو آم آتے ہیں وہ کراچی سے آئی ہوئی گوبھی اور آموں سے زیادہ تازہ ہوتے ہیں۔ رشوت اور بھتے کے چکر میں ہماری سبزیوں اور پھلوں کو کراچی سے اتنی تاخیر کے بعد روانہ کیا جاتا ہے کہ جدہ پہنچنے سے پہلے ہی وہ سڑ جاتے ہیں۔"

خنزیر کا گوشت اور شراب عام ہے

مالمو (سوئیڈن) کے جس ریستوران میں میں کبھی کبھار ناشتہ کرتا تھا اس کا مالک ایک فلسطینی عرب تھا۔ ریستوران میں پولینڈ کی دو لڑکیاں اور طارق نام کا ایک پاکستانی قادیانی نوجوان کام کرتا تھا جس کی عمر تقریباً25 سال تھی۔ کچھ سال جرمنی میں چوری چھپے رہنے کے بعد اس نے سوئیڈن میں سیاسی پناہ کے لئے درخواست دے رکھی تھی جس کا مقدمہ ایک مقامی عدالت میں زیر سماعت تھا۔

طارق نے مجھے پہلے دن ہی بتا دیا تھا کہ اس عربی کے ریستوران میں کوئی حرام چیز نہیں پکتی جو کسی مسلمان کے لئے پریشانی کا باعث بنے۔ ریستوران میں میرا بے دھڑک چلے آنا اس کا مظہر تھا کہ میں یہاں کھانے پینے کی اشیاءکے بارے میں مکمل طور پر مطمئن تھا۔ ناشتے میں کارن فلیکس' انڈا اور ڈبل روٹی کے ساتھ گائے کا قیمہ یا ٹرکی کے گوشت کی فرائی کی ہوئی پتلی سلائیس ملتی تھی۔ پہلی مرتبہ طارق ٹرکی کا گوشت لیکر آیا تو اس کا گلابی مائل رنگ دیکھ کر میں نے شکایت کی "تمہیں معلوم ہے کہ میں مسلمان ہوں۔"

"سر آپ بے فکر رہیں اس ہوٹل میں خنزیر یا شراب جیسی کوئی چیز پیش نہیں کی جاتی یہ ٹرکی کا حلال گوشت ہے۔ جو قیمے کے ساتھ ڈنمارک سے آتا ہے۔"

یورپ میں ناشتے پر بیکن یا ہیم (Ham) جو خنزیر کے جسم کے مختلف حصوں کا گوشت ہے پیش کیا جاتا ہے۔ ہاٹ ڈاگز (Hot Dogs) میں بھی خنزیر کے گوشت کا قیمہ ہوتاہے۔ ہاٹ ڈاگ سیخ کباب کی طرح ہوتا ہے لیکن یہ قیمہ گائے یا بکروں کی آنتوں میں بھرا جاتا ہے۔ ہیم برگر جو پاکستان میں گائے کے گوشت سے تیار کیا جاتا ہے یہاں وہ خنزیر کے گوشت سے تیار کیا جاتا ہے۔ ہیم (Ham) خنزیر کی ران کا گوشت ہے جس کا قیمہ بناکر دو بن کے بیچ میں رکھ کر ہیم برگر کے نام سے بیچا جاتا ہے اور یہی قیمہ اگر ڈبل روٹی کے ٹکڑوں کے درمیان رکھا جائے تو اسے ہیم سینڈوچ کہتے ہیں۔ وہ برگر جس میں گائے کے گوشت کا قیمہ رکھا جائے اسے بیف برگر کہتے ہیں۔ اسی طرح فش برگر میں مچھلی کا قیمہ ہوتا ہے۔ معلوم نہیں پاکستان میںبرگر کا نام ہیم برگر کیوں رکھا گیا ہے۔ نامعلوم یہ کسی نے شرارت کی ہے یا اس میں ہماری کم علمی کا عمل دخل ہے۔

ایک یورپی نے پاکستان کا دورہ کرنے کے بعد کہا کہ پاکستان میں اسلامی نظام کہاں ہے۔ شراب اور خنزیر کا گوشت تو عام چل رہا تھا۔ کراچی اور لاہور میں میں نے کئی جگہوں پر ہیم برگر بکتے دیکھے اور اس کے علاوہ کئی سیاستدان اور وڈیرے نجی محفلوں میں شراب پیش کرنا باعث فخر سمجھتے ہیں۔

دو اور دو

سوئیڈن کی ورلڈ میری ٹائم یونیورسٹی میں ہم جہاز رانوں کو پروفیسر کیپٹن ایڈگر گولڈ سمندری قانون (Maritime Law) پڑھاتے تھے۔ وہ کینیڈا کے رہنے والے ہیں۔ کیپٹن کی حیثیت سے تقریباً دس سال جہاز رانی کی اس کے بعد لندن سے قانون کی ڈگری حاصل کی اور اب کئی برس سے پیرس میں وکالت کررہے ہیں۔ پروفیسر ایڈگر زیادہ تر جہازوں کے مالکان کی طرف سے کرمنل مقدمات لڑتے ہیں۔ 70 برس کی عمر، سر اور داڑھی کے بال سفید ہو جانے کے بعد بھی صحت مند اور چاق و چوبند نظر آتے ہیں۔ ہر سال ایم۔ ایس۔ سی سال آخر کے طلبہ کو دو ہفتے پڑھانے کیلئے پیرس سے گاڑی خود ڈرائیو کرکے سوئیڈن کے اس جنوبی شہر اور بندرگاہ مالمو آتے ہیں۔ ان کا دلچسپ لیکچر سننے کے لئے بہت لوگ آتے ہیں۔ کئی لوگ تو ان کے لیکچر کو ٹیپ کرکے محفوظ کرلیتے ہیں۔

عالمی قانون کے مطابق کسی بھی جہاز کو سمندر میں تیل خارج کرنے کی اجازت نہیں ہے اس سے سمندر اور پانی کی مخلوق کو نقصان پہنچتا ہے۔ اس جرم کی بھاری سزائیں ہیں اور جرم ثابت ہونے پر جہاز کے مالک کو جرمانہ ادا کرنا پڑتا ہے اور جہاز کے دو بڑے افسروں کیپٹن اور چیف انجنیئر کو جیل بھی ہو سکتی ہے۔ جہاز رانوں کے لئے مقررہ سہولتیں مہیا نہ کرنے' بندرگاہ میں جہاز کھڑے ہونے کے اخراجات نہ دینے یا جہازوں کی صحیح مرمت نہ کرانے پر بھی جہاز کے مالک کو مجرم قرار دیا جاتا ہے اور کبھی کبھی سزا کے لئے اس کے جہاز کو بندرگاہ میں ہی حراست میں لے لیا جاتا ہے اور جب تک اس مالک کی عدالت سے جہاز کا مالک جان نہ چھڑائے جہاز وہیں کھڑا رہتا ہے اور اس پر لدا سامان مالکان کو دیر سے پہنچتا ہے جس سے جہاز کے مالک کی ساکھ خراب ہوتی ہے۔

پروفیسر ایڈگر نے کہا۔ "جہازوں سے صرف آپ کپتانوں' انجینئروں اور بندرگاہوں میں کام کرنے والوں کا تعلق نہیں ہے ہم وکیلوں کا بھی ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ ہر ایک کے کام کی نوعیت مختلف ہے۔"

لیکچر سننے والے طلبہ میں سے بنگلہ دیش کے کیپٹن حبیب الرحمان نے کھڑے ہو کر کہا۔ "سر آپ خود بھی جہاز کے کپتان رہے ہیں۔ عدالت میں آپ ہمارا بھی خیال رکھتے ہیں یا صرف جہاز کے مالک کا فائدہ دیکھتے ہیں؟"

کیپٹن حبیب کے سوال کے جواب میں کیپٹن ایڈگر نے ہمیں ایک لطیفہ سنایا۔

"کسی ماہر ریاضی دان سے پوچھا گیا دو اور دو کتنے ہوئے؟"

وہ سوچ میں پڑگیا۔ کچھ دیر سلائیڈ رول اور کیلکیولیٹر سے کھیلنے کے بعد اس نے جواب دیا چار اعشاریہ صفر صفر ہوگا۔

بازار حصص میں کام کرنے والے سے جب یہ سوال کیا گیا تو بولا آپ حصص خریدنے کے سلسلے میں معلوم کررہے ہیں یا سونے چاندی کے بھاؤ کے لئے۔ بہر حال دو اور دو کو جمع کرنے سے جواب تین اور پانچ کے درمیان میں آئے گا۔

چیف سیکریٹری سے جب یہ سوال کیا گیا تو وہ بڑے اطمینان سے بولا۔ اس سلسلے میں وزیر کیا کہتے ہیں؟ (یعنی میرا بھی وہی جواب ہے(

ایک بیوپاری سے جب یہ پوچھا گیا تو بولا۔

اگر مجھے دینے ہیں تو دو اور دو پانچ ہونگے اگر لینے ہیں تو تین۔

اور جب وکیل سے پوچھا گیا کہ دو اور دو کتنے ہونگے تو ایک دم جواب دیا آپ کتنے چاہتے ہیں۔

"یعنی آپ نے چاہے جرم کیا ہو یا نہیں لیکن وکیل آپ کو جتوانے کے لئے آپ کی بات سچ ثابت کرے گا کیونکہ اس نے اس کام کی آپ سے فیس وصول کی ہے۔"

پروفیسر صاحب لطیفہ سنا چکے تو اگلی نشستوں پر بیٹھے ایران کی بندرگاہوں کے ڈائریکٹر صاحبان میں سے ایک نے کھڑے ہو کر کہا۔ "سر میں بتاؤں دو اور دو کتنے ہوں گے۔"

"آپ برائے مہربانی بیٹھ جائیں۔" پروفیسر نے انہیں اشارہ کرتے ہوئے کہا "مجھے معلوم ہے کہ آپ جواب میں یہی کہیں گے کہ جو اللہ کو منظور ہوگا۔"

"نہیں سر! ان کا جواب بھوکے فقیر والا ہے۔" نائیجیر سے آئے ہوئے وہاں کی وزارت مواصلات کے مسلمان ڈپٹی سیکریٹری علی جمبا نے کہا۔ "کسی فقیر سے پوچھا گیا کہ دو اور دو کتنے ہونگے تو اس نے جواب دیا چار روٹیاں۔ اس طرح ہمارا ایرانی دوست یقینا یہ کہنا چاہے گا کہ دو اور دو چار لعنتیں ہوں گی، امریکہ پر۔"

وکیل کس طرف ہوتے ہیں؟

پروفیسر ایڈگر گولڈ مالمو میں جہاز رانی کی یونیورسٹی کے علاوہ ہیلیفکس (کینیڈا) کی ڈالموس یونیورسٹی کے بھی اعزازی پروفیسر ہیں اور کینیڈا میری ٹائم لاءایسوسی ایشن کے صدر بھی۔ پروفیسر ایڈگر کو جتنا سمندری قانون پر ملکہ حاصل ہے اتنی ہی ان کی انگریزی بھی اچھی ہے۔ حالانکہ ان کی مادری زبان فرانسیسی ہے۔ جہازوں کا کپتان ہونے کے ناطے انہیں جہاز رانوں کے مسائل کا بھی علم ہے۔ اس دن انہوں نے ان عنوانوں پر لیکچر دیا۔

۱۔ قانون کی ابتدائ

۲۔ بین الاقوامی سمندری قانون

۳۔ Conflict Resolution / Dispute Settlement

پروفیسر کیپٹن ایڈگر کے لیکچر کے دوران پورے ہال میں خاموشی چھا جاتی ہے اور وقت گزرنے کا احساس نہیں ہوتا حتی کہ وقفہ بھی یاد نہیں رہتا۔ ہاں البتہ سگریٹ نوشی کرنے والے ضرور بے چین رہتے ہیں۔ ویتنام کی کیپٹن پینگ دوسرے کونے میں بیٹھے ہوئے آزربائیجان کے چنگیز تیمولوو کو سگریٹ نوشی کا اشارہ کرتا رہا۔ سعودی بحری افسر صالح الشائری نے جیب سے سگریٹ کا پیکٹ نکال کر تھائی لینڈ کے لیفٹیننٹ کمانڈر سوتی چائی کو دکھا کر گھڑی کی طرف اشارہ کیا۔ یعنی بہت دیر ہوگئی ہے اب سگریٹ پی لینا چاہیے۔ آخر ایران کے ایک نوجوان شاگرد کیپٹن شہریار نے کھڑے ہوکر پروفیسر صاحب سے کہا

سر ہم میں بعض لوگ پریشان ہیں۔

بوڑھے پروفیسر نے چشمہ اتار کر جیب میں ڈالا اور اوور ہیڈ پروجیکٹر کا سوئچ آف کرتے ہوئے شہریار سے کہا۔ "مجھے اس اقلیتی طبقے کا علم ہے۔" اور پھر ہم سب کو مخاطب ہوکر کہا۔ "سگریٹ پینے والوں کو سگریٹ نوشی کرنے دو کیونکہ یہ دنیا کی Dying Minority ہے۔"

ترکی کے چیف انجینئر نے نائیجیریا کے سیاہ فام کپتان عثمان سے ایک سگریٹ ادھار لیتے ہوئے زور سے کہا "میرے کالے دوست عثمان! چل فی الحال تو سگریٹ کا لطف اٹھا کر تازہ دم ہوجائےں بعد کی بعد میں دیکھی جائے گی۔"

تھوڑی دیر کے بعد پروفیسر ایڈگر نے تالی بجا کر ہمیں خاموش رہنے کا اشارہ کیا "اگر برا نہ مانو تو ایک بات کہوں۔ ابھی قانون کے کئی موضوعات پر بات ہونی باقی ہے۔" سب خاموش ہوگئے آذربائیجان کے گول مٹول چنگیز تیمولوو نے بیٹھے بیٹھے کہا "سر ہم سب اچھے طلبہ ہیں۔ بس سگریٹ نوشی ہماری کمزوری ہے۔"

"یہ جھوٹ بولتا ہے۔" ترکی کے حسن بقال نے چنگیز کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔ "اس کی کمزوری کچھ اور ہے۔"

چنگیز نے اب پروفیسر کے بجائے ہماری طرف منہ کرکے کہا "دوستو یہ ترک مجھ سے جلتا ہے کیونکہ مس ڈیزی جیسی خوبصورت دوشیزہ اور فلپائن نیوی کی نیول آرکیٹیکٹ آج میرے پاس آکر بیٹھی ہے۔"

"ڈیزی دوشیزہ نہیں بلکہ خاتون ہے" حسن نے چنگیز کی تصحیح کرتے ہوئے کہا۔ ڈیزی نے خوشگوار موڈ کا مظاہرہ کرتے ہوئے سر تسلیم خم کیا۔ پروفیسر نے ان کی باتیں سنی ان سنی کرتے ہوئے اپنا لیکچر جاری رکھا۔ "اچھے سے اچھا قانون بھی بے کار ہے اگر اسے صحیح طریقے سے لاگو نہ کیا جائے۔"

"سر آپ نے ہمارے سوال کا جواب نہیں دیا۔" نائیجیریا سے آئی ہوئی وہاں کی بندرگاہ کی ایک سینئر آفیسر میڈم جولیانا نے کھڑے ہوکر پروفیسر ایڈگر کی توجہ اپنی طرف مبذول کراتے ہوئے کہا۔ "آپ عدالت میں کس کی طرف سے مقدمہ لڑتے ہیں؟"

"دیکھیں وکلاء کے لئے سارے مؤکل برابر ہوتے ہیں۔ وکالت ایسا پیشہ ہے جس میں وکیل کبھی فرشتوں کی طرف سے ہوتے ہیں تو کبھی شیطان کی طرف سے۔ شروع میں ہی میں آپ کو بتا چکا ہوں کہ میں جہازوں کے مالکان کے مقدمات لیتا ہوں اور آپ کو پتہ ہے کہ جہازوں کے تمام مالک ہمیشہ فرشتے بھی نہیں ہوتے۔" پروفیسر نے جواب دیا۔

قطب شمالی کے ممالک سوئیڈن، ناروے، ڈنمارک،فن لینڈ وغیرہ میں شدید سردی اور برف باری کے علاوہ ہر وقت اندھیرا چھایا رہتا ہے۔ لیکن مجھے یہاں کی ایک بات بہت اچھی لگی کہ یہاں پر مکھیوں، مچھروں اور چیونٹیوں جیسے کیڑے مکوڑے نہیں ہیں۔ سوچنے کی بات ہے ایسی سخت سردی میں مکھی یا مچھر کیسے یہاں کا رخ کرینگے۔ وہی کیڑامکوڑا سوئیڈن یا ناروے کی طرف آئے گا جس کو اپنی زندگی عزیز نہ ہوگی۔ بہر حال اس سے ہمیں یہ فائدہ ضرور رہا کہ کبھی کبھار اگر چینی کا ڈبہ کھلا رہ جاتا تھا تو فکر کی بات نہیں ہوتی تھی بلکہ ایک ہفتے تک میز پرچینی بکھری رہے تو بھی وہاں کوئی چیونٹی نظر نہیں آتی تھی۔ کھڑکیوں پر جالیاں لگانے کی ضرورت نہیں ہوتی تھی۔ رات کے وقت بھی گھر کا دروازہ کھلا رکھنے سے مچھر نہیں آتے تھے ورنہ مکھی اور مچھر وہ بلا ہے جس نے امریکہ اور جاپان کو بھی نہیں چھوڑا ہے اور ہمارے ملک میں تو ان کا ہر وقت میلا لگا رہتا ہے۔

ملائیشیا جہاں ابھی آٹھ سال گزار کر آیا ہوں وہاں کی چیونٹیوں کی کیا بات کی جائے۔ کئی شکلوں، رنگوں اور جسامت رکھنے والی چیونٹیاں ہر وقت اور ہر جگہ موجود ہوتی تھیں۔ پکے گھر کے اندر ویسے چاہے وہ چہل قدمی کرتی ہوئی نظر نہ آئیں لیکن جہاں آپ نے چینی بسکٹ یا کوئی اور کھانے کی چیز زمین پر گرائی یا بغیر ڈھکن کے ٹیبل پر رکھ دی چیونٹیوں کی فوج وہاں پہنچ جائے گی اور نہ صرف وہ میٹھی چیزیں بلکہ ان کے ساتھ رکھی ہوئی ڈبل روٹی یا آٹے جیسی چیزیں بھی کھا جائیں گی۔ اور تو اور لال مرچ بھی کھا جاتی ہیں۔ چینی بسکٹ یا چاکلیٹ جیسی میٹھی چیز زمین پر گرنے پر پہلے چھوٹی اور پتلی والی لال چیونٹیاں آتی تھیں پھر کالے رنگ کی تھوڑی بڑی۔ پھر جسامت اور رنگت بڑھتی جاتی تھی اور اس کے ساتھ تعداد بھی اور ان کو بھگانے کا ایک ہی طریقہ ہوتا تھا ان پر گرم پانی پھینکنا یا جراثیم کش ادویات کا اسپرے کرنا۔ یہ چیونٹیاں اتنی خطرناک ہوتی ہیں کہ کبھی کبھی دگدھ (Vultures) کے پہنچنے سے پہلے یہ مرے ہوئے جانوروں کو صفاچٹ کر جاتی ہیں۔ ملائیشیا کے جنگلات میں رات کے وقت گاڑی چلاتے وقت ہم ہمیشہ یہ دعا کرتے تھے کہ اللہ کرے ٹائر تبدیل نہ کرنا پڑے کیوں کہ مچھروں اور کیڑوں سے زیادہ چیونٹیاں تنگ کرتی ہیں۔ سارے جسم پر چڑھ جاتی ہیں اور اس وقت تک کاٹتی رہتی ہیں جب تک آپ گھر پہنچ کر نہا نہ لیں۔

اس حساب سے ملائیشیا کے بعد سوئیڈن میں جو دو سال گزارے وہ بڑے آرام کے تھے۔ رات کے وقت بھی یہاں کے جنگلات میں گھومتے رہتے تھے۔ سوئیڈن، ناروے اور فن لینڈ کے جنگلوں میں نہ مکھی نہ مچھر' نہ بچھو نہ سانپ.... ہاں البتہ کبھی کبھی خرگوش یا ہرن نظر آجاتے ہیں۔ بہر حال برفانی ملکوں کے یہ جانور ملائیشیا سے بہتر ہیں جہاں کے ایک جنگل میں پکنک منانے کے دوران ایک کیلے کا ٹوکرا بندروں سے چھپانے کے لئے گاڑی کے نیچے رکھ دیا گیا تھا۔ ہماری غیر موجودگی میں وہاں سے کوئی ہاتھی گزرا' پکے ہوئے کیلوں کی خوشبو نے اسے کیلے کھانے پر مجبور کیا اور جب ٹوکرے تک نہیں پہنچ سکا تو اپنے سونڈ سے گاڑی الٹ کر کیلے کھا کر چلتا بنا۔

سوئیڈن میں ایک اور چیز بھی اچھی لگی وہ یہ کہ یہاں بالکل خشک ہوا چلتی ہے۔ اس سے یہ فائدہ ہے کہ کوئی بھی چیز خراب نہیں ہوتی۔ بسکٹ یا آلو کے چپس کھلی ہوئی حالت میں' دو دن پڑے رہیں تو بھی وہ خستہ اور کرارے رہتے ہیں۔ چینی یا نمک کھلی پلیٹ میں سال بھر پڑا رہے تب بھی اس کا دانہ الگ الگ نظر آتا ہے۔ ہوا میں نمی نہ ہونے کی وجہ سے لوہے کی چیزوں کو زنگ بھی نہیں لگتا۔ ان علاقوں میں چلنے والے جہازوں کے انجن روم

بھی صاف ستھرے نظر آئیں گے بس ایک دفعہ مشینوں کو ہلکی سے گریس لگانے سے وہ کئی دن بہترین حالت میں رہتی ہیں۔

ایک اور چیز قابل ذکر ہے وہ یہ کہ اپنے ممالک میں یہاں تک کہ فرانس' اسپین، اٹلی وغیرہ میں جہاں اتنی شدید سردی نہیں پڑتی، پھلوں کو جلد خراب ہونے سے بچانے کے لئے ریفریجریٹر میں رکھا جاتا ہے۔ سوئیڈن میں دوران رہائش ہفتے کے دن ہم لوگ بہت سارے پھل یعنی سیب، انگور، موسمیاں وغیرہ لے آتے تھے کیونکہ ہفتے کے دن پھل اور سبزیاں بہت سستے ہو جاتے تھے۔ ہم لوگ یہ پھل ریفریجریٹر میں رکھنے کے بجائے بالکونی کے ایک کونے میں رکھ دیتے تھے اور اس کے اوپر ایک دو کمبل اور چادریں ڈال دیتے تھے اور پورا ہفتہ کھاتے رہتے تھے۔ آپ کو حیرت ہو رہی ہوگی اور یقینا سوچ رہے ہونگے کہ ہم انگور، موسمیوں اور انار وغیرہ کے کریٹوں کو کیوں ڈھانپ کے رکھتے تھے؟

پھلوں کو صحیح حالت میں رکھنے کے لئے بہترین درجہ حرات مثبت بانچ (+5) ہوتا ہے جو ریفریجریٹر کے نچلے حصے کا ہوتا ہے۔ زیادہ گرمی میں پھل جلد خراب ہو جاتے ہیں۔ مچھلی اور گوشت وغیرہ منفی دس سے بیس درجہ حرارت میں صحیح رہتے ہیں۔ جہاز پر بھی ہم لوگ مچھلی اور گوشت کو اس درجہ حرارت پر لے کر چلتے ہیں، لیکن پا پھلوں کے لئے زیادہ ٹھنڈ بھی صحیح نہیں۔ صرف کھجور ایک ایسا پھل ہے جس کو آپ ریفریجریٹر میں رکھ سکتے ہیں (جس کا درجہ حرارت منفی دس سے بیس تک ہوتا ہے) باقی تمام پھل منفی درجہ حرات میں برف کی طرح سخت تو ہو جاتے ہیں لیکن طبعی درجہ حرارت پر لانے سے اپنی اصلی صورت اختیار کرنے کے بجائے جوس بن جاتے ہیں۔ اب بالکونی میں کمبل سے ڈھکے بغیر پھل اس لئے نہیں رکھتے کہ باہر کا درجہ حرارت دن کے وقت بھی منفی رہتا تھا اور رات کو تو اور بھی ٹھنڈ ہو جاتی تھی۔ اس لئے کمبل اور چادروں سے ڈھانپ کر ٹمپریچر صفر سے مثبت پانچ چھ تک قائم کرتے تھے۔ کمرے میں اس لئے نہیں رکھتے کیونکہ گرمائش کے مرکزی نظام کی وجہ سے کمروں کا درجہ حرارت ہر وقت 20 سے 25 تک رہتا تھا جو پھلوں کے لئے اچھا نہیں ہے اور ریفریجریٹر میں اس لئے نہیں رکھتے تھے کہ اس میں اتنی جگہ نہیں ہوتی تھی کیونکہ آپ کو تو پتہ ہے کہ ہفتے کے دن فروٹ اور سبزیاں سستی ہونے کے باعث ہم کافی تعداد میں پھل اور سبزیاں خرید لیتے تھے۔

ٹھند میں مرنا

سوئیڈن میں دوران رہائش جون کے مہینے میں کچھ دن واقعی اچھے آگئے۔ یعنی موسم کے لحاظ سے دن کے بیشتر حصے میں دھوپ نظر آنے لگی اور دن کے وقت درجہ حرارت مثبت 5 سے 10 ڈگری کے درمیان رہنے لگا حالانکہ یہ بھی اچھی خاصی ٹھنڈ تھی اورکراچی جیسے شہروں میں تو سخت سردی کے دنوں میں بھی ٹمپریچر مشکل سے 15 ڈگری **تک** گرتا ہے لیکن یہاں کے حساب سے گرمیوں کے دن آگئے تھے اور واقع کلاس روم میں ہیٹر چلانے کی ضرورت نہیں رہی تھی۔ اوورکوٹ کے ساتھ جیکٹ بھی کلاس روم کے باہر لٹکانے لگے۔ ان دنوں ہمارا گروپ جہازوں کی مضبوطی پرکام کررہا تھا۔ ہمارے گروپ میں ایشیائی ممالک کے صرف دو افراد شامل تھے **ایک** میں اور دوسرا سعودی عرب کا کمانڈر یحیٰ، جبکہ باقی آٹھ یورپی ممالک کے جہازوں کے چیف انجینئر اورکپتان تھے اور ان سب کا تعلق یورپ کے شمالی ملکوں سے تھا جہاں پر سخت سردی ہوتی ہے۔ مثلاً رومانیہ، ایسٹونیا، ناروے، روس، جارجیا وغیرہ۔

اب اس بہتر موسم کی وجہ سے یحییٰ اور میں (جن کا تعلق عرب اور پاکستان کے گرم اور ریتیلے علاقوں سے تھا) تو بہت خوش ہوئے لیکن باقی لوگوں کا سکون اچاٹ ہوگیا۔ ان سب کا یہ اصرار رہا کہ کھڑکیاں کھلی رکھنی چاہیں کیونکہ گرمی ہو رہی ہے۔ آخر یونیورسٹی کے انتظامی شعبے نے ٹیکنیشن بھیجا جس نے دو تین کھڑکیوں کے پٹ ڈیڑھ دو انچ کے قریب باہر کی طرف کھول دیئے۔ یاد رہے کہ سوئیڈن میں سخت سردی کی وجہ سے کھڑکیاں اس قسم کی استعمال ہوتی ہیں جو ہر کوئی آسانی سے نہیں کھول سکتا' خاص طور بچے تو بالکل نہیں کھول سکتے۔ دوسرا یہ کہ یہ کھڑکیاں پوری نہیں کھلتیں' زیادہ سے زیادہ تین یا چار انچ **تک**۔ کسی کھڑکی کا اتنا کھلنا بھی ایسا ہے جیسے **ایک** ساتھ تین چار ایئرکنڈیشنر چل پڑے ہوں، اور تیسری بات یہ ہے کہ ہر کھڑکی ہوائی جہاز کی کھڑکی کی طرح دو ہرے شیشے والی ہوتی ہے تاکہ رات کو نیند میں **ایک** شیشہ' کسی کے پتھر مارنے سے، اولے پڑنے یا کسی اور سبب سے ٹوٹ جائے تو دوسرا شیشہ سرد ہوا کو کمرے میں آنے سے روک سکے۔ ذرا تصور کریں' سردیوں میں جب درجہ حرارت منفی 20 ڈگری **تک** پہنچ جائے اور رات کے وقت جب کمرے میں کوئی بچہ یا ایسا بڑا جو نیند کی گولیاں کھا کر سویا ہو یا نشے میں دھت ہو اور اس وقت کھڑکی ٹوٹ جائے تو وہ تو گھنٹہ بھر میں قلفی بن جائے گا۔

بہر حال اس دن کھڑکیاں کھلنے کے بعد ہمارے سرد ملکوں کے ساتھی تو آرام محسوس کرنے لگے جبکہ ریگستانی علاقوں سے تعلق رکھنے والے ہم دو افراد کی تو حالت خراب ہوگئی۔ تیز اور ٹھنڈی ہوا نے پورے کمرے کو برف خانے میں تبدیل کردیا اور اس پر بدقسمتی یہ کہ کھڑکیاں کھلنے کے بعد آسمان پر کالے بادل چھانے لگے اور دیکھتے ہی دیکھتے دھوپ غائب ہوگئی۔ اب ہمارے گورے پہلوان بھی سردی محسوس کرنے لگے اور اب کسی کی ہمت نہیں ہورہی تھی کہ ٹیکنیشن کو واپس بلاکر کھڑکیاں بند کروائی جائیں کیونکہ اس نے کھولتے وقت بہت سمجھایا تھا کہ کسی اور نے اپنے کمرے کی کھڑکیاں نہیں کھلوائی ہیں اس لئے آپ بھی نہ کھلوائیں تو بہتر ہوگا۔ لیکن ہمارے گروپ کے ایک دو منچلوں نے اسے یہ کہہ کر کھولنے پر مجبور کیا کہ آپ کو معلوم نہیں ہم برف پر رہنے والے ہیں۔ ہم برف شکن جہازوں (Ice Beakers) کے کپتان ہیں اور اب حالت یہ تھی کہ برف پر رہنے والے بھی کانپنے لگے۔ میرے سعودی عرب کے ساتھی یحییٰ نے غصے میں کھڑے ہوکر ان سے کہا' "تم لوگ آج ہی انشاءاللہ ٹھنڈ میں مرجاؤ گے۔"

سب لوگ زور زور سے ہنسنے لگے کیونکہ آج صبح ہی یحییٰ نے ہم لوگوں کو ایک ایسے شخص کا لطیفہ سنایا تھا جو ریفریجریٹر کی ٹھنڈ میں مرگیا تھا۔

لطیفہ کچھ یوں ہے کہ مرنے کے بعد دو پڑوسی اپنی موت کے اسباب بتا رہے تھے۔ ایک کہنے لگا میں اپنی نیک اور وفا شعار بیوی پر خواہ مخواہ شک کرتا تھا کہ اس کے کسی کے ساتھ ناجائز تعلقات ہیں اور وہ اس سے ملنے آتا ہے۔ میری بیوی ہر وقت میرا شک دور کرنے کی کوشش کرتی تھی لیکن مجھے اس کی باتوں پر یقین نہیں آتا تھا۔ ایک دن تو مجھے پورا یقین ہوگیا کہ میری بیوی کا آشنا گھر میں موجود ہے۔ میری بیوی پھر بھی نہیں مانی' میں نے گھر کا ایک ایک کمرہ' ایک ایک کونا چھان مارا۔ بستروں کی چادریں تک ہٹا ہٹاکر دیکھ لیں لیکن وہ کہیں نہیں ملا۔ یہاں تک کہ ایک الماری بھی کھول کر دیکھ لی لیکن اس کا نام و نشان بھی نہیں تھا۔ یہ میرا گمان تھا کہ وہ گھر میں موجود ہے۔ اس بات نے مجھے شدید ذہنی دکھ پہنچایا اور اپنی بیوی پر شک کرنے پر ضمیر نے اتنی ملامت کی کہ میں نے خودکشی کرلی۔

دوسرے نے یہ کہانی سن کر ٹھنڈی آہ بھری اور کہا کاش اس دن تم نے فریزر کا دروازہ بھی کھول کر دیکھ لیا ہوتا تو ہم دونوں کی موت واقع نہ ہوتی۔ میں ٹھنڈ کی وجہ سے مرگیا تھا' میرے دوست۔

خود کو مصروف رکھنا

ایک دن صبح تقریباً دس بجے میں یونیورسٹی سے مالمو کی بندرگاہ کی طرف جا رہا تھا۔ بس میں میرے سامنے بیٹھی ہوئی سوئیڈش معمر خاتون نے مجھ سے پوچھا۔ "آپ کا تعلق کس ملک سے ہے؟"

"پاکستانی ہوں۔" میں نے جواب دیا۔

"پاکستان میں سردی پڑتی ہے لیکن صرف شمالی پہاڑی علاقوں میں۔" اس نے کہا۔ میں اس خاتون کو غور سے دیکھنے لگا۔ اس کی عمر تقریباً ستر برس کی ہوگی۔ لہجے اور جسامت میں بہت چاق و چوبند تھی اور بہت ہی شستہ انگریزی بول رہی تھی۔

"آپ نے پاکستان دیکھا ہے؟" میں نے اس سے سوال کیا۔

"ہاں لیکن بہت عرصہ پہلے بلکہ بیس پچیس سال قبل۔" اس نے جواب دیا۔

"کس سلسلے میں؟" میں نے پوچھا۔

"ان دنوں میں میں ارضیاتی سروے کرنے والی ایک فرم میں کام کرتی تھی۔ میرا مضمون جغرافیہ رہا ہے۔ فرم والوں نے مجھے پاکستان کے دورے پر بھیجا تھا۔" اس نے بتایا۔

"آپ انگریزی بہت اچھی بول لیتی ہیں کیا آپ برطانیہ کی رہنے والی ہیں؟"

"نہیں۔ انگریزی میں نے اسکول میں سیکھی۔ میرا ایک شوہر اسپین کا تھا جس سے میں نے ہسپانوی زبان سیکھی تھی۔ آج کل فرانسیسی سیکھ رہی ہوں۔" اس نے بتایا۔

میں نے حیران ہوکر خاتون کی طرف دیکھا۔ جو قبر میں پاؤں لٹکائے ہوئے تھی لیکن اس کے باوجود بھی ایک نئی زبان سیکھ رہی تھی۔ کیا مرنے کے بعد فرشتے اس سے فرانسیسی زبان میں بان زوئر' کہہ کر سوال جواب کریں گے۔

میرے متعجب ہونے پر وہ سمجھی شاید مجھے اس کا یقین نہیں آرہا ہے کہ وہ فرانسیسی سیکھنے جارہی ہے کیونکہ اسکینڈ نیوین ممالک یعنی ناروے، ڈنمارک، سوئیڈن، فن لینڈ وغیرہ میں اپنی زبانوں کو ہی اہم اور برتر سمجھا جاتا ہے۔ انگریزی ایک بین الاقوامی زبان ہونے کی وجہ سے یہ لوگ مجبوراً تھوڑا بہت سیکھ لیتے ہیں کیونکہ اس کے بغیر یورپ یا ایشیاءاور افریقی ممالک میں گزارہ ممکن نہیں و رنہ یہ لوگ جنوبی یورپ کے فرانس، اسپین اور خاص طور پر اٹلی جیسے ممالک کے لوگوں کو تو نیچ سمجھتے ہیں۔ اور ان جہلا کی زبانیں یہ اسکینڈی نیوی والے کیا خاک سیکھیں گے۔ بہر حال اس خاتون نے اپنے بیگ سے فرانسیسی سیکھنے والی کتاب نکال کر مجھے دکھائی۔

"یہ ایک حیران کن بات ہے۔" میں نے رسمی طور پر کتاب کے اوراق پلٹتے ہوئے کہا "آپ کو ویسے ہی اتنی زبانیں آتی ہیں۔"

"بس ایسے ہی وقت پاس کرنے کے لئے سیکھ رہی ہوں' اب مجھے شادی تو کرنی نہیں۔ لوگ پتہ نہیں کیسے کئی کئی شادیاں کرلیتے ہیں۔ میرے لئے تو یہ تین شادیاں ہی کافی رہیں۔ ایک بھی راس نہیں آئی۔ ایک شوہر فوت ہوگیا دوسرے نے مجھے تیسرے کو میں نے چھوڑ دیا۔ اب اکیلے گھر میں بیٹھے بیٹھے بور ہونے یا ہمسائیوں کے ذاتی مسائل میں دخل اندازی کرنے سے بہتر ہے کہ کسی کام میں لگی رہوں۔" اس نے حال دل سنایا۔

سر قلم کردیا جائے

سوئیڈن کی ورلڈ میری ٹائم یونیورسٹی میں جہاز رانوں کو معاشیات پڑھانے والے انگریز پروفیسر الڈرٹن انگلینڈ کے معروف ماہر معاشیات تھے۔ وہ اپنے ملک انگلینڈ سے خوش نہیں تھے اس لئے ہر بری بات میں اسے نشانہ بناتے تھے اور دوسرے نمبر پر امریکہ کو۔ یہی سبب ہے کہ پروفیسر الڈرٹن افریقہ اور برصغیر کے لوگوں کے ساتھ ساتھ ایرانیوں کو بھی پسند تھے۔ مسافر بحری جہاز ٹائی ٹینک جو گزشتہ صدی کے اوائل میں ڈوب گیا تھا' اس کے لئے پروفیسر صاحب ایک دن کہنے لگے۔ "ایسے جہاز پہلے بھی ڈوبتے رہے ہیں اور اب بھی ڈوب رہے ہیں لیکن اخبارات نے ٹائی ٹینک کی بے انتہا تشہیر کی اور اس کے بعد ہی بحری جہازوں کی سلامتی کے لئے بین الاقوامی قانون سیفٹی آف لائف ایٹ سی (SOLAS) بنا۔ بحری جہازوں کے کنجوس مالکان کی وجہ سے ان کے خراب جہاز چلانے والے موت کا شکار ہوتے رہتے ہیں۔ ایسے حادثات کے لئے دنیا کے تمام ممالک کے نمائندے اس کوشش میں ہیں کہ ایسا قانون بنایا جائے جس کے تحت حادثے میں اگر کوئی مر جائے تو اس کے اہل خانہ کو چار پانچ لاکھ روپے مل جائیں اور مرنے والا اگر کوئی امریکی ہے تو یقینا بیس پچیس لاکھ۔"

سننے والوں میں سے کسی نے کھڑے ہو کر کہا۔ "اگر آسٹریلوی ہو تو؟"

پروفیسر صاحب اس وقت بحث کرنے کے موڈ میں نہیں تھے۔ سوال کرنے والے کو بیٹھنے کا اشارہ کرکے معاشیات کی کتاب کھولی۔ لیکن اسی وقت کچھ سوچ کر ہم سے مخاطب ہوئے۔

"ویسے یارو! میں نہیں سمجھتا کہ آسٹریلوی کوئی شرفاء کی اولاد ہیں۔ پرانے زمانے میں انگلینڈ میں جیلیں کم ہونے کی وجہ سے ہر لوفر لفنگے، چور ڈاکو کو سزا کے طور پر آسٹریلیا بھیجا جاتا تھا۔ "پھر کچھ یاد آنے پر مسکرا کر کہنے لگے۔ "یہ اور بات ہے کہ ہمارے ملک کا قانون بھی عجیب تھا۔ معمولی معمولی بات پر حیرت انگیز سزائیں دی جاتی تھیں۔ ہمسائے کی مرغی چرانے پر حاکم فیصلہ صادر کرتا تھا کہ اس کا سر قلم کیا جائے یا اسے آسٹریلیا بھیج دیا جائے یا شاہی بحریہ کے جہاز پر آٹھ مہینے کا سفر کرایا جائے۔ چوروں کی مرضی معلوم کرنے پر کئی چور اپنے لئے بہتر یہ سمجھتے تھے کہ ان کا سر قلم کردیا جائے۔"

ٹوکیری کول ٹو نیوکیسل

بحری جہازوں کے مستقبل کا اندازہ لگانا بڑا مشکل کام ہے۔کچھ پتہ نہیں چلتاکہ آنے والے چند برس میں کیا ہوگا۔

کوئی زمانہ تھا لوگ بحری جہاز سے سفر کرتے تھے لیکن اب امیر اور غریب ہوائی جہاز میں جانا پسند کرتے ہیں۔ اس طرح قیمتی اور اہم سامان جس سے بحری جہاز کے مالکان کو بھاری کرایہ وصول ہوتا تھا اب ہوائی جہازوں کے ذریعے جانے لگا ہے۔ ہم جب نئے نئے اس شعبے میں داخل ہوئے تھے تو بیس پچیس ہزار ٹن کا جہاز بڑی چیز سمجھا جاتا تھا۔ 1968ءکی بات ہے سندر بن نامی ایک 20 ہزار ٹن وزنی پاکستانی جہاز دبئی لے آئے تھے تو دور دور سے لوگ اسے دیکھنے کے لئے پہنچ گئے تھے۔ (یہ اور بات ہے کہ ان دنوں میں دبئی اور دیرہ حیدرآباد کے ٹنڈوٹھوڑھو سے تھوڑے بڑے تھے(

نہر سویز کی بندش کے بعدجہازوں کو یورپ جانے کے لئے پورے براعظم افریقہ کا چکر لگانا پڑتا تھا۔ بحری جہازوں کے مالکان نے ضرورت کے مطابق Economics of Scale) کے تحت) بڑے بڑے جہاز بنوانے شروع کردیئے۔ 25 ہزار ٹن والے بحری جہاز سے ایک لاکھ ٹن والا بحری جہاز چارگنا زیادہ سامان اٹھا سکتا ہے جبکہ تیل پانی اور اس کے عملے کی تنخواہ کوئی دگنی بھی نہیں ہوتی یعنی اس طرح فی ٹن وزن اٹھانے پر خرچہ کافی کم آتا تھا۔ پھر دیکھتے ہی دیکھتے دو لاکھ تین لاکھ ٹن اور اس سے بھی بڑے جہاز بننے لگے جن کے ایک کونے سے دوسرے کونے تک جانے کے لئے سائیکل یا موٹر سائیکل استعمال کرنا پڑتی تھی۔

اور پھر ایک دن اچانک نہر سویز کھل گئی۔کسی کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھاکہ یہ کرشمہ رونما ہوگا۔ نہر سویز کھلنے پر بحری جہازوں سے متعلقہ افراد کو احساس ہواکہ چھوٹے جہاز ہی اس سے گزر سکتے ہیں بڑے بحری جہاز بیکار ثابت ہونے لگے اور جب نہر سوئز کھلی ہوئی ہو تو کون بے وقوف افریقہ کا خواہ مخواہ چکر لگانے کے لئے تقریباً پندرہ دن مزید تیل ضائع کرے گا۔

اور جناب ایک بار پھر چھوٹے جہاز بننے لگے۔ دل کے ڈاکٹروں نے خوب کمایا پھر بھی جہازوں کے کئی مالکان کے دل بیٹھ گئے اور وہ نہر سویز اور افریقہ کے کیپ آف گڈ ہوپ والے روٹ کی کنفیوژن میں اوپر چلے گئے۔ بچے ہوئے جہازوں کے مالکان نے بڑے جہازوں کو فروخت کرنے کی کوشش کی لیکن کوئی کباڑ کے بھاؤ پر بھی انہیں لینے کے لئے راضی نہیں تھا۔ ان دنوں، میں جس جہاز راں کمپنی میں کام کررہا تھا وہ جرمنی کے ایک شپ یارڈ کو بڑا جہاز بنانے کا آرڈر دے چکی تھی۔ جسے بعد ازاں منسوخ کرنے کیلئے کمپنی نے مجھے بھیجا۔ شپ یارڈ والے جہاز کا نیچے والا تلہ بچھا چکے تھے۔

”ہماری کمپنی کا یہ آرڈر آپ منسوخ کرسکتے ہیں؟“ میں نے شپ یارڈ کے منیجنگ ڈائریکٹر سے پوچھا۔

”کیوں نہیں ضرور کریں گے۔“ انہوں نے خندہ پیشانی سے جواب دیا۔

”اس کے لئے ہمیں کتنا ہرجانہ دینا پڑے گا؟“ میں نے پوچھا۔

”پورے جہاز کی قیمت۔“ شپ یارڈ والوں کی طرف سے جواب ملا۔

بہرحال پورے جہاز کے پیسے تو نہیں دینے پڑے لیکن پھر بھی اچھا خاصا معاوضہ دے کر اس جہاز سے جان چھڑانا پڑی ورنہ اتنا بڑا جہاز مالکوں کو کنگال کردیتا۔ اس عرصے کے دوران بڑے بحری جہازوں کو کھڑے کھڑے زنگ لگ گیا اور مالکان کو الٹا بندرگاہ میں جہاز کھڑا رکھنے کے واجبات دینے پڑے۔ چھوٹے جہاز نہر سوئز کے مختصر روٹ کی وجہ سے کم کرائے سے بھی خاصا کما رہے تھے۔ بڑے بحری جہاز مالکان کے لئے نکمے گھوڑے بن گئے جن کو وہ لوگ صرف مربے اور پستے بادام کھلاتے رہے۔ بحری جہاز انگریزی کہاوت کے مطابق سفید ہاتھی ہے۔ چلتا رہے چاہے کھڑا رہے اس پر روزمرہ کے بھاری اخراجات کرنا پڑتے ہیں۔ بحری جہاز کے مالک کے حق میں یہی بہتر ہے کہ اس کا جہاز چلتا رہے اور مسافر یا سامان ایک جگہ سے دوسری جگہ خیریت سے پہنچتے رہیں تاکہ کمائی ہوتی رہے۔

اور پھر ایک ایسا دور آیا جب ہر کوئی کاریں اٹھانے والے جہاز (Car Carriers) بنوانے لگا۔ تیل کے مہنگے ہونے پر یورپ اور امریکہ کے لوگ جاپان کی چھوٹی کاریں خریدنے لگے۔ جاپان سے کاریں اٹھانے کے لئے اس قسم کے جہاز مقبول ہوتے گئے جس میں عام جہاز کی طرح کارگو رسیوں میں باندھ کر اوپر اٹھا کر جہاز پر رکھنے کی بجائے گاڑی کو ڈرائیو کرکے جہاز میں لانا پڑتا تھا۔

اب کئی برس سے ایسا دور آگیا ہے کہ مزدوروں کی بڑھتی ہوئی تنخواہوں اور مہنگائی کی وجہ سے جاپان نے اپنے ملک میں کاریں بنانے کے بجائے ایشیا' یورپ اور جنوبی امریکہ کے مختلف ملکوں میں بنانا شروع کردی ہیں۔ یہاں تک کہ پاکستان میں بھی جاپانی کاریں سوزوکی، ٹویوٹا وغیرہ تیار کی جارہی ہیں اور اب کاریں اٹھانے والے جہازوں (Car Carriers) کی کوئی افادیت باقی نہیں رہی۔

ایک وقت تھا جب دنیا کے تمام سمندروں پر صرف برطانیہ کا ہی راج تھا۔ اب ہر ملک کی اپنی اپنی جہاز راں کمپنیاں ہیں۔ لیکن یارو! ایک عمل اب بھی وہی پرانا چل رہا ہے---- غیر ترقی یافتہ ملکوں سے ہر قسم کا خام مال یورپ اور امریکہ کی طرف جاتا ہے اور وہاں سے تیار شدہ مال افریقہ اور ایشیا کے غریب ممالک کی طرف آتا ہے۔ پچھلے دس سال میں کوریا' ملائیشیا' سنگاپور' چین' تائیوان جیسے ممالک کی صنعتی ترقی دیکھ کر یورپ کے امیر، ترقی یافتہ صنعتی ممالک پہلی مرتبہ خوفزدہ ہوگئے ہیں اور وہ آنے والے اس وقت سے ڈرنے لگے ہیں جب افریقہ اور

ایشیا کے خام مال بھیجنے والے ممالک Manufacturing کی صنعت میں بھی آگے نکل جائیں گے اور ان ممالک کا خام مال وہیں استعمال ہونے لگے گا۔ اس صورت میں جہازوں کی ضرورت یقینا کم ہو جائے گی اور اس کے ساتھ بحری جہازوں کے بارے میں صرف انہی ممالک کی مرضی چلے گی جو خام مال پیدا کرتے ہیں۔

اس کے علاوہ مزدوروں کی بڑھتی ہوئی تنخواہوں اور یونین بازیوں نے بھی مال کی آمد ورفت کا نقشہ بدل دیا ہے۔ بچپن میں ایک کہاوت پڑھی تھی۔

To Carry Coal to New Castle

یعنی ایک چیز کو وہاں لے جانا جہاں وہ پہلے ہی وافر مقدار میں ہو اور سستی بھی ملتی ہو۔ دوسرے الفاظ میں بے وقوفی کا کام کرنا۔ لیکن اب یہ سن کر آپ کو حیرت ہوگی کہ نیوکیسل یعنی برطانیہ والے آسٹریلیا سے کوئلہ منگوانے لگے ہیں۔ اس لئے نہیں کہ وہاں کی کانیں کوئلے سے خالی ہوگئی ہیں۔ اس لئے کہ برطانوی کوئلے کی کانوں میں کام کرنے والے مزدوروں کی تنخواہیں بڑھانے کے ساتھ دیگر مطالبات اس قدر بڑھ گئے ہیں کہ برطانیہ کو آسڑیلیا یا چین سے کوئلہ منگوانا سستا پڑتا ہے۔

آپ مذہب کو بیچ میں لائیں گے

ورلڈ میری ٹائم یونیورسٹی میں انتظامی امور کی تدریس کرنے والے اسی سالہ فرانسیسی پروفیسر نے جہاز راں کمپنیوں کے نقصانات پر لیکچر دیتے ہوئے ہم سے سوال کیا۔ "جہاز رانی کو نقصان سے بچانے کے لئے کیا ضروری ہے؟"

"سر اچھے اور تیز رفتار جہاز۔" اگلی قطار میں ٹیونیشیا کے بحری جہازوں کے چیف انجینئر نے جواب دیا۔

"اور کچھ؟" پروفیسر اس سے بہتر جواب کی تلاش میں تھا۔

"اٹھانے کے لئے زیادہ سے زیادہ سامان۔" ایک اور طالب علم نے جواب دیا۔

"کوئی اور"

"سر میں بتاؤں۔" نائیجر کے علی جمبا نے اجازت مانگی۔

"وقت ضائع نہ کریں جلد بتائیں۔" پروفیسر نے کہا۔

"سر ایسے ملک جہاں کے افسر اور خلاصی کم تنخواہ لیں' کام زیادہ کریں مگر نخرے کم کریں۔"

پروفیسر کو مزید بہتر جواب کی ضرورت تھی۔ انہوں نے ہال کے دوسرے کونے کی طرف نظریں دوڑانی شروع کیں۔ وہاں سے ملاوی کے ماہر اقتصادیات مسٹر چیزالی جواب کے لئے کھڑے ہوئے۔

"سر اچھی بندرگاہ جہاں جہاز کو زیادہ دن نہ کھڑا ہونا پڑے۔"

ہم سب ہنسنے لگے اس لئے نہیں کہ جواب درست نہیں تھا بلکہ اس لئے کہ یہ جواب ایسے ملک کے باشندے کی طرف سے تھا جو افغانستان کی طرح سمندر سے محروم ہے۔

"مثال کے طور پر ملاوی کی بندرگاہ۔" ترکی کے بحری انجینئر حسن بقال نے طنز کیا۔

پروفیسر نے اب انتظار کئے بغیر خود ہی جواب بتانے میں عافیت سمجھی۔ "جہاز ہو چاہے کوئی ہوٹل یا کارخانہ۔ اچھے کاروبار کے لئے اچھی انتظامیہ ضروری ہے۔ اچھے منیجر پر خرچ کرنے پر کبھی نہیں گھبرانا چاہیے۔"

"سر ایمانداری اور خوف خدا بھی تو ضروری ہے۔" ایک ایرانی بحری کپتان نے کہا۔

"ایمانداری، نیک نیتی، انصاف، محنت، کام کی پہچان، وقت کی پابندی یہ تمام خوبیاں ایک اچھے منیجر میں بدرجہ اتم موجود ہونی چاہئیں۔" پروفیسر نے مزید بحث سے بچنے کے لئے ایرانی کپتان کو بٹھاتے ہوئے کہا۔

ایک دن انہی پروفیسر صاحب نے "ایک کارکن کو کام میں دلچسپی لینے" یعنی Motivation کے عنوان پر لیکچر دینے سے قبل ہمیں بتایا کہ Motivation کیا ہے۔

"انسان کی ضروریات زندگی کو پورا کرنا۔" اس نے بتایا اور مزید سمجھانے کے لئے کہا، "ماسلو (Maslow) نام کے ایک عالم کی تحقیق کے مطابق انسان کی سب سے اولین ضرورت روٹی ہے۔ ایک بھوکے انسان کے لئے چاند ستارے، باغات اور دوسری خوبصورت اشیاء بے معنی ہیں۔ بھوک کے بعد دوسرا مسئلہ سلامتی اور حفاظت کا ہے۔ سماجی ضروریات ہیں اور پھر اس کے بعد ہر انسان معاشرے میں عزت چاہتا ہے۔ وغیرہ وغیرہ۔"

مراکش کی کسی بندرگاہ کے ڈائریکٹر عبدالوہاب نے ہاتھ اٹھایا۔

"آپ کچھ کہنا چاہتے ہیں؟" پروفیسر نے اپنے سفید اور لمبے بالوں کو سنوارتے ہوئے پوچھا۔

"جی ہاں! میں اس سے قطعی متفق نہیں ہوں۔" عبدالوہاب نے کہا۔

"کیوں متفق نہیں؟" پروفیسر نے پوچھا۔

"اس وقت نہیں بتا سکتا۔ ہال میں کئی خواتین بھی بیٹھی ہیں۔"

"ٹھیک ہے بیٹھ جاؤ میں آپ کی بات سمجھ گیا۔" پروفیسر صاحب نے اکتا کر مراکش کے نمائندے کو بٹھا دیا جس کے بعد ایک ایرانی کپتان کھڑا ہو گیا۔

"سر! انسان کے لئے روٹی، سلامتی یا عزت سے بھی زیادہ ایک اور چیز ضروری ہے۔"

پروفیسر نے کلائی پر بندھی گھڑی میں وقت دیکھا۔ انہیں اس دن اور بھی کئی اہم باتیں ہمیں بتانی تھیں اور وہ بحث کے موڈ میں بالکل نہیں تھے لہٰذا انہوں نے ایرانی نمائندے کا فلسفہ سننے کے بجائے اسے بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے کہا:

"برائے مہربانی آپ بیٹھ جائیں آپ ضرور مذہب کو بیچ میں لے آئیں گے۔"

درمیانی عمر کی خواتین

ایک دن یہاں سوئیڈن میں مقیم ہمارے پاکستانی دوست ممنون کو میں نے کہا۔"یار یہاں کی بوڑھی خواتین بسوں میں بڑا سفر کرتی ہیں۔ سارا دن بسوں میں چڑھتی اور اترتی رہتی ہیں۔" میرے ساتھ پورٹ قاسم کے چیف انجینئر احمد کمال علوی بھی تھے جو مجھ سے ایک سال قبل سوئیڈن آئے تھے۔ میری بات سن کر ان کو بھی اچانک اس بات کا احساس ہوا اور بولا۔ "ہاں یار! میں بھی سال بھر سے یہ دیکھ رہا ہوں کہ یہاں کی بسوں میں اسکول کے چھوٹے بچے چڑھتے ہیں یا پچاس ساٹھ سال سے بڑی عمر کی خواتین۔ لڑکیوں کا تو نام و نشان نہیں ہوتا۔"

"بالکل صحیح کہہ رہے ہو۔" ممنون نے ہمارے مشاہدے کی تائید کرتے ہوئے کہا۔ "درمیانی عمر کی خواتین اور لڑکیاں آپ کو شاذ و نادر بس میں سفر کرتی نظر آئیں گی۔ وہ اپنے کالجوں، دکانوں، کارخانوں یا دفاتر میں پیدل یا سائیکل پر پہنچتی ہیں۔ اس سے وہ نہ صرف پیسے بچاتی ہیں بلکہ اپنی صحت بھی برقرار رکھتی ہیں۔"

واقعی اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اس خطے کے ممالک میں سوئیڈن اور فن لینڈ کی خواتین کو اپنی فٹنس اور جسم کو ٹھیک ٹھاک رکھنے کی بہت فکر رہتی ہے۔ سینہ اور کمر کے ناپ میں ایک آدھ انچ ادھر ادھر ہو جائے یا کلو ڈیڑھ کلو وزن بڑھ جانے سے ان کی نیندیں حرام ہو جاتی ہیں۔ سوئیڈن میں آپ کو جو مہندی جیسے لال بالوں والی بھاری بھرکم خواتین نظر آتی ہیں وہ مقامی نہیں بلکہ پولینڈ کی ہیں یا سگریٹ کی راکھ کی طرح کے بالوں والی ایسٹونیا سے تعلق رکھنے والی خواتین نظر آئیں گی جو ملازمت یا محنت مزدوری کیلئے سوئیڈن میں آتی ہیں۔ ایسٹونیا نے متحدہ روس کے ٹوٹنے کے بعد صحیح معنوں میں آزادی حاصل کی ہے وہ فن لینڈ کے اتنا قریب ہے جتنا کوٹری حیدرآباد سے یا روہڑی سکھر سے۔ دن میں پچاس مرتبہ مختلف اقسام کی فیریاں مسافروں اور گاڑیوں کو لے کر فن لینڈ کی بندرگاہ ہیلسنکی سے ایسٹونیا کی بندرگاہ ٹالن آتی جاتی رہتی ہیں اور روزانہ ایسٹونیا سے کئی عورتیں سیاحتی ویزا پر فن لینڈ کے شہروں میں نوکری کی تلاش کرتی اور بھیک مانگتی رہتی ہیں۔ فن لینڈ کے امراءروسی کھانوں اور کاروباری دورے کے بہانے عیاشی کے لئے ایسٹونیا پہنچ جاتے ہیں جیسے ہمارے ملک کے کئی وڈیرے، سیاستدان، رشوت خور افسر اور عیاش لوگ سمندر اور خوبصورت ساحلی علاقوں کی سیر کے بہانے بنکاک (تھائی لینڈ) پہنچ جاتے ہیں اور واپسی پر اپنے لئے سفلیز اور ایڈز جیسی جنسی بیماریاں لے آتے ہیں۔

بہرحال ہم بات کررہے تھے جسمانی فٹنس کی۔ پولینڈ اور ایسٹونیا اِس خطے کے غریب ترین ملک ہیں۔ یہاں کا معاشرہ اور ثقافت ایسا ہے کہ دبلی پتلی لڑکی کو صحت مند یا سمارٹ نہیں بلکہ غریب گھر کا سمجھا جاتا ہے۔

ہمارے ملک میں بھی کئی گھرانوں میں موٹاپے اور نکلی ہوئی توند کو خوشحالی کی علامت سمجھا جاتا ہے۔ بہرحال اب لوگوں میں کافی حد تک اس کا شعور بیدار ہو چکا ہے کہ موٹاپا صحت نہیں بیماری ہے، اس لئے شہر کی اکثر تفریح گاہوں میں جاگنگ کرنے والوں کی تعداد میں اضافہ ہوتا جارہا ہے۔ ویسے ڈش چینل اور غیر ملکی ٹی وی پروگراموں سے دو فائدے ضرور ہوئے ہیں کہ لوگوں کو ایک تو یہ پتہ چل گیا ہے کہ پہلوان بننے کا دارومدار آٹھ مرغیاں یا دو بکرے کھانے پر نہیں ہے اگر ایسا ہوتا تو جاپانی پہلوان انوکی جو کھاتا کم جاگنگ زیادہ کرتا ہے، پہلوانی کی میدان میں اتنی کامیابیاں حاصل نہ کرتا جو اس نے کیں۔ دوسری بات یہ کہ ہمارے نوجوان اپنی صحت پر بہت توجہ دینے لگے ہیں ورنہ پرانا ریکارڈ تو یہ بتاتا ہے کہ ہماری فلمی صنعت سے وابستہ لوگوں کو بھی یہ معلوم نہیں تھا کہ اسمارٹ رہنے کیلئے دبلا ہونا ضروری ہے نہ کہ موٹاپا۔ آپ کوئی بھی پرانی فلم اٹھا کر دیکھیں تو ہماری فلمی دنیا کی پریاں جب تک کسی میز یا دیوار کی آڑ میں کھڑی ہوکر (جہاں سے ان کا صرف چہرہ نظر آسکے) گاتی ہیں تو بڑی بھلی لگتی ہیں لیکن سامنے آنے پر ایسا لگتا ہے جیسے اصلی دیسی گھی کی یا پائیدار اور مضبوط روسی ٹریکٹر کا کمرشل کر رہی ہیں۔

جوتوں کا خیال رکھیں

سوئیڈن میں چنگیز تیمورلوو اسی چھ منزلہ عمارت میں رہتا تھا جس میں ہم لوگ رہائش پذیر تھے۔ اسی لئے اس سے صبح کے وقت یونیورسٹی کے علاوہ شام کے وقت بھی ملاقات ہوتی رہتی تھی۔

چنگیز آذربائیجان کے شہر باکو سے آیا تھا۔ اس نے اسکول میں روسی زبان سیکھی، ویسے اس کی مادری زبان ترکی ہے۔ شاید اس لئے وہ اور ترک چیف انجنیئر حسن بقال اچھے دوست بن گئے تھے اور آپس میں ہر وقت ترکی زبان میں بات کرتے تھے۔ یہ دونوں ہم سے چھ مہینے پہلے سوئیڈن پہنچے تھے اور ہمارے پہنچنے اور ایم ایس سی کی کلاسیں شروع ہونے سے قبل انہوں نے سوئیڈن میں ہی انگریزی سیکھی تھی۔ اپنی انگریزی بہتر بنانے کے لئے ہر وقت انگریزی جاننے والوں سے انگریزی میں گفتگو کرتے رہتے تھے۔

ایران، ترکی اور پاکستان کے اچھے تعلقات ہونے کی وجہ سے ہماری پہلے دن ہی سے بغیر کسی تعارف کے ترکی کے حسن بقال سے دوستی ہوگئی۔ اسی نے ہمیں اپنے آذربائیجانی دوست چنگیز سے ملایا۔ چنگیز اپنے ملک کی کسی جہاز ران کمپنی کا ماہر اقتصادیات تھا۔ یہاں جنرل مینجمنٹ اور ایڈمنسٹریشن میں ایم ایس سی کرنے آیا تھا سیاست اور تاریخ سے متعلق کافی معلومات رکھتا تھا۔ انگریزی اچھی نہ ہونے کے باوجود وہ کئی باتیں ہمیں سمجھاتا تھا اور زبردست حقیقت پسند تھا۔ ایک دن کہنے لگا "کمیونزم کے دور میں روسی ہمارے ملک پر چھائے ہوئے تھے اور ہمارا خون چوستے رہتے تھے۔ ہمیں مذہبی آزادی تک نہیں دی ہوئی تھی لیکن ایک بات ہے کہ اس وقت امن و امان کی صورت حال آج سے کہیں زیادہ بہتر تھی۔ تعلیمی معیار بھی بلند تھا اور غریب کا بچہ بھی اگر ذہین تھا تو اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کی امید رکھ سکتا تھا۔ آج آزاد ہوتے ہوئے بھی ہمارا تعلیمی معیار ویسا نہیں ہے۔ ہر کام سفارش اور رشوت کے ذریعے ہو رہا ہے۔ یہاں اب صرف دولت مند کے مزے ہیں، چاہے اس کی تعلیمی قابلیت کچھ بھی نہیں ہے۔"

چنگیز کا سوشلسٹ ممالک سے باہر آنے کا یہ پہلا موقع تھا۔ اسے سوئیڈن بہت پسند تھا لیکن اکثر مہنگائی کی شکایت کرتا تھا۔ "میں نے سگریٹ اس لئے کم نہیں کئے کہ اس سے میری صحت متاثر ہورہی ہے بلکہ اس لئے کہ یہاں سگریٹ انتہائی مہنگے ملتے ہیں۔" چنگیز نے بتایا پھر اپنے گول مٹول اور بھاری بھرکم جسم کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "سگریٹ میرا بگاڑ ہی کیا سکتی ہے۔" اور پھر خود ہی زور زور سے ہنسنے لگا۔ چنگیز ہر وقت ہنستا اور لطیفے سناتا رہتا تھا۔ وہ کوئی سنجیدہ بات کرتا تو بھی اس کے انگریزی بولنے کے انداز پر سننے والے کو ہنسی آجاتی تھی۔

چنگیز کو نت نئے کپڑے پہننے کا بہت شوق تھا۔ وہ ہر وقت موقع کی تلاش میں رہتا تھا کہ کہیں کسی سیل میں کپڑے بکیں تو وہ انہیں اپنے ملک میں پہننے کے لئے خریدے۔ بقول ان کے سوئیڈن میں صرف گرم کوٹ کبھی کبھی سستے ہوتے ہیں اس کے علاوہ ہر چیز مہنگی ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ سوئیڈن جیسے ملکوں میں آنے والوں کو چاہیے کہ وہ ہر چیز اپنے ملک سے لے آئیں کیونکہ سوئیڈن اور ناردے جیسے ممالک میں ونڈو شاپنگ کرتے ہوئے بھی ڈر لگتا ہے۔ اللہ نہ کرے کہ کسی کا یہاں آکر چشمہ ٹوٹ جائے یا جوتا پھٹ جائے۔ نظر کا ٹیسٹ کروانا اور صرف ایک عینک خریدنے پر اتنا خرچ آجاتا ہے جتنے میں آپ اپنے ملک میں دس چشمے خرید سکیں۔ جوتا تو اور بھی مہنگا ہے۔ پھٹے ہوئے جوتوں کی مرمت کروانا اور بھی مشکل کام ہے جس کے لئے موچی سے پیشگی وقت لینا پڑتا ہے۔ یہاں کا موچی جوتا گانٹھنے والا کم اور سرجن زیادہ لگتا ہے اور بقول ہماری ایک ساتھی مسز تھائی دھائی

کے جو تھائی لینڈ کی ایک جہازران کمپنی کی ڈائریکٹر ہیں اتنے پیسوں سے تو ہمارے ملک میں ہر نیا اور DNC جیسا چھوٹا موٹا آپریشن ہو جاتا ہے۔

ویسے یہ ایک حقیقت ہے کہ سوئیڈن میں اگر کوئی چیز سستی ہے تو وہ برف ہے جو دن رات گرتی رہتی ہے۔

ایک دن کیپٹن سلیم قاسم میرے پاس آیا کہ وہ کئی دنوں سے مکھن کو مارجرین سمجھ کر کھاتا رہا ہے اور اب اس کی صحت کے لئے یہی بہتر ہے کہ وہ زیادہ سے زیادہ پیدل چلے۔

سوئیڈن آنے سے پہلے کیپٹن سلیم کا کراچی میں دل کا آپریشن ہوا تھا اور ڈاکٹر نے انہیں کھانے پر کنٹرول اور پیدل چلنے کا مشورہ دیا تھا۔ ویسے سوئیڈن کے ماحول کے مطابق ہم سب لوگ پیدل چلتے تھے اور موسم کے لحاظ سے بھی سوئیڈن میں پیدل چلنے میں بڑا مزہ آتا ہے۔ یہاں کی حکومت نے پیدل چلنے والوں کے لئے ہر جگہ الگ راستے بنوا رکھے ہیں جو اکثر پارکوں کے بیچ میں سے گزرتے ہیں اور پیدل چلنے یا سائیکل پر سفر کرنے میں مزا آتا ہے۔ لیکن کیپٹن سلیم کی یہ خواہش تھی کہ گھر سے یونیورسٹی اور شام کو واپس بس کے ذریعے آنے کی بجائے پیدل چلنا چاہیے۔ کچھ دنوں سے تو وہ اکیلے ہی پیدل چلتا رہا پھر مجھے کہا کہ میں اسے کمپنی دینے کیلئے اس کے ساتھ پیدل چلا کروں۔ جس پر میں نے جواب دیا کہ "یار یہ تو زیادتی ہے۔ یہ آپ ہی کی ہمت ہے کہ اتنا پیدل چل سکتے ہیں صرف ایک جانب کا راستہ بھی تقریباً پانچ میل بنتا ہے۔"

"لیکن میرے لئے تو یہ بہت اچھا ہے کیونکہ یہی ایک طریقہ ہے جس سے میری چربی پگھل سکتی ہے۔" کیپٹن سلیم نے کہا۔

"اتنا پیدل چلنے کے لئے تو شاید ہی آپ کا کوئی ساتھ دے سکے۔" میں نے انہیں سمجھایا لیکن اسی وقت مجھے آذربائیجان کا موٹا چنگیز یاد آگیا جو وزن کم کرنے کے بارے میں کبھی کبھی پوچھتا رہتا تھا۔

"یار سلیم آپ اس سلسلے میں چنگیز سے بات کیوں نہیں کرلیتے۔" میں نے اسے مشورہ دیا۔ چنگیز ہمیں کینٹین میں مل گیا۔ "چنگیز! سلیم کا ایک چھوٹا سا کام ہے۔" میں نے چنگیز سے کہا اور چنگیز نے سلیم کی طرف منہ کرکے کہا "سر آپ حکم کریں۔ میں چھوٹا کیا بڑے سے بڑا کام کرنے کو بھی تیار ہوں۔"

سلیم نے انہیں اپنی مجبوری بتائی اور پیدل چلنے میں ساتھ دینے کے لئے بات کی۔ پیدل چلنے کی بات سن کر وہ سوچ میں پڑگیا۔ سگریٹ کا ایک طویل کش لینے کے بعد اس نے سلیم کو سر سے پاؤں تک غور سے دیکھا۔ ایسا لگا جیسے سلیم کی انگریزی اس کے پلے نہیں پڑی یا جو کچھ چنگیز نے سنا اس پر اسے یقین نہیں آیا۔ کافی دیر کے سکوت اور چنگیز سے جواب نہ ملنے پر کیپٹن سلیم نے پھر کہا کہ "میری بات آپ سمجھ گئے یا میں سلیس انگریزی میں بولوں؟"

چنگیز نے سگریٹ کا ایک اور کش لگایا پھر سلیم کے گلے میں بانہیں ڈال کر بڑے پیار سے پوچھا۔ "میرے بھائی مجھے یہ تو بتاؤ کہ تم اتنا پیدل کیوں چلنا چاہتے ہو؟"

"مجھے اپنی صحت کی بڑی فکر ہے۔" کیپٹن سلیم نے جواب دیا۔

چنگیز پھر کسی گہری سوچ میں ڈوب گیا لیکن جلد ہی خود کو حقیقت کے ساحل پر لے آیا۔ کیپٹن سلیم کو گلے لگا کر بڑے پیار سے ہمدردانہ لہجے میں بولا۔

”میرے دوست! سوئیڈن جیسے مہنگے ملک میں اپنی صحت سے زیادہ اپنے جوتوں کا خیال رکھیں۔کیا آپ کو معلوم نہیں کہ یہاں جوتے پھٹ جانے یا ان کے تلوے گھس جانے پر ان کی مرمت پر کتنا خرچہ آتا ہے۔“

اور پھر ناک رگڑ کر کانون کو ہاتھ لگاتے ہوئے کہا ”یار میرا دل بہت کمزور ہے۔ اگر پیدل چلتے ہوئے کسی روز میرا جوتا پھٹ گیا تو مارے صدمے کے میرا دل بھی بیٹھ جائے گا۔“

فیصلہ آپ کیجئے

لندن میں میرے ٹائم کے عالمی ادارے (آئی ایم او) کے اجلاس کے دوران میرے قریب بیٹھے ہوئے ایک یورپی عالم سے میری اس بات پر بحث ہوئی کہ ہمارے ممالک کوشش کے باوجود اتنی ترقی کیوں نہیں کرتے جتنی یورپی ممالک کررہے ہیں۔کچھ دیر سوچنے کے بعد وہ کہنے لگا۔ ”اس کا جواب میرے پاس ہے لیکن میرا جواب کس حد تک صحیح ہے یا غلط، یہ فیصلہ آپ کیجئے گا۔ ایشیا اور افریقہ کے کئی ترقی پذیر ملکوں کی حکومتیں اپنے پڑھے لکھے یا قابل لوگوں سے فائدہ نہیں اٹھاتی۔“

"پہلی بات تو سرکاری اور نیم سرکاری اداروں کے اعلیٰ افسر ماتحت عملے کو اعلیٰ تعلیم یا تربیت پر جانے کا موقع نہیں دیتے۔ اقوام متحدہ جیسے عالمی اداروں کی جانب سے دی گئی وظیفے کی پیشکشیں یونہی ضائع ہو جاتی ہیں لیکن اعلیٰ حکام اپنے ماتحت عملے کو اس لئے وہاں نہیں بھیجتے کہ وہ کہیں ان سے زیادہ نہ پڑھ لکھ جائیں اور خود اس خوف سے نہیں جاتے کہ کہیں ان کی غیرموجودگی میں کوئی ان کے عہدے پر قابض نہ ہو جائے۔"

"اور پھر خوش قسمتی سے کوئی نوجوان اعلیٰ تعلیم یا کوئی ہنر سیکھ کر واپس آتا ہے تو اس کی قابلیت کو ادارے کے مفاد میں استعمال کرنے کی بجائے ضائع کر دی جاتی ہے۔ اعلیٰ تعلیم یافتہ نوجوان کو اس کی قابلیت کے مطابق کوئی عہدہ دینے کی بجائے اس کو کسی کونے میں بٹھا کر ایسا کام دے دیا جاتا ہے جس میں اس کی تعلیم اور تجربہ کام نہیں آتا۔ وہ نمایاں حیثیت حاصل کرنے کی بجائے دن بدن گمنامی میں چلا جاتا ہے اور حاصل کی ہوئی تعلیم اور تجربہ رفتہ رفتہ بھلاتا جاتا ہے۔ یا پھر اس پر الٹے سیدھے کاموں کا اتنا وزن لاد دیا جاتا ہے کہ ان کو انجام نہیں دے سکتا جس کے بعد اسے ذلیل و خوار کر دیا جاتا ہے اور یہ باور کرانے کی کوشش کی جاتی ہے کہ تم جو خود کو بڑی توپ چیز سمجھتے ہو یہ معمولی کام بھی نہیں کر سکتے۔"

"یا پھر اسے کام بالکل نہیں دیا جاتا۔ دوسرے الفاظ میں وہ ہوا کھاتا رہے۔ چپ چاپ بیٹھے ہوئے اسے نیند آنے لگتی ہے یا اپنی کرسی چھوڑ کر ادھر ادھر دوسروں سے ملنے لگتا ہے۔ اس پر سینئر افسر ہر ایک کو یہ کہہ کر اسے ذلیل کرنے کی کوشش کرنے لگتا ہے کہ خود کو قابل سمجھتا ہے یہ نوکری کیا کرے گا اس سے تو اپنی کرسی پر ہی بیٹھا نہیں جاتا۔"

دن رات کا پتہ کیسے چلے

خط استوا (Equator) زمین کا وہ فرضی خط (لکیر) ہے جو ارضی محور پر عموماً واقع ہے اور زمین کو شمالی (Northern) اور جنوبی (Southern) نصف کروں (Hemispheres) میں تقسیم کرتا ہے۔

ملائیشیا، انڈونیشیا، سنگاپور، کینیا، کانگو، ایکواڈور، کولمبیا جیسے ممالک جو خط استوایا اس کے قریب ہیں وہاں سورج کی شعاعیں سیدھی پڑتی ہیں جس کی وجہ سے وہاں سارا سال گرمی رہتی ہے۔ ان ممالک میں ہمارے ملکوں کی طرح (جو خط استوا سے خاصے فاصلے پر واقع ہے) جاڑے یا بہار جیسے موسم کا کوئی تصور نہیں ہے۔ اسی لئے پورا سال نہ کسی کوٹ یا سوئٹر کی ضرورت پڑتی ہے نہ کسی لڑکی یا لڑکے کا نام بہار ہوتا ہے۔ ان ملکوں میں سال بھر دن رات تقریباً برابر ہوتے ہیں۔ خط استوا سے جتنا دور جائیں گے سردیوں کے موسم میں دن چھوٹے اور راتیں بڑی ہو جائیں گی۔ اور قطبین کے قریب تقریباً 24 گھنٹے کی رات ہو جاتی ہے اور گرمیوں کے موسم میں دن اتنے ہی لمبے ہو جاتے ہیں۔ ایک اور بات کہ خط استوا پر واقع ممالک میں سورج غروب ہوتے ہی ایک دم اندھیرا چھاجاتا ہے۔ ہمارے ملکوں کی طرح افق پر سرخی نہیں رہتی اور نہ صبح کے وقت سورج طلوع ہونے سے پہلے ہلکی روشنی رہتی ہے جو ہمارے ملک میں فجر سے پہلے ہوتی ہے اور طلوع سحر، صبح صادق، سپیدہ سحر، پو پھوٹنا جیسے مراحل سے گذرکر سورج کی روشنی کرنوں کی صورت زمیں پر پھیل جاتی ہے۔ آپ خط استوا سے جتنا دور اور قطبین کے قریب ہوتے جائیں گے اتنا ہی یہ سلسلہ بڑھتا چلا جائے گا۔ قطبین کے بالکل قریب سال کے بعض ہفتے ایسے بھی ہوتے ہیں جن میں مستقل دن رہتا ہے۔ ایک خیال سے صحیح لفظ دن، تو نہیں البتہ، روشنی، کہہ سکتے ہیں۔ یعنی کہ 24 گھنٹے روشنی رہتی ہے۔ غروب آفتاب کے بعد بھی کافی دیر تک روشنی رہتی ہے اور اس کے بعد رات کے اندھیرے کا ہلکا سا اشارہ ملتے ہی صبح صادق کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے اور سورج طلوع ہوتا ہے۔ اسی طرح موسم خزاں میں مسقل رات یعنی اندھیرے کا سلسلہ رہتا ہے۔ صرف لمحے بھر کے لئے ہلکی سی روشنی ہوتی ہے اور پھر غائب ہو جاتی ہے۔

مجھے قطب شمالی کے بالکل قریب رہنے کا اتفاق نہیں ہوا لیکن سوئیڈن میں قیام کے دوران مجھے تحقیقی کام اور فیلڈ ورک کے سلسلے میں سوئیڈن اور شمالی ناروے کے ان شہروں میں رہنا پڑا جو قطب شمالی کے کافی قریب ہیں۔ اس سے پہلے بحری جہاز کے چیف انجینئر کی حیثیت سے مجھے اپنے بحری جہاز میں ناروے کی ایک شمالی بندرگاہ ٹرنڈ ھام میں دو تین مرتبہ جانا پڑا، جہاں جون جولائی میں بھی برف باری ہو رہی تھی اور ہم پاکستان سے گوار کی پھلی کا پاوڈر (Gowar Meal) اور کھل بنولہ (Oil Cake) سے جہاز بھر کر وہاں پہنچے تھے۔ جسے وہ لوگ دوسری چیزوں میں ملاکر گائے بھینسوں کے لئے چارہ بناتے ہیں جس کی برف باری کی وجہ سے وہاں سخت قلت رہتی ہے اور سردی کی وجہ سے خود اگا نہیں سکتے۔

ایسے مقامات پر رہنے کا تجربہ بڑا اچھا دہا۔ سردیوں کے موسم میں دن بہت ہی چھوٹا ہوتا ہے اور سورج، گھنے بادلوں اور برف باری کی وجہ سے نظر نہیں آتا۔ اگرکسی روز سورج کی جھلک دیکھ لی جاتی تو لوگ اس کو بڑا اچھا دن تصور کرتے ہیں۔ بہر حال اخبارات اور ٹی وی سے معلوم ہوتا تھاکہ سورج دس ساڑھے دس بجے طلوع ہوکر دو ڈھائی بجے غروب ہوتا ہے۔ ہمارا دفتری وقت ہماری اصطلاح کے مطابق صبح 9 بجے ہوتا تھا (لیکن

اس وقت رات ہوتی تھی کیونکہ سورج آفس پہنچنے کے ایک ڈیڑھ گھنٹے بعد طلوع ہوتا تھا) اور دفتر سے واپسی شام کو (بلکہ رات کو) پانچ بجے ہوتی تھی۔ پانچ بجے رات (یعنی اندھیرا) اس لئے ہوتا تھا کیونکہ سورج دو بجے ہی غروب ہوجاتا تھا۔ سردیوں کے دنوں میں ان جگہوں پر نماز پڑھنے میں بڑا مزہ آتا ہے۔ ایک ہی وضو میں پانچوں نمازیں ہوجاتی ہیں۔ دفتر پہنچ کر گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ کام کرتے تھے اس کے بعد سامنے والے کمرے سے پہلے ایران کا کیپٹن شہریار جو اہل تشیع تھا فجر کی نماز کے لئے اٹھتا تھا اور اردنی بحری انجینئر عبدالکریم ہلکی سی سیٹی مار کر مجھے خبردار کرتا تھا کہ وضو کرنا ہے تو کرلو تھوڑی دیر کے بعد فجر کی نماز کے لئے اٹھنا ہے۔ ہم دونوں چائے پینے کے بعد مخصوص کمرے میں نماز پڑھتے تھے۔ تقریباً ایک ڈیڑھ گھنٹے کے بعد (بارہ بجے کے قریب) نماز ظہر پڑھتے تھے۔ ایک گھنٹے بعد عصر اور اس کے بعد مغرب، 5بجے آفس چھوڑنے سے ایک آدھ گھنٹہ پہلے عشاءکی نماز پڑھتے تھے یعنی ساری نمازیں دفتری اوقات میں ہی ہوجاتی تھیں۔

دفتر سے گھر واپس آنے کے بعد ہم یا تو شہر چلے جاتے تھے جہاں سات بجے تک دکانیں کھلی رہتی تھیں اور وہی رونق ہوتی حالانکہ اس وقت یعنی شام کو سات بجے تک رات گزرے چار پانچ گھنٹے ہوچکے ہوتے ہیں۔ صبح کو بچے تو ہم سے بھی ایک ڈیڑھ گھنٹہ پہلے (یعنی ساڑھے سات بجے) اسکول جارہے ہوتے تھے۔ اور اس وقت گھٹا ٹوپ اندھیرا ہوتا تھا۔ لیکن وہ ہاتھوں میں ٹارچ اور کتابوں کے بستے پر چمک پٹی لگائے اسکول جاتے۔ اسکول بیگ پر چمک پٹی اس لئے ضروری ہوتی ہے تاکہ پیچھے سے آنے والی گاڑی کی روشنی ان پر پڑنے سے ڈرائیور خبردار ہوجائے کہ سڑک پر بچے گزر رہے ہیں جیسے ہمارے ملک میں لوگوں نے گدھے گاڑیوں اور سائیکلوں پر چمک پٹیاں لگا رکھی ہوتی ہیں۔

جون جولائی میں وہاں الٹا حساب ہے۔ راتیں بالکل چھوٹی بلکہ یوں کہہ لیں کہ نہ ہونے کے برابر اور دن بڑے ہوتے ہیں۔ ایک دفعہ اُن دنوں ہمارا جہاز ٹرنڈھام (ناروے) پہنچا تو رمضان المبارک شروع ہوچکا تھا اور ٹرنڈھام میں تقریباً بائیس گھنٹے کا روزہ رکھا۔ ٹرنڈ ھام میں رہنے والے پاکستانی لوگ ناروے کے بارے میں بتاتے ہیں کے ایک شہر شاید کرونا جو مزید شمال میں ہے جہاں دن اس سے بھی بڑا ہوتا ہے۔ بہر حال ان دنوں ایسی جگہوں پر قیام کے دوران دفتر سے 5 بجے نکلتے وقت شام کا نہیں بلکہ دوپہر کا سماں لگتا ہے۔ دکانیں اپنے مقررہ وقت پر سات بجے بند ہو جاتی ہیں اور لوگ اپنے اپنے گھروں کو روانہ ہوجاتے اور بازار سنسان ہوجاتے ہیں۔ لگتا تھا شہر کو کوئی سانپ سونگھ گیا ہے لیکن سورج کی دھوپ اور روشنی سے لگتا تھا کہ شام کے چار بجے ہیں۔ رات کا کھانا کھا کر دس گیارہ بجے جب سوچکے ہوتے اس وقت سورج غروب ہوتا تھا۔ کئی مرتبہ شام کو نو بجے سوجاتے تھے اور پھر گیارہ ساڑھے گیارہ بجے اٹھ کر مغرب اور عشاءکی نماز پڑھتے تھے اور تقریباً ایک آدھے گھنٹے کے بعد (کوئی ایک بجے) یعنی آدھی رات کو فجر کا وقت ہوجاتا تھا اور اس کے بعد کمرے کے موٹے پردے کھینچ کر سوجاتے تھے اور چھ سات گھنٹے بعد اٹھ کر آٹھ بجے جب ناشتے کیلئے جاتے تھے تو سورج اس قدر اوپر آچکا ہوتا جیسے دوپہر ہوگئی ہو۔ ایسی جگہوں پر سوائے روزہ نماز کے ہر چیز گھڑی کی سوئیوں کے مطابق ہوتی ہے۔ گرمی کے دنوں میں کبھی کبھی میری آنکھ جلد کھل جاتی تھی۔ کھڑکی کا پردہ ہٹانے سے چاروں طرف دھوپ دیکھ کر ایسا لگتا تھا جیسے دن کے گیارہ بجے ہوں لیکن 5 بج رہے ہوتے تھے۔ اور تمام دکانیں بند ہوتی تھیں۔

ایسے موسم میں جب سورج رات کے دس گیارہ بجے غروب ہوتا اور صبح کے دو بجے طلوع ہوتا ہے تو ہمارے ملک سے کسی کی آنکھوں پر پٹی باندھ کر سوئیڈن یا ناروے کے کسی بازار میں صبح کے چھ بجے لاکر کھڑا

کردیں اور پٹی ہٹائیں تو وہ حیران رہ جائے گا کہ یہ کیا ماجرا ہے کہ دوپہر ہونے کو ہے لیکن دکانیں بند ہیں اور سڑک پر کوئی آدم ہے نہ آدم زاد۔ کتے اور بلیاں تک سو رہے ہوتے ہیں۔ ہمارے ملک میں دن اس وقت ہوتا ہے جب سورج طلوع ہوتا ہے اور لوگ کام پر جانے کیلئے نکلتے ہیں جبکہ رات اس وقت ہوتی ہے جب سورج غروب ہوتا ہے۔ لیکن قطبی ممالک میں ہر چیز گھڑی کی سوئیوں کے مطابق ہوتی ہے۔ صبح کے آٹھ بجے دن شروع ہو جاتا ہے چاہے موسم سرما میں اس وقت گھٹا ٹوپ اندھیرا ہو اور آسمان پر چاند ستارے موجود ہوں یا موسم گرما میں سورج نصف النہار ہو۔ اس طرح شام کے نو بجے رات سمجھی جاتی ہے اور سب کو سو جانا چاہیے۔ چاہے گرمیوں کے دن ہوں جب سورج کوئی گیارہ بجے غروب ہوتا ہے۔ ملائیشیا کی طرح ان ممالک میں رہنے کا تجربہ بھی عجیب ہوتا ہے۔ میرے ایک بنگالی ساتھی کیپٹن امین سے ابتدائی دنوں میں جب میں نے پوچھا۔

"سوئیڈن میں بغیر گھڑی دیکھے کیسے پتہ چلے کہ اس وقت دن ہے یا رات؟"

جواب میں اس نے کہا۔

"کھڑکی کا پردہ ہٹا کر دیکھ لیا کرو۔ اگر دکانیں کھلی ہیں تو دن ہے اگر بند ہیں تو سمجھو رات ہے۔"

پنجابی بھی سیکھ جائیں گے

سوئیڈن میں دو سال قیام کے دوران ایک دفعہ عید ملن پارٹی میں بھی شرکت کرنے کا موقع ملا جس کا اہتمام مالمو میں رہنے والے پاکستانیوں نے ہمیشہ کی طرح جاگیر سرو روڈ پر واقع ایک عمارت میں کیا تھا جو بلدیہ مالمو کی ملکیت ہے اور ایسی دعوتوں کے لئے کرائے پر مل جاتی ہے۔

پاکستان ایسوسی ایشن کے جنرل سیکریٹری سرتاج نے جو کمپیوٹر پر چھپا ہوا دعوت نامہ بھیجا تھا اس میں پہنچنے کا وقت چار بجے تھا۔ مالمو میں مقیم مسعود صاحب مجھے اور میرے دیگر پاکستانی جہاز راں دوستوں کو دعوت کے لئے پانچ بجے لینے کے لئے آئے اور جب ساڑھے پانچ بجے وہاں پہنچے تو سوائے ڈینٹل سرجن محمود کے کوئی نہیں تھا۔ اس کے بعد آہستہ آہستہ سوئیڈن میں رہنے والے پاکستانی بھائیوں نے آنا شروع کیا۔ نو بجے کھانا لگایا گیا اور دس بجے کے قریب جب لوگ کھانا کھا کر نکل رہے تھے تو اس وقت بھی کچھ مہمان خراماں

خرماں آرہے تھے۔ ایسو سی ایشن کے سارے عہدیدار آخر تک مہمانوں کو کھانا کھلانے اور خدا حافظ کہنے میں مصروف رہے۔

وقت کی پابندی نہ کرنا ہم پاکستانیوں کے لئے غیر معمولی یا حیرت انگیز بات نہیں ہے۔ لیکن مجھے تھوڑا سا دکھ ضرور ہوا کہ سوئیڈن جیسا ملک جہاں ایک سرکاری بس کا ایک منٹ دیر سے پہنچنا بھی بُرا سمجھا جاتا ہے اور جس ملک کی پابندئ وقت کی مثالیں دنیا دیتی ہے، وہاں پر بھی ہم پاکستانیوں کا حال وہی ہے۔ حالانکہ آج کل ڈش اور انٹر نیٹ کی دنیا نے تو محراب پور اور میرپور ماتھیلو کے لوگوں کو بھی وقت کی قدر کرنا سکھا دیا ہے، یہ تو یورپ کے کچھ زیادہ ہی سدھرے ہوئے ملک سوئیڈن کا، حد سے زیادہ جدید شہر مالمو تھا۔

بہر حال وقت کی پابندی نہ کرنے کا سارا الزام ان لوگوں پر نہیں لگایا جاسکتا کیونکہ جس دن دعوت دی گئی اس روز عام تعطیل نہیں تھی اس لئے آنے والے لوگ اپنی فیکٹریوں اور کارخانوں میں دن کی یا شام کی شفٹ کرکے آرہے تھے کئی لوگ تو دور دراز کے گاؤں سے دو دو تین تین بسیں تبدیل کرکے پہنچ رہے تھے۔ میرپور، چیچہ وطنی، خانیوال، ملتان کی مضافات سے برسوں سے یہاں آئے ہوئے یہ لوگ یہاں بھی دیہات میں یا شہر سے دور، کارخانوں کے قریب رہتے ہیں جہاں وہ محنت مزدوری کرکے اپنا اور اپنے بچوں کا پیٹ پالتے ہیں۔ سوئیڈن میں پڑھے لکھے اور پیسے والے پاکستانیوں کی تعداد بہت ہی کم ہے۔ زیادہ تر لوگ ان پڑھ اور مزدور طبقے سے تعلق رکھتے ہیں۔

جہاں ہمارے بیٹھنے کا انتظام تھا وہ ہال انگریزی حرف L کی شکل کا تھا۔ اسی ہال میں خواتین کے الگ بیٹھنے کا بندوبست بھی تھا۔ ہمارے پہنچنے کے بعد مہمانوں کی آمد شروع ہوگئی جن میں ارکان سے زیادہ ان کے بچے شامل تھے اور اسی رفتار سے شور و غل بڑھتا گیا۔ بچے پہلے خاموشی سے لان میں دوڑتے رہے پھر ان کے چیخنے چلانے کی آوازیں آنے لگیں پھر آپس میں جھگڑے شروع ہوگئے اور شکایتوں کیلئے وہ روتے ہوئے اپنی ماؤں کے پاس آنے لگے۔ فلاں مجھے یہ کہتا ہے، فلاں نے مجھ سے یہ چھین لیا، فلاں نے مجھے پتھر مارا، نہیں آنٹی پہلے اس نے مجھے گالی دی، پھر میں نے پتھر مارا۔۔۔ وغیرہ وغیرہ۔ بس بڑے بچوں کی دوڑیں اور چیخیں تھیں تو چھوٹے بچوں کا دودھ کے لئے رونا دھونا۔ بچوں سے زیادہ مائیں پریشان تھیں۔

اور پھر آہستہ آہستہ شاید تھکن کی وجہ سے بچوں کے دوڑنے اور چیخنے کی رفتار میں کمی آنے لگی جیسے کسی کار کی بیٹری کام چھوڑ دے جس کے باعث لائٹ جلے نہ ہارن بجے۔ اب دوڑنے، پتھر مارنے اور چیخنے چلانے کے بجائے بچوں کا سارا زور پانی کے کولر پر تھا یا ٹوائلٹ پر۔ ہر بچہ سب سے پہلے اور بار بار پانی پینا چاہتا تھا اور یہی حال ٹوائلٹ میں جانے کا تھا۔ ان ممالک میں پانی مشکل سے ملتا ہے زیادہ تر کوکا کولا اور چائے یا کافی چلتی ہے۔ یہ بھی اللہ بھلا کرے ممنون صاحب کا جنہوں نے دور اندیشی سے کام لے کر خرچہ بچانے کی خاطر ایک بڑا کولر پانی سے بھروا کر لے آیا تھا جس سے بچے پلاسٹک کے گلاسوں سے پانی بھر بھر کر پی رہے تھے (اور ضائع بھی کر رہے تھے) ورنہ بچوں کے والدین کو یا مہمانوں کو گھر کے دروازے کے پاس لگی ہوئے وینڈنگ باکس میں پیسے ڈال کر کوک یا کافی نکالنا پڑتی اور اس ملک میں کوکا کولا، سیون اپ جیسے مشروبات بیئر سے بھی مہنگے ہیں۔ کچھ بچے ٹوائلٹ میں سے چیخ چیخ کر ماؤں کو بلاتے رہے اور کچھ مائیں ٹوائلٹ کے باہر بچوں کو لٹا کر ان کی نیپیاں بدل رہی تھیں۔ لیکن سب خوش نظر آرہی تھیں کیونکہ آج ان کو آپس میں پنجابی بولنے کا موقع ملا تھا ورنہ روزانہ انہیں اپنی پڑوسیوں کے ساتھ کارخانوں میں مقامی خواتین کے ساتھ صرف اور صرف سوئیڈش بولنا پڑتی۔

سوئیڈن میں رہنے والے 80 فیصد پاکستانیوں کا تعلق صوبہ پنجاب سے ہے اس لئے مالمو میں رہنے والے پاکستانی یہاں بھی آپس میں اسی طرح پنجابی بولتے ہیں جیساکہ وہ پنجاب میں بولتے ہیں۔ بعض لوگوں کا تعلق کراچی اور کوئٹہ سے بھی ہے لیکن ان سے اور ہم نئے آنے والوں کے ساتھ بھی وہ لوگ پنجابی میں گفتگو کر رہے تھے کیونکہ دوسرے نمبر پر آسان زبان سوئیڈش تھی جو ہمارے لئے اس سے بھی زیادہ مشکل تھی۔ میرے ساتھ کراچی سے آئے ہوئے راحت عزیز کو میں نے آہستہ سے کہا۔ "سوئیڈن میں دو سال کے قیام کے دوران ہم پنجابی ضرور سیکھ جائیں گے۔" یہاں کے پاکستانیوں میں ایک چیز ضرور ہے کہ وہ انتہائی سادہ لوح اور پر خلوص ہیں شاید اس لئے کہ ان لوگوں کا تعلق دیہی علاقوں سے ہے یا شاید سوئیڈن کے سخت موسم اور محنت مزدوری نے ان کو نرم دل اور صابر بنا دیا ہے اور وہ دوسروں کے دکھ کو اپنا دکھ درد سمجھتے ہیں۔

ہر ایک لیڈر بننا چاہتا ہے

سوئیڈن کے شہر میں مقیم پاکستانیوں کی اس عید ملن تقریب میں کھانے میں گائے کا گوشت، قورمہ اور نان تھے جو یہاں بڑی عیاشی سمجھی جاتی ہے۔ گائے کا گوشت مرغی سے دگنا مہنگا ہے۔ ڈبل روٹی بیس کرونے (سوروپے) کی ہے اور نان جو ایرانی لوگ بناتے ہیں سات کرونے یعنی چالیس روپے کا ملتا ہے۔ یہاں کی عورتوں میں ویسے بھی ایک ڈش چلتی ہے شادیوں اور دوسری تقریبات میں بھی ایک ہی چیز مچھلی یا مرغی ہوتی ہے۔ آپ دو ڈشیں بناکر کسی سوئیڈش کو کھانے پر بلائیں تو وہ اچھا خاص کنفیوژ ہو جائے گا کہ پہلے کیا کھایا جائے۔ کھانے میں گاجر کا حلوہ بھی تھا۔

کھانا شروع ہونے سے پہلے ایسوسی ایشن کے سیکریٹری نے اسٹیج پر آکر تقریر کی۔ وہ ایک مہینہ قبل پاکستان کا چکر لگاکر آئے تھے اس لئے لوگ وہیں کی تازہ خبریں سننے کے لئے بے تاب تھے۔

"بھائیو اور بہنو!' انہوں نے پنجابی میں تقریر شروع کی۔ "اس مرتبہ پاکستان جاکر مجھے بڑی خوشی ہوئی کہ ہمارا ملک ترقی کی راہ پر گامزن ہے۔ موجودہ وزیر اعظم نواز شریف کی حکومت میں پاکستان بہت خوشحال ہوگیا ہے۔"

"لاہور کی ٹوٹی پھوٹی سڑکوں کی مرمت کی جارہی ہے۔ ذاتی کاروبار کے لئے حکومت بے روزگار نوجوانوں کو قرض دے رہی ہے اور یہ بات روز روشن کی طرح عیاں ہے کہ پاکستان کے اچھے دن آنے والے ہیں۔ لاہور میں جگہ جگہ مجھے آذربائیجان، ترکمانستان اور تاجکستان کے تاجر نظر آئے۔ شہر میں بے انتہا صفائی اور رونق نظر آئی۔ پاکستان جاپان اور کوریا کی طرح امیر ہورہا ہے۔ ہمارے گاؤں کے کئی لوگوں کو لاہور میں ملازمتیں ملی ہیں۔ نواز شریف نے قوم سے وعدہ کیا ہے کہ وہ ملتان سے لاہور تک سڑک بنوائیں گے اور ملک سے غریبی دور کریں گے۔ لاہور میں بین الاقوامی اڈہ بن رہا ہے لاہور میں-----"

"لاہور' لاہور' لاہور!" میں نے دل میں سوچا۔ اس درویش کی نظروں میں لاہور ہی پاکستان ہے اور کراچی، کوئٹہ، پشاور سمیت دیگر شہروں سے اسے کوئی لینا دینا نہیں ہے۔

ہمارے گاؤں کے محرم قصائی اور صالح ساٹی (مچھیرے) جیسے دلبر لوگوں جیسے سوئیڈن میں رہنے والے یہ سادہ لوح اور ہر بات کو سچ سمجھنے والے ہمارے یہ پاکستانی بھائی نہ ٹائم نیوزویک مخزن پڑھیں نہ فار ایسٹرن ری ویو یا اکنامسٹ۔ زرمبادلہ کی پیچیدگیوں کی بابت معلوم نہیں کہاں اور کن سے الٹی سیدھی خبریں اور افواہیں سن کر ایسی محفلوں میں دوسروں کو سنا کر خود بھی خوش ہوتے ہیں اور دوسروں کو بھی خوش فہمی میں مبتلا کرتے ہیں۔ کسی نے سچ کہا ہے کہ "Ignorance is bliss" آئے ہوئے مہمانوں میں کچھ ایسے چہرے جو مسجد میں تو اکثر نظر آتے ہیں لیکن یہاں نہیں تھے خصوصاً ان دو نوجوانوں کو میں اچھی طرح جانتا تھا جو جمعہ کی نماز میں صفیں سیدھی کراتے تھے اور چادر میں چندہ جمع کرتے تھے۔ کھانے کے وقت میرے سامنے بیٹھے ہوئے شبیر سے جو ٹیکسی چلاتا ہے اور سارے پاکستانیوں کو جانتا ہے میں نے ان نوجوانوں کا معلوم کیا۔

”انہوں نے ہماری ایسوسی ایشن چھوڑ کر اپنی ایک سوسائٹی بنائی ہے جو پاکستان کلچرل سوسائٹی کے نام سے ہے۔“ شبیر نے بتایا۔

”لیکن یہاں اس شہر مالمو میں پاکستانی ہیں کتنے کہ دو جماعتیں بنانے کی ضرورت پیش آئی؟“ میں نے پوچھا۔

”دراصل بات یہ ہے کہ دنیا کے اس کونے میں رہنے والے پاکستانی کم پڑھے لکھے ہیں اور ان میں برداشت کا اتنا مادہ نہیں ہے۔ کسی بھی مسئلے کو افہام و تفہیم سے حل کرنے کی بجائے آپس میں لڑتے جھگڑتے رہتے ہیں اور چھوٹی چھوٹی باتوں کو اپنی انا کا مسئلہ بنا لیتے ہیں۔ ہر ایک لیڈر بننا اور اپنی بات منوانا چاہتا ہے۔ اس لئے ہم سب لوگ چھوٹے چھوٹے گروہوں میں بٹے ہوئے ہیں اور جس کو جہاں موقع ملتا ہے وہ دوسروں کا گلہ کرتا ہے اور یہ ایسی باتیں ہیں جن پر نہ صرف یہاں کے مقامی یورپی افراد بلکہ بھارت اور بنگلہ دیش کے لوگ بھی ہنستے ہیں۔“

اپنا قانون مت چلاؤ

ہم نے جو مکان کرائے پر لیا تھا اس کے مالک نے رنگ و روغن کیلئے جو آدمی بھیجا وہ نہایت شستہ انگریزی بول رہا تھا۔ سوئیڈن میں گو انگریزی کو دوسری زبان کا درجہ حاصل ہے لیکن لوگ اتنی اچھی انگریزی نہیں جانتے اور جو انگریزی سے اچھی طرح واقف ہیں وہ انگریزی میں گفتگو کرنا اپنی بے عزتی محسوس کرتے ہیں۔ "یہ کون ہو سکتا ہے۔" میں نے دل میں سوچا اور آخر اس سے پوچھ ہی لیا:

"کیا آپ سوئیڈش ہیں؟"

"جی ہاں سو فیصد۔ میرے ماں باپ بھی سوئیڈش ہیں۔" میرے پوچھنے پر رنگ والا شروع ہو گیا۔

"کیوں بھئی! اتنا بتانے کی کیا ضرورت ہے؟" میں نے اسے ٹوکا۔

"دیکھئے یہاں آپ کو کئی سوئیڈش نظر آئیں گے،" اس نے مجھے سمجھانے کی کوشش کی۔ "جو رنگ میں میرے جیسے گورے ہیں لیکن وہ ابھی سوئیڈش بنے ہیں۔ ان کے ماں باپ میں صرف ایک سوئیڈش ہے جبکہ دوسرا پولش، آسٹرین، جرمن، فرینچ یا اٹلی جیسے ملک کا ہے۔" اس نے ان ملکوں کے باشندوں کا ذکر کرتے وقت ایسی شکل بنائی اور ان لوگوں کے لئے ایسی نفرت کا اظہار کیا جیسے تھر پارکر کا کوئی وڈیرہ کھیتوں پر نچلے درجے کا کام کرنے والے باگڑی بھیل اور کولہیوں کے لئے کرتا ہے۔ میں دل ہی دل میں ہنستا رہا کہ چلو دنیا میں سوئیڈن، ناروے، فن لینڈ جیسے بھی ملک ہیں جہاں کے لوگ انگریزوں، فرنچ اور جرمن افراد کو بد اخلاق، گھٹیا اور جاہل سمجھتے ہیں۔ یہ بات مجھے ایک اطالوی نے بھی بتائی تھی جو تیس سال سے یہاں سوئیڈن میں ہے اس کی بیوی سوئیڈش ہے۔ "میرے والد اس وقت سوئیڈن آئے تھے جب میں بہت چھوٹا تھا۔ اسکول میں میرے سوئیڈش ہم جماعت مجھے جنوب سے آیا ہوا جاہل کہتے تھے اور ابھی تک سوئیدن کے لوگ مجھے اپنا نہیں سمجھتے۔" وہ مجھے یہ بتانا چاہتا تھا کہ سوئیڈن کے لوگ صرف اپنے آپ کو اعلیٰ سمجھتے ہیں۔

"ایشیا اور افریقہ کے لوگ بھی تو یہاں سوئیڈن میں رہتے ہیں۔" میں نے اس رنگ ساز سے کہا۔

"جی ہاں انہوں نے تو اور بھی زیادہ گند کیا ہے۔" رنگ ساز کچھ زیادہ ہی کھری کھری سنانے کے موڈ میں تھا۔" پچھلے بیس سال میں دنیا کی کونسی قوم ہے جو یہاں نہیں پہنچی ایرانی ، ترک ، پاکستانی، افغانی، البانی، یوگوسلاوی، افریقی غرضیکہ ہر ایک ہمارے ملک میں گھس آیا ہے اور خود کو سوئیڈش کہلاتا ہے۔ ہر ایک وہ سہولتیں حاصل کرنے کے چکر میں ہے جو ہم لوگوں کے لئے تھیں ۔ اب تو امیگریشن اور ویزا کے قوانین سخت ہو گئے ہیں پھر بھی غیر قانونی طریقے سے ادھر ادھر سے چھپ چھپا کر لوگ یہاں پہنچ جاتے ہیں اور واپس جانے کا نام ہی نہیں لیتے۔"

"وہ کیسے ؟" اتوار کا دن تھا۔ ٹی وی دیکھنے یا کتاب پڑھنے کا موڈ نہیں بن رہا تھا۔ باہر سخت سردی اور برف باری تھی اس لئے وقت گزار نے کے لئے میں بھی سوال کرتا گیا حالانکہ اس رنگ سازسے (جو کچھ کچھ نشے میں بھی تھا) چھیڑ چھاڑکرنا آ بیل مجھے مارکے مترادف تھا لیکن پھر بھی میں باز نہ آیا۔

"دیکھیں جناب یہ آپ کے ایشیائی نوکریوں کے چکر میں یہاں آتے ہیں۔کچھ دن کام کرکے ملک کے قانون سے فائدہ اٹھاکر خود کو طبی طور پر ان فٹ ثابت کرکے گھر بیٹھے سو شل امداد حاصل کرتے ہیں جو اصولاً خیرات کے پیسے ہیں جو کسی بیروزگار کو گزارے کیلئے دیئے جا سکتے ہیں ۔ لیکن یہ لوگ وہ پیسے اپنے ملک بھیج کر خود پھر کنگلوں کی طرح ادھر ادھر پھرتے رہتے ہیں ۔ ایران جیسے ملک کے لوگ یہ کہہ کر ہمارے ملک میں پناہ حاصل کرتے ہیں کہ وہاں پر امام خمینی جیسے لوگوں نے مذہب کی سختی کی ہوئی ہے ہمیں یہاں رہنے دیا جائے کیونکہ یہاں خواتین کو آزادی ہے وغیرہ وغیرہ ۔

پھر جب ان کو یہاں کا پاسپورٹ مل جاتا ہے تو سو سو نخرے کرتے ہیں۔ ہماری لڑکیاں بکنیاں پہن کر اسکول کے سوئمنگ پول میں لڑکوں کے ساتھ پیراکی کی پریکٹس نہیں کریں گی۔ ہماری خواتین سر اور چہرا ڈھانپ کر چلیں گی کیونکہ ہمارا مذہب اس کا حکم دیتا ہے۔ بھئی اگر آپ کو ایسا ہی کرنا ہے اور اگر آپ کو اس ملک کے قانون پر عملدر آمد نہیں کرنا تو پھر اپنے مذہب پر طرح طرح کے الزامات لگاکر یہاں رہنے کا بہانہ کیوں کیا ۔ اپنے ملک میں ہی بیٹھے رہتے۔ یہ ایسا ہے جیسے کوئی سوئیڈش جوڑا پاکستان، ایران، سوڈان جیسے ممالک کے شہروں میں کھلے عام بوس ہ کنار کرے یا کوئی سوئیڈش لڑکی یہ کہہ کر آپ کے ملک میں رہائش اختیار کرے کہ آپ کے ملک میں چادر اور چار دیواری کی عزت ہے اور پھر کچھ عرصے کے بعد منی اسکرٹ پہننا شروع کردے اور یہ کہے کہ یہی ڈریس پہن کر پھروں گی کیوں کہ اس ڈریس کو مالمو یا اسٹاک ہوم میں معیوب نہیں سمجھا جاتا ہے۔

"تو یقینا آپ کا یہی جواب ہوگاکہ ایسا ہے تو اپنے ملک چلی جاؤ یہاں رہ کر اپنا قانون مت چلاؤ۔"

قصور کس کا؟

ورلڈ میری ٹائم یونیورسٹی (سوئیڈن) کی جانب سے ناروے کے شہر اوسلو میں جہاز رانوں کے لئے ایک ہفتے کا ایک شارٹ کورس مقرر کیاگیا ۔ آخری دن ہم میرین انجنیئروںکو ایک اوپن بک ٹیسٹ پاس کرنا تھا۔ پرچے پر لکھے ہوئے سوالات کے جوابات لکھنے تھے جس کے لئے کتابوں سے مدد لینے کی بھی اجازت تھی اور اس کے لئے د س بارہ کتابوں کا سیٹ ہر ایک کو دیاگیا۔ دراصل وہ دیکھنا چاہتے تھے کہ کس نے کتنا مطالعہ کیا ہے۔

میرے ساتھ میز پر تنزانیہ کا انجنئر مسٹر دوبیلو اور تھائی لینڈ کا انجنئر مسٹر سوتی چائی تھا۔گزشتہ تقریباً دو سال سے سوئیڈن کے شہر مالمو میں ایک ہی جگہ مقیم ہونے کی وجہ سے میری ان سے کافی جان پہچان ہوگئی تھی۔

امتحان شروع ہوتے وقت سوتی چائی نے مجھ سے کہا۔ "یار تم لوگ خوش نصیب ہو کہ تمہارے ملک میں انگریزی پڑھائی جاتی ہے۔ مجھے کئی سوالات کے جواب آتے ہیں لیکن انگریزی سے زیادہ واقفیت نہ ہونے کی وجہ سے اتنااچھا نہیں لکھ سکتا'کبھی کبھی تو سوال بھی سمجھ میں نہیں آتا۔ تھائی زبان میں کہیں تو کئی صفحے لکھ ڈالوں۔ اس لئے آپ میری تھوڑی سی مدد کیجئے گاکم ازکم صفحات کے نمبر بتا دیجئے گا۔"

میں نے دیکھا تنزانیہ کا انجنیئر دوبیلو سنجیدہ ہوگیا اور سوتی چائی کو گھور کر دیکھنے لگا۔ معاملے کو ٹھنڈاکرتے ہوئے میں نے دو بیلو سے کہا۔

"یار دوبیلو! آپ امتحانات کے معاملے میں بہت سنجیدہ رہتے ہیں۔ پچھلی مرتبہ میں نے آپ سے کیلکیولیٹر مانگا تو آپ نے گردن اٹھاکر جواب تک نہیں دیا۔"

تنزانیہ کا میرا یہ دوست دوبیلو جو شکل، رنگ اور جسامت میں یوگنڈاکے عیدی امین کی جوانی کے دونوں کی تصویر سے کافی ملتا ہے' زیرلب مسکرا کے کہا۔ "امتحان کے دوران بات نہیں کرنی چاہیے اور کسی کو صفحے کا نمبر بتانا نقل کرانے کے مترادف ہے۔"

مجھے یہ سن کر حیرت کے ساتھ ساتھ خوشی بھی ہوئی۔ ویسے تو دنیا کے کئی ممالک میں امتحان کے دوران تھوڑی بہت نقل کرنے کا مرض عام پھیل چکا ہے اور ہمارے ملک میں تو یہ ایک ناسور کی شکل اختیار کر چکا ہے۔ لیکن دنیا میں تنزانیہ جیسے ممالک بھی ہیں جہاں امتحانات میں سختی کی جاتی ہے اور طلبہ کیلئے ہر قسم کا امتحان پاس کرنے کا واحد طریقہ صرف اور صرف محنت ہے۔ نتیجتاً ایسے ممالک کا تعلیمی معیار آج بھی بلند ہے۔ ایسے ممالک کے لوگوں کے پاس محض یونیورسٹیوں کی ڈگریاں نہیں بلکہ ان کے پاس علم بھی ہوتا ہے۔

تنزانیہ کے دوبیلو کی یہ بات سن کر مجھے خیال آیا کہ تنزانیہ جیسا افریقہ کا غریب ملک جہاں سیاسی ہنگامے روز کا معمول ہیں لیکن تعلیم کے معاملے میں اس کا معیار بلند ہے جس کا اندازہ دوبیلو کی ذہانت اور قابلیت سے بھی لگا جا سکتا ہے۔

"دوبیلو! لگتا ہے تمہارے ملک میں کاپی کلچر کا رواج نہیں ہے۔"

"سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔" دوبیلو نے جواب دیا۔ "امتحان کے دوران کسی سے کاغذ کا ٹکرا مل جائے یا کوئی بات کرتے ہوئے بھی پکڑا جائے تو اس کو تین برس کے لئے امتحان میں بیٹھنے نہیں دیا جاتا۔"

"بہت خوب! یہ خوشی کی بات ہے کہ تنزانیہ تعلیم کا وہی معیار برقرار رکھتا آ رہا ہے جو انگریز چھوڑ گئے تھے۔" میں نے کہا۔ "اور اس کا مطلب یہ ہے تنزانیہ کے کالجوں اور یونیورسٹیوں سے جو طالب علم فارغ التحصیل ہوتے ہونگے وہ اپنے شعبے کے ماہر ہوتے ہوں گے۔"

"بالکل صحیح ہے۔" دوبیلو نے بتایا۔ "ہمارے ملک میں اگرچہ کالجوں اور یونیورسٹیوں کی تعداد زیادہ نہیں ہے لیکن جو بھی وہاں سے گریجویشن کرکے نکلتا ہے پوری دنیا اسے قدر کی نگاہ سے دیکھتی ہے اور اسے مطلوبہ ملازمت کے حصول میں کوئی مشکل نہیں آتی۔ آج بھی تنزانیہ کے ڈاکٹر، انجنیئر، سائنسدان اور دوسرے مضامین کے ماہرین انگلینڈ، امریکہ اور آسٹریلیا جیسے ملکوں میں نظر آتے ہیں اور ان کو قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔"

تنزانیہ جیسے غریب اور ترقی پذیر ملک جس میں میرا 1970 ءسے آنا جانا رہا ہے اور اب وہ دنیا کے امیر اور ترقی یافتہ ملکوں میں شمار کیا جاتا ہے اس کی بلند تعلیمی معیار کی بھی یہی مثال دی جاسکتی ہے بلکہ اس کی ترقی کا ایک سبب صحیح تعلیم ہے۔ وہ ملائیشیا ہے جس کے لئے چند سال قبل دولت مشترکہ کے ایک اجلاس میں برطانوی ملکہ الزبتھ نے کہا تھا کہ ملائیشیا وہ ملک ہے جہاں انگریزوں سے خودمختیاری ملنے کے بعد تعلیم اور پولیس کا معیار بہتر ہوا ہے۔

ملائیشیا میں تقریباً آٹھ سال تک میرا تعلیمی اداروں سے واسطہ رہا ہے اور مختلف ٹیکنیکل کالجوں سے نیول اکیڈمی جیسے اداروں کو پڑھانے اور امتحانات لینے کا موقع ملا۔ میں نے یہاں طلبہ اور اساتذہ دونوں کو ہمیشہ پابندی وقت کرتے دیکھا۔ امتحان پاس کرنے کے لئے تو دور کبھی کسی کو چھٹی کیلئے بھی سفارش کرتے نہیں دیکھا حالانکہ یہاں وزیروں، سیاستدانوں اور بڑے تاجروں کے بچے زیر تعلیم تھے۔ نقل کرنا سخت معیوب سمجھا جاتا تھا۔ وہاں کے معاشرے میں فیل ہونے والے کو اتنا خراب نہیں سمجھتے تھے جتنا نقل کرنے والے کو۔ میرے ایک شاگرد نے ملازمت اور بعد میں ملک اس لئے چھوڑ کر سنگاپور جا کر دکان کھول لی کہ اس کے دوستوں نے اس پر الزام لگایا تھا کہ اس نے پروفیشنل امتحان کے ایک مضمون میں نقل کی تھی۔

کچھ سال قبل ملائیشیا میں امتحان لینے والے ڈپارٹمنٹ کو یہ شک ہوگیا کہ کسی سینٹر میں SPM امتحان (میٹرک کے برابر) کا ایک پرچہ وقت سے قبل آؤٹ کر دیا گیا ہے اور یہ افواہیں اخباروں میں بھی آگئیں ۔ اس شکایت کا سدباب کرنے کیلئے ایک کمیٹی تشکیل دی گئی جس کے فیصلے کے مطابق نہ صرف اس ایک مضمون کا بلکہ دوسرے مضامین کے بھی نئے سرے سے پرچے بنے اور پورے ملک کے طلبہ کو دوبارہ امتحان دینا پڑا۔

میرے خیال میں ایک سبب یہ بھی ہے کہ ملائیشیا کے کالجوں اور یونیورسٹیوں سے ڈاکٹری یا انجنیئرنگ پاس کرنے والے کا تو کیا ایک بی اے پاس کا بھی بہت بڑا مقام ہے اور آسٹریلیا ، نیوزی لینڈ جیسے ملک بھی اسے ہاتھوں ہاتھ لیتے ہیں۔

آج سے تقریباً ایک چوتھا صدی پہلے ہمارے ملک کا بھی تعلیم معیار بہت بلند تھا۔ ملائیشیا ، سنگاپور ، ایران اور سعودی عرب جیسے ملکوں کے لوگ ہمارے تعلیمی اداروں میں علم حاصل کرنے آتے تھے لیکن پھر ایسی ہوا چلی کہ ہر چیز پیچھے رہتی چلی گئی۔ تعلیمی معیار گرتا گیا۔ لوگ سفارش پر پاس ہوتے گئے۔ نقل کا رجحان گھس آیا ، نظم و ضبط ختم ہوگیا، ہر وقت طلبہ کے ہنگامے ہونے لگے، استاد تدریس اور کلاس روم میں جانے سے کترانے لگے۔ تعلیمی ادارے زیادہ تر بند رہنے لگے اور اس حد تک کے ایک مرتبہ اخبارات میں یہ خبر چھپی کہ کسی میڈیکل کالج کے طلبہ نے مطالبہ کیا ہے کہ اس سال کالج بند اور پڑھائی نہ ہونے کی وجہ سے اس کالج کے لڑکوں کو بغیر امتحان پاس کیا جائے!

سمجھ میں نہیں آتا کہ اس کا قصور وار کسے ٹھہرایا جائے۔۔۔؟ شاگرد،استاد،کالج انتظامیہ، حکومت، سیاستدان، یا چند غنڈہ ٹائپ لڑکے جو نہ خود پڑھتے ہیں اور نہ ہی دوسروں کو پڑھنے دیتے ہیں۔ اس کا ذمہ دار کوئی مقامی یا غیر ملکی دشمن یا کوئی اور۔۔۔؟

زنجبار کا عروج و زوال

ہمارے تنزانیہ کے جہاز راں دوست دوبیلو آج کل زنجبار میں ملازمت کر رہے ہیں۔ زنجبار ایک چھوٹا سا جزیرہ ہے جو کینیا کی بندرگاہ ممبا سا اور تنزانیہ کی بندرگاہ دارالسلام کے راستے میں آتا ہے۔کسی زمانے میں عدن ،کولمبو اور بیروت کی طرح ممباسا، دارالسلام اور زنجبار جیسی بندرگاہوں کی بڑی شان تھی۔ ان دنوں ان کے مقابلے میں سنگاپور، ہانگ کانگ، بنکاک جیسی بندرگاہیں سندھ کے ماتلی اور تلہار جیسے گاؤں کے برابر تھیں۔زنجبار کے سامنے ٹانگا نیکا نام کا مُلک تھا جسے بعد میں زنجبار سے ملا کر ایک ملک بنایا گیا۔ افریقہ کی یہ جگہیں بڑی خوشحال اور پر رونق تھیں۔ لوگ دور دور سے یہاں گھومنے اور رہنے کے لئے آتے تھے۔ ارنیسٹ ہیمنگوے نے بھی یہاں پر کچھ عرصہ گزار کر "Snows of Kilminjaro" نامی کتاب لکھی۔ ہالی ووڈ اور بھارتی فلمی دنیا کے لوگ یہاں آکر اپنی فلموں کی شوٹنگ کرتے تھے۔ ایک مشہور گانا ہے جو بچپن میں ہم سنا کرتے تھے۔

تم نے دیکھا کیا بھلا

گر نہ دیکھا افریقہ

تانگا نیکا ۔ تانگا نیکا

ممباسا پر بھی ہم ایک گانا گاتے تھے شاید آزاد فلم کا اور پھر ان سب بندرگاہوں اور جزیروں میں سب سے زیادہ خوبصورت ، امن پسند اور معروف زنجبار کا تھا۔ تجارت میں سنگاپور اور دبئی کا جس طرح آج نام ہے گزشتہ نصف صدی تک وہ مقام زنجبار کو حاصل تھا جسے انگریزی میں ZANZIBAR کہتے ہیں۔ زنجبار لونگ اور ناریل کی تجارت کے مرکز کے علاوہ غلاموں کی ایک بڑی منڈی تھی اور یہاں کے تاجر دنیا میں مانے جاتے تھے۔ عرب، انگریز، ڈچ، پرتگالی وغیرہ وغیرہ دور دور سے یہاں آکر خرید فروخت کرتے تھے۔ اس کے علاوہ دنیا کے امیر لوگ گھومنے پھرنے ، آرام اور عیاشی کرنے یہاں آتے تھے بحر ہند سے ہر گز رنے والا جہاز یہاں ضرور لنگر انداز ہوتا تھا۔

عمان کے سلطان کی اس جزیرے سے دلچسپیاں اتنی بڑھ گئیں تھیں کہ 1832 ءمیں اس نے اپنا محل زنجبار منتقل کر لیا تھا۔ عمان کے سلطان کا محل بننے کے بعد امریکہ نے اپنا قونصل خانہ زنجبار میں کھولا۔ بر صغیر کے تاجر خصوصاً گجراتی ، آغا خانی، بوہری، سندھی ہندو اور کاٹھیا واڑی سے لیکر چینی ، ملئی ،گورکھے یہاں نظر آنے لگے۔ زنجبار کا عروج تو نہیں لیکن اس کے زوال کی جھلک 60ءکے عشرے میں ہم نے بھی دیکھی۔

زنجبار کی خوشحالی کے ستارے اس وقت ڈوبنا شروع ہوئے جب 1964ءمیں مقامی لوگوں نے عمانی سلطنت کے خلاف انقلاب برپا کیا (عمان کے سلطان کی رہائش آج کل پورسٹن ماؤتھ، انگلینڈ میں ہے) اور تانگانیکا کے ساتھ مل کر سوشلسٹ حکومت نے تنزانیہ کا ملک بنایا۔

بادلوں سے بھرے آسمان کے نیچے یہ جزیرہ زنجبار جہاں پر لوگوں کے پتھروں اور سفید چونے کی دیواروں کے گھر ہیں جن کی پتلی اور تنگ گلیوں میں ہر وقت تاجروں اور سیاحوں کی چہل پہل ، آوازیں، خوشبوئیں اور خوشیاں نظر آتی تھیں، آج خاموش اور مرجھا ہوا نظر آتا ہے۔ سوشلزم یا روسی طرزِ حکومت کی کیا اچھائیاں یا برائیاں رہیں یہ تو سیاست اور معاشیات کا طالب علم ہی اچھی طرح بیان کر سکتا ہے۔ ہم جہاز راں اور مسافر تو صرف یہ کہہ سکتے ہیں کہ اس کا اثر جہاں بھی رہا وہاں کی رونقیں اور معیشت ختم ہوگئی پھر چاہے وہ عدن کی بندرگاہ ہو یا زنجبار کی۔ رات کو دیر تک جاگنے والی یہ بندرگاہ آج دن کو بھی سوئی ہوئی نظر آتی ہے۔ وہ بندرگاہ جہاں ہر وقت دور دراز کے ممالک سے جہازوں کی آمد ورفت رہتی تھی آج کل خالی نظر آتی ہے۔ ہم جسیے بھولے

بھٹکے لوگوں کا جہاز آجاتا ہے تو وہ بھی مجبوری کے تحت... پانی ختم ہونے یا جہاز کے انجن کی ہنگامی مرمت کرانے کے لئے۔ آج دکانوں پر وہ دیس دیس کی چیزیں ہیں جنہیں ہم جہاز راں اور سیاح بڑے شوق سے خرید تے تھے اور نہ وہ قدردان اور خریدار۔ دکاندار اپنی دکانوں کے آگے زینوں پر بیٹھے جمائیاں لیتے رہتے ہیں اور آپ کو اللہ نہ کرے فون کی ضرورت پڑے۔ جزیرے کا ہر فون آپ کو خراب ہی ملے گا جبکہ آج کل کے دور میں پاکستان کے گھارو اور دھابیجی جیسے گاؤں میں بھی آپ کو پبلک کال آفس کام کرتے نظر آئیں گے اور سجاول اور تھانہ بولا خان کی ٹوٹی ہوئی سڑکوں پر بھی ہر وقت کچھ نہ کچھ ٹریفک نظر آئے گی۔ لیکن زنجبار کے پورے جزیرے میں گنتی کی چند کاریں ملیں گی حالانکہ آج جو سنگاپور کی شان ہے وہ زنجبار کی ہونا چاہیے تھی۔ لیکن کچھ حاکم اور رہنما اپنے ملکوں کو تباہ کردیتے ہیں۔ ایک زمانہ تھا جب اس سلطنت میں لونگ کی فصل اتنی زیادہ ہوتی تھی جو آدھی دنیا کی ضرورت پوری کرتی تھی۔ میں اعداد و شمار کا جائزہ لے رہا تھا کہ زنجبار سے جہاں پہلے بیس ہزار ٹن لونگ برآمد کی جاتی تھی، قومیائے جانے کے بعد اب ڈیڑھ ہزار ٹن بھی مشکل سے پیدا ہوتی ہے۔ انڈونیشیا اور برازیل جیسے ممالک نے دنیا کی لونگ مارکیٹ پر قبضہ کرلیا ہے۔ جس طرح عدن، کولمبو، زنجبار، ممباسا جیسی بندرگاہوں (جو اپنے وقت میں خریداروں کی جنت مانی جاتی تھیں) کی کمی سنگاپور اور دبئی جیسی بندرگاہوں نے پوری کردی ہے۔

تنزانیہ کی موجودہ حکومت اس تگ ودو میں ہے کہ زنجبار کا وہ پرانا عروج اور شان و شوکت کسی طرح دوبارہ لوٹ آئے۔ وہ غیر ملکیوں کو کاروبار اور سرمایہ کاری کی دعوت دے رہی ہے۔ لیکن سرمایہ کار یہاں سرمایہ لگاتے ہوئے گھبراتے ہیں کہ افریقی ممالک کا کوئی بھروسہ نہیں۔ کسی وقت بھی کوئی عیدی امین، موبوتو سیسے یا ثانی اباچہ جیسا کوئی جنرل یا سیاسی ڈکٹیٹر موڈ خراب ہونے پر ان کو ملک سے ہی بھگادے۔ سننے میں آرہا ہے کہ پرنس کریم آغاخان زنجبار میں تجارت میں دلچسپی لے رہے ہیں۔ عمان کی حکومت نے بھی تحفتاً یہاں ہوائی اڈہ بناکردیا ہے جس کے شاہی خاندان کے کئی افراد آج بھی زنجبار میں رہتے ہیں۔ کچھ بڑے ہوٹل اور ڈیوٹی فری زون بھی قائم ہورہے ہیں۔ اس چھوٹے سے جزیرے کے وزیراعلی کا یہی خواب ہے کہ زنجبار کو مشرقی افریقہ کا سنگاپور بنا دیا جائے۔ لیکن اس کے ایک تہائی منزل پر پہنچنے کیلئے کافی عرصہ چاہیے کیونکہ یہاں پر نہ جدید مواصلاتی نظام ہے اور نہ بینکاری کی سہولت موجود ہے۔ نہ بہتر دفاتر ہیں نہ سواری کا تیز رفتار نظام جو کہ بحرہند کے اس چھوٹے سے افریقی جزیرے کو باقی دنیا سے ملادے جیسے سنگاپور ملائیشیا سے ملا ہوا ہے۔ ہانگ کانگ چین سے ملا ہوا ہے۔ حالت یہ ہے کہ آج کے جدید ترین جہاز زنجبار کے پرانے وقت کی بندرگاہ میں کھڑے نہیں ہو سکتے جو لکڑی کی کشتیوں اور لانچوں کے لئے بنایا گیا تھا۔

تم خنزیر کیوں نہیں کھاتے

ایک مخلوط قسم کی دعوت میں جہاں یورپی تو کیا عرب اور افریقہ کے مسلمان ممالک کے جہاز ران نمائندے بھی شراب پی رہے تھے وہاں میرا ایک عیسائی دوست مسٹر دو بیلو ہماری میز پر بیٹھ کر کوکا کولا پینے لگا۔

دو بیلو کا ذکر پہلے بھی کر چکا ہوں کہ ان کا تعلق تنزانیہ سے ہے۔ تنزانیہ کسی زمانے میں تین الگ ملک تھے۔ ٹانگانیکا، زنجبار اور نیا سالینڈ۔ زنجبار ممباسا کے قریب ایک جزیرہ ہے جسے انگریز اور یورپی ZANZIBAR کہتے ہیں۔ دو بیلو پیشے کے اعتبار سے میری طرح میرین انجنیئر ہے۔ کئی برس کی جہاز رانی کے بعد آج کل زنجبار میں ملازمت کرتا ہے اور اپنی جہاز ران کمپنی کے جہازوں کی دیکھ بھال کرتا ہے۔ دو بیلو جسامت میں لمبے قد کا اور سخت جان ہے لیکن دل کا نرم اور حقیقت پسند ہے۔ وہ ہر بات سوچ سمجھ کر کرتا تھا اور جو بات صحیح سمجھتا تھا اس پر قائم رہتا تھا۔ وہ خود کو تکلیف دے کر دوسرے کو آرام اور خوشی پہنچاتا تھا۔

”دو بیلو! تم بیئر وبئر کیوں نہیں پیتے؟“ اس رات دعوت میں کوکا کولا پیتے ہوئے دو بیلو سے میں نے پوچھا۔

دو بیلو نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔ “میں کوکا کولا پینا ہی بہتر سمجھتا ہوں۔“

اس کے بعد چند لمحے خاموش رہ کر دو بیلو نے دھیمی آواز میں مجھ سے کہا “میں شراب بہت پیتا تھا لیکن اب میں نے پینا چھوڑ دیا ہے۔“

”آپ نے بہت اچھا کیا لیکن ایک بات تو بتائیں کہ شراب پینا کیوں چھوڑی۔“ میں نے پوچھا۔ “ آپ جیسے جوان جہاز ران اور انگلینڈ آنے جانے والے افسر کے لئے، جو پہلے سے پینے کا عادی ہو، سگریٹ یا شراب جیسی چیز سے کنارہ کشی کرنا واقعی کمال کی بات ہے۔“

دو بیلو کے ہونٹوں پر کچھ دیر مسکراہٹ پھیلی رہی شاید شراب چھوڑنے کی کامیابی پر۔ اس کے بعد اس نے مختصر جواب دیا۔ “بس میں نے پینا چھوڑ دیا۔“

’آخر کیوں؟“ میں نے اپنا سوال دہرایا اور دو بیلو کی طرف جواب طلب نظروں سے دیکھنے لگا۔

”دراصل خاص سبب تو یہ تھا کہ اس پر پیسہ خرچ ہوتا ہے اور اس کے علاوہ صحت کی بربادی الگ ہے۔ اور پھر ایک دفعہ کوئی ان شرابیوں کی صحبت میں پھنس جائے تو نکلنا مشکل ہو جاتا ہے۔ تنزانیہ میں تو اچھی شراب بھی نہیں ملتی۔ بہرحال سب سے بڑا سبب یہ ہے کہ میں ایک اچھا عیسائی بننا چاہتا تھا۔“ دو بیلو نے اپنا قصہ سنایا۔

ایک اچھے عیسائی کو شراب پینے سے پرہیز کرنا چاہیے یہ میرے لئے ایک نئی بات تھی۔ میں نے تعجب آمیز لہجے میں دو بیلو سے پوچھا۔

”کیا واقعی عیسائی بھی اسے حرام سمجھتے ہیں؟“

"جی ہاں۔ بالکل۔" دوبیلو نے جواب دیا۔ "اسلام، عیسائیت، یاکوئی بھی مذہب نیک بننے کی تلقین کرتا ہے۔ نشہ آور اشیاءکے استعمال کے لئے کونسا مذہب یا مہذب انسان ہمت افزائی کرے گا۔ بس ہم لوگوں نے خصوصاً ایشیا اور افریقہ کے غریب ممالک کے لوگوں نے ایسی چیزوں کو جھوٹی شان و شوکت کا معیار بنا دیا ہے۔ میں نے ایک دفعہ چھوڑنے کا عزم کیا اور ہمیشہ کے لئے پینا چھوڑ دیا۔ اب مجھے شراب اور سگریٹ سے نفرت ہے۔"

دوبیلو کا خاص شغل ٹی وی پر مختلف کھیل اورکتب بینی تھا۔ وہ کم گو تھا اور ہر قسم کی گاڑی میں اسے نیند آ جاتی تھی، چاہے وہ بس ہو یا ریل گاڑی، ہوائی جہاز ہو یا ہوور کرافٹ۔ جو گروپ والے فیصلہ کرتے تھے اسے ایک دم قبول کرتا تھا۔ سوائے نقل کرنے یا کرانے کے کسی چیز کی مخالفت نہیں کرتا تھا۔

ایک دفعہ ہمارا گروپ ہوائی جہاز کے ذریعہ مالمو (سوئیڈن) سے ہیلسنکی (فن لینڈ) جا رہا تھا۔ بورڈنگ کارڈ لیتے وقت یمن کے پورٹ انجینئر مبارک کی ہمیشہ کی طرح یہ خواہش بلکہ کوشش تھی کہ ہماری (خاص طور دوبیلو اور میری) نشستیں اس کے قریب ہوں تاکہ عالمی پرواز پر ملنے والی ہمارے حصے کی بیئر (یاوسکی) وہ پی سکے۔

جہاز کے ٹیک آف کرتے ہی دو بیلو اور میں سوگئے۔ دوسری طرف کی دو سیٹوں پر مبارک اور فلپائن کا لیفٹیننٹ گلبرٹ باتیں کرتے رہے۔ تھوڑی دیر کے بعد ایئرہوسٹس چائے،کافی یا کولڈڈرنک کے لئے پوچھنے آئی تو میں نے اپنے لئے چائے پسند کی دوبیلو سوچتا رہا۔

"دوبیلو جلدی کروکیا پینا ہے۔" میں نے کہا۔

"بس یارکچھ بھی کہہ دو۔" دوبیلو نے کہا۔

"یس سر!" اب ایئرہوسٹس نے اس سے پوچھا تو دوبیلو نے اسے کوکاکولا لانے کے لئے کہا۔

"کیوں دوبیلو چائے نہیں چلے گی؟" میں نے سخت سردی کا سوچ کر دوبیلو سے کہا۔

"میرے دوست" دوبیلو نے کہا۔ "چائے ہو یا کافی یا کوکاکولا، ان میں کسی کی بھی غذائی اہمیت نہیں ہے، بس ہونٹ گیلے کرنے کیلئے ہے۔"

"واقعی صحیح کہتے ہو۔" میں نے ہنس کر دوبیلو کی تائید کرتے ہوئے کہا۔ "ہمارے ملک میں اس سلسلے میں کہاوت ہے کہ ایسا کام کرنا منہ کالا کرنے کے برابر ہے چاہے کوئلے سے کرلو یا توے سے۔"

دوبیلو زور زور سے ہنسنے لگا۔ "یارکیا خیال ہے نیند نہ کرلی جائے۔"

"اورکھانا؟" میں نے دوبیلو کو یاد دلایا۔

"کھانے کے لئے ایئرہوسٹس کو منع کیا جائے ورنہ دو سینڈوچوں کے لئے وہ ہمیں جگادے گی۔" دوبیلو نے کہا۔

ایئرہوسٹس نے چائے کا کپ اورگلاس اٹھایا تو ہم نے اسے کھانے کیلئے جگانے سے منع کیا۔

"اور پینے میں کیا ہے؟" مبارک نے سوال کیا۔

"جو آپ پسند کریں بیئر وسکی، برانڈی۔" ایئرہوسٹس نے پوچھا۔

"میرے لئے برانڈی لانا۔" مبارک نے اسے کہا اور ہماری طرف اشارہ کرکے بے شرمی سے کہا۔ "ان کے حصے کی برانڈی بھی مجھے لاکر دینا۔"

ایئرہوسٹس 'بہتر جناب' کہہ کر چلی گئی اور ہم لوگ وقت دیکھ کر سوگئے۔ ہوائی جہاز بحیرہ بالٹک کے اوپر سے گذر رہا تھا۔ ہیلسنکی کی بندرگاہ آنے میں ابھی پورے دوگھنٹے تھے۔ موسم کوئی اچھا نہیں تھا جہاز رک رک کر ایئرپاکٹ میں آنے کی وجہ سے جھٹکے کھا رہا تھا۔ پائلٹ کوئی اور تھا جہاز صحیح طرح چلانا اسی کی سردردی تھی، ہم مسافر تھے اس لئے ہم سکون میں تھے اور پانچ دس منٹ میں نیند آگئی۔ ہم تو ہیلسنکی تک نیند میں مدہوش رہتے لیکن مشکل سے کوئی آدھ گھنٹہ سو سکے۔ کھاناکے دوران ہمیشہ کی طرح مبارک کی چیخ و پکار شروع ہوگئی۔ وہ آتی جاتی ایئرہوسٹس سے یہی پوچھے جارہا تھاکہ کھانے میں جو سینڈوچ دی گئی ہے وہ حلال ہیں یا نہیں۔ اب وہ فن لینڈ کی فنش ایئرہوسٹس لڑکی کیا جانے کہ حلال اور حرام کیا ہوتا ہے۔ اسے سمجھانے کے لئے مبارک زور زور سے چیخے جارہا تھا۔ "کیا یہ پورک (خنزیر کا گوشت) ہے؟" اور ایئرہوسٹس باربار یہ جواب دے رہی تھی "مجھے معلوم نہیں ہے میں پرسر یا پائلٹ سے پوچھ کر آتی ہوں۔" لیکن زیادہ کام اور موسم خراب ہونے کی وجہ سے وہ کسی اور اہم کام میں مصروف ہوگئی تھی اور یہاں ہمارے یار جس کو بھوک شاید زیادہ تنگ کر رہی تھی بار بار یہی سوال دہرا دہرا کر ہماری نیند خراب کر رہا تھا۔ دراصل دیکھا جائے تو ان ممالک میں اس قسم کے سوالات کرنا سب کو پریشان کرنا ہے کیونکہ اس جیسی چھوٹی پروازوں میں اور ان ممالک میں کسی کے لئے خصوصی کھانا تیار نہیں کیا جاتا۔ کوئی ہندو ہے گوشت نہیں کھانا چاہتا، کوئی سبزی خور ہے وہ صرف سبزی کھانا چاہتا ہے، مسلمان کے لئے خنزیر حرام ہے۔ بلکہ اگر صحیح طریقے سے حلال نہ کیا گیا ہو تو وہ کسی بھی قسم کا گوشت نہیں کھا سکتا۔ لہذا ایسی صورت میں خواہ مخواہ بحث میں پڑنے کی بجائے خاموشی اختیار کرلینی چاہئے۔ ایک ڈیڑھ گھنٹے بعد ایئرپورٹ پر اترکر اپنی پسند کی چیز کھالینی چاہیے۔ ایئرہوسٹس تو وہی پیش کر سکتی ہے جو اسے اس کی کمپنی نے دیا ہوگا۔ اس لئے اس سے بحث بے سود ہوگی۔ یہی باتیں ہیں جن کی وجہ سے لوگوں کو یہ کہنے کا موقع ملتا ہے کہ مسلمان لوگ خواہ مخواہ بحث کرتے ہیں اور وہی ہوا۔ مبارک کے چیخنے پر دوبیلو کی بھی نیند خراب ہوئی اور اس نے مجھے مشورہ دیاکہ آئندہ اس عرب کے ساتھ نہیں بیٹھیں گے اور اس کے بعد مبارک کو بڑے پیار سے کہا۔

"بھائی مبارک تم خنزیر کیوں نہیں کھاتے؟"

یہ ایسی بات تھی جو تھری ناٹ تھری کی گولی سے کم نہیں تھی۔ مبارک نے غصے میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دوبیلو سے کہا۔ "کیا تمہیں معلوم نہیں میں مسلمان ہوں۔"

"بالکل معلوم ہے۔" دوبیلو نے بڑے آرام سے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

"اور تمہیں معلوم نہیں کہ مسلمان خنزیر نہیں کھاتے۔" مبارک نے غصے میں اور زور سے کہا۔

"بھائی مبارک صاحب! ٹھنڈے ہوجائیں مجھے سب معلوم ہے۔ میں نے اسلام کے متعلق تم سے زیادہ پڑھا ہے۔ اسلام میں تو شراب بھی حرام ہے وہ کیوں پیتے ہو؟" یہ سن کر مبارک ایسا خاموش ہوا جیسے اسے سانپ سونگھ گیا ہو۔

بہرحال اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہیلسنکی پہنچ کر مبارک نے دوبیلو سے بات چیت چھوڑ دی۔ دوبیلو نے دو دن انتظار کے بعد آخر تیسرے دن مبارک کو سمجھایا۔ "دیکھو مبارک! تم مجھ سے چھوٹے ہو میری بات مانو شراب پینا بہت بری چیز ہے۔" اللہ نے مبارک کو توفیق دی اور وہ ہنگامہ کرنے کے بجائے غور سے سنتا رہا اور دوبیلو نان اسٹاپ اسے سناتا گیا۔" مجھ سے بڑا شرابی کوئی نہیں تھا لیکن میں نے پینا چھوڑ دیا کیونکہ یہ سراسر گھاٹے کا سودا ہے۔ میں تمہارے ہی مذہب کی مثال دیتا ہوں: تین دن کے بھوکے کو اسلام نے مردار کھانے کی اجازت تو دی ہے لیکن شراب پینے کی نہیں۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ شراب انتہائی خراب چیز ہے۔ یہ وہ چیز ہے جس کا ایک قطرہ کنویں میں گرجائے تو کنویں کو تین مرتبہ پاک کرنا چاہیے۔"

مبارک اور ہم لوگ ایک غیرمسلم کی باتیں غور سے سنتے رہے جو ہمارے ہی مذہب کی اچھی باتیں ہمیں بتارہا تھا۔ مبارک پر اس کا کتنا اثر ہوا یہ تو میں نہیں کہہ سکتا لیکن یہ ضرور ہوا کہ اس نے اسی وقت دوبیلو سے دوبارہ بات چیت شروع کردی۔

انتظار کرو اور دیکھو

سوئیڈن میں ابتدائی مہینوں میں جب ہم لوگ ہاسٹل میں اکیلے رہتے تھے تو ہفتے میں پانچ دن ہمیں میس میں کھانا کھانا پڑتا باقی دو دن ہفتہ اور اتوار کو خود کھانا پکاتے تھے جس کا بندوبست ہر کمرے میں تھا۔ ہم سب پاکستانی جہاز رانوں کو تھوڑا بہت کھانا پکانا آتا تھا لیکن چیف انجنیئر راحت عزیز اور کیپٹن اشرف ظفر کچھ زیادہ ہی Expert تھے۔ وہ ہر ہفتے نئی ڈش بناتے تھے اور کئی چیزیں ہم نے بھی ان سے سیکھیں۔ یہ لوگ حلوہ پوری اور کباب تک بنالیتے تھے۔

ویسے ان قطبی ممالک میں جہاں سارا سال سخت سردی رہتی ہے وہاں کھانا پکانا کوئی مشکل کام نہیں ہے بلکہ یہاں چولہے کے پاس کھڑے ہونے میں جو لطف آتا ہے وہ ہمارے ممالک میں جون جولائی جیسے مہینوں میں ایئرکنڈیشنز کے سامنے بیٹھنے میں بھی نہیں ہے۔ یہاں میرے ساتھ ہر ممالک کا نمائندہ تھا جو اپنی پسند اور ملک کا کھانا پکاتا تھا۔کئی دفعہ ہم زیادہ پکالیتے تھے تو دوسروں کو بھی دیتے تھے اور یہ تو سب مانتے تھے کہ پاکستانی اور انڈین ڈش بہت اچھی ہوتی ہیں۔ افریقہ کے نمائندہ جہاز رانوں کا زیادہ زور شکر قندی اور مکئی پر ہوتا تھا۔ لوبیا اور پھلی بھی بہت پکاتے تھے۔ چینی، فلپائنی، کورین اور ویتنامی باشندے ہر چیز فرائی کرتے تھے اور ہر وقت مرچ مصالحوں خصوصاً لہسن کے جلنے کی بو آتی رہتی تھی۔ ملئی، انڈونیشی اور تھائی پتلی سویوں جیسی

می اور نوڈلز، زیادہ پکاتے تھے۔ عرب لوگ بغیر مرچوں کے پوری مرغی ابال لیتے تھے اور پھر باہر سے ایرانی کی دکان سے نان لے آتے تھے۔ جنوبی امریکہ (چلی، برازیل، کولمبیا وغیرہ) کے لوگ سبزیاں پکاتے تھے۔ گوشت میں سب سے مہنگا گائے کا گوشت تھا اور سبزیوں میں بیگن تھا جو اسپین اور مراکش سے آتا تھا۔ تقریباً ہر چیز سبزی اور پھل باہر کے ممالک سے خصوصاً جنوبی ممالک سے (جہاں سردی قدرے کم ہوتی ہے) منگوایا جاتا تھا۔

ایک مرتبہ چھٹی والے دن راحت عزیز اور میں ہاسٹل میں ٹہلتے ٹہلتے گھانا کے جہاز ران کیپٹن پٹیر کے کمرے میں چلے گئے۔ پیٹر چولہے کے پاس کھڑا تھا اور بازار سے لائے ہوئے تقریباً ایک ایک پاوڈر کے دو ڈبے کھول رہا تھا۔

"پیٹر کیا کر رہے ہو؟" راحت نے اس سے پوچھا۔

"رات کا کھانا تیار کر رہا ہوں۔" پیٹر نے جواب دیا۔

"لیکن یہ دودھ جیسے سفید پاوڈر سے کیا بنا رہے ہو؟"

"فو فو (Fu Fu) بنا رہا ہوں۔"

"فو فو! یہ کس بلا کا نام ہے۔" ہم نے اس سے تعجب سے پوچھا۔

"کیا تم فو فو کو نہیں جانتے؟" اس نے ہمیں گھور کر جواب دینے کے بجائے سوال کیا۔

"نہیں کیپٹن پیٹر۔ بالکل نہیں جانتے کہ فو فو کیا ہوتا ہے۔ ہم تو آج سن رہے ہیں۔" میں نے اسے بتایا۔

"کمال ہے! اب ادھر ٹھہرو اور دیکھو کہ میں کیسے فو فو بناتا ہوں یہ بڑی لذیذ چیز ہے۔" پیٹر نے کہا اور دوسرا ڈبہ کھول کر اس میں سے پیلے رنگ کا پاوڈر نکال کر پہلے والے سفید پاوڈر کے ساتھ پانی میں ملا دیا۔

"یار اب اتنی دیر کون انتظار کرے گا تم ایسے ہی بتادو۔" ہم نے پیٹر سے کہا۔

"یار میں نے آپ سے کہا نہیں کہ جسٹ ویٹ اینڈ سی یہ بس ابھی تیار ہوا۔ یہی تو فو فو کی خاصیت ہے۔" کیپٹن پیٹر نے چٹکی بجا کر ہمیں بتایا۔

میں نے خالی ڈبے اٹھا کر اس پر سوئیڈش میں لکھا ہوا پڑھنے کی کوشش کی تاکہ کچھ اندازہ ہو سکے کہ پیٹر کیا بنانے کے موڈ میں ہے۔ ایک پر POTATO MOS لکھا تھا جس سے اندازہ ہوا کہ آلو کا پاوڈر ہے جس کو پکانے سے شاید کچلے ہوئے آلو بن جائیں گے۔ دوسرے ڈبے میں چاول تھے یا مکئی کا آٹا یا ہو سکتا ہے دودھ ہو۔ پیٹر دونوں چیزوں کو پانی میں گھول کر چولہے پر پکاتا رہا۔ راحت سے میں نے اردو میں کہا۔ "یہ پیٹر ضرور سوجی کے حلوے جیسی کوئی چیز بنا رہا ہے۔ اس میں خوب پستے بادام ڈالے جاتے ہیں اور بڑا لذیذ حلوہ بنتا ہے۔" میں نے پیٹر سے پوچھا۔ "اس ڈبے میں کیا تھا؟"

"یار مجھے خود پتہ نہیں۔" پیٹر نے کہا۔ "لیکن ان دونوں پاوڈروں میں بہت ساری وٹامن اور کاربوہائیڈریٹ ہیں۔ جب تیار ہو جائے گا تو ہم سب مل کر کھائیں گے۔ میں روز چاول کھا کھا کر تنگ آگیا ہوں۔"

"بھلا اس کی قیمت کیا ہے؟" میں نے پیٹر سے پوچھا۔

"یہ ڈبہ 16 کرونا (یعنی 90 روپے کا) ہے اور دوسرا 24 کرونا (135 روپے کا) ہے۔"

یہ سن کر راحت عزیز نے مجھے اردو میں کہا۔ "یار یہ کیپٹن پیٹر بھی بے وقوف آدمی ہے۔ مجھے تو آج تک یہ سمجھ میں نہیں آیا کہ یہ جہاز رانی کیسے کرتا ہے۔ اب ذرا سوچو جب شہر میں تازے آلو اور مکئی موجود ہیں تو 40 کرونے خرچ کرکے ان کا پاوڈر لانے کی کیا تک ہے۔"

بہرحال ہم دونوں تجس سے پیٹر کو دیکھتے رہے یہ کب فو فو تیار کرتا ہے او روہ کیا چیز ہے۔ ہو سکتا ہے یہ دودھ نما مکسچر ابل ابل کر کوئی کیک پیسٹری بن جائے جو بنی بنائی شہر میں 40 کرونوں سے مہنگی ہو۔ مجھے میٹھا بہت اچھا لگتا ہے اس لئے میں میٹھے کے خواب دیکھنے لگا۔

"پیٹر چینی اور پستے بادام تو ڈالو۔" کیک پیسٹری کا سوچ کر میں نے پیٹر کو یاد دلایا۔

"فو فو میں یہ چیزیں نہیں ڈالی جاتیں۔" پیٹر نے جواب دیا۔

"تو پھر کیا ڈالا جاتا ہے؟" راحت عزیز نے پوچھا۔

"تم بس انتظار کرو اور دیکھو۔" پیٹر نے دودھ کے مکسچر کو لکڑی کی ڈوئی سے گھماتے ہوئے ہمیں صبر کی تلقین کی۔ "بس اب دو منٹ میں فو فو تیار ہو جائے گا۔ بہت مزیدار اور وٹامن سے بھرپور ہے۔

راحت اور میں ایک دوسرے کی طرف دیکھ کر پھر کیپٹن پیٹر کو دیگچی میں زور زور سے ڈوئی گھماتا دیکھنے لگے۔

"پیٹر بھلا یہ تو بتاوٴ کہ یہ فو فو بنانا تمہیں کس نے سکھایا؟"

"مجھے میرے ایک ہم وطن حاجی جمعہ نے سکھایا۔ وہ گھانا کی جہازران کمپنی بلیک اسٹار پر کیپٹن رہا ہے۔ اس کے جہاز پر ایک فلپائنی باورچی یہ فو فو بناتا تھا۔" پیٹر نے کہا۔

کیپٹن حاجی جمعہ کا بھی تعلق گھانا سے تھا اور کیپٹن پیٹر کے ساتھ اپنے ملک کی نمائندگی کرنے آیا تھا وہ بھی ہماری بلڈنگ میں چوتھی منزل پر موزمبیق، کینیا اور سینیگال کے جہاز رانوں کی پڑوس میں رہتا تھا۔ کیپٹن جمعہ اکثر جمعہ نمماز پر نیلے رنگ کے ڈھیلے ڈھالے کرتے میں مالمو کی مسجد میں نظر آتا تھا یا اپنے کمرے کے دروازے کا تالا توڑتے ہوئے نظر آتا تھا۔ ہر مہینے یا ڈیڑھ کے بعد اس سے چابیاں گم ہو جاتی تھیں اور اسے تالا توڑنا پڑتا تھا۔

راحت عزیز نے کہا۔ "اللہ خیر کرے! ایک پیٹر کا درویش قسم کا ہم وطن کیپٹن حاجی جمعہ، دوسرا اس کا بے سرا جہاز جو صرف برازیل، گھانا روٹ پر ہی چلتا رہتا تھا اور سوائے چند دن ان کنگلی بندرگاہوں میں رہنے کے علاوہ باقی دن سمندر پر گزرتے تھے اور اس پر سونے پر سہاگہ کہ فلپائنی باورچی! جہاز چلانے والے فو فو قسم کے ہی کھانے کھاتے ہونگے۔"

اتنے میں پانی خشک ہو گیا۔ پیٹر نے دیگچی نیچے اتار کر اس میں سے ہاتھوں سے آٹا نکال کر گوندھنے لگا۔

"بس بن گیا فو فو؟" ہم نے پیٹر سے پوچھا۔

"جی ہاں بس بن گیا فو فو۔ اب اس میں مرغی کا سالن ملاوٴں گا تو پھر چکھ کر دیکھنا۔" پیٹر نے کہا۔

دوسری دیگچی کا ڈھکنا اتار کر دیکھا تو پانی جیسے شوربے میں مرغی کی دو ٹانگیں تیر رہی تھیں۔ پیٹر یہ سب گوندھے ہوئے گرم آٹے میں ڈال کر سب کو ہاتھوں سے ملانے لگا۔

"یار مجھ سے تو نہیں کھایا جائے گا۔" راحت نے مجھے آہستہ سے کہا۔

"پیٹر ہم تو نہیں کھائیں گے۔" میں نے ہمت سے کام لے کر پیٹر سے کہا۔

"کیون نہیں کھاؤ گے؟" پیٹر نے کمر پر ہاتھ رکھ کر کچھ ناراضگی سے پوچھا۔

"ہم لوگ کھانا کھا چکے ہیں۔" میں نے جان چھڑانے کے لئے بہانہ بنایا۔

"تو مجھے پہلے بتادیتے تو آدھا آدھا ڈبہ میں دوسرے ہفتے کے لئے بچاکر رکھ دیتا۔" پیٹر نے کہا۔

"چلو کوئی بات نہیں پیٹر۔" راحت نے اسے سمجھایا۔ "اب پاؤ ڈر کے بجائے پکا پکایا فو فو فریزر میں رکھ دینا۔ آنے والے چھٹی کے دن کے لئے۔"

پاکستانی تاجر

سوئیڈن کے بڑے شہروں یعنی مالمو، اسٹاک ہوم، گوتا برگ وغیرہ میں ہفتے میں دو یا تین مرتبہ جمعہ بازار کی طرز کے سستے بازار لگتے ہیں جس میں لوگ اسٹالوں پر اشیاء سجاکر بیچاکرتے ہیں۔ ان میں اکثریت طلاق یافتہ خواتین کی ہوتی ہے جو گھر کا سامان فروخت کرنے کیلئے آتی ہیں۔ مقامی قانون کے مطابق طلاق کے بعد جہیز کے سامان سمیت گھر کا پورا سامان لڑکی کا ہو جاتا ہے۔ لڑکے کو تین کپڑوں میں بلکہ دو کپڑوں یعنی پینٹ اور شرٹ میں گھر چھوڑنا پڑتا ہے۔

کچھ سامان ان دکانوں کا ہوتا ہے جو مناسب گاہک نہ ملنے کے باعث سامان فروخت نہ ہونے کی وجہ سے بند ہوجاتی ہیں اور کچھ سامان ان لوگوں کا ہوتا ہے جو عارضی یا مستقل طور پر سوئیڈن چھوڑکر دوسرے ملک کوچ کر جاتے ہیں۔ یہ سامان بہت سستا بلکہ اگریوں کہاجائے کہ کوڑیوں کے مول بکتا ہے تو بے جانہ ہوگا۔ ہمارے جیسے ایشیائی یا افریقی باشندوں کے علاوہ ان مارکیٹوں میں یہاں کے مقامی امراءبھی نظر آتے ہیں اور ہر ایک کو کوئی نہ کوئی کار آمد چیز مل جاتی ہے۔

ایک دفعہ دو افغان لڑکیاں ڈھیر سارے نئے سویٹر اور قمیصیں بیچ رہی تھیں۔ سوئیڈن اور ناروے جیسے ممالک میں ہر قسم کے کپڑے بہت مہنگے ملتے ہیں۔ معمولی سامفلر بھی چار پانچ سو روپے سے کم نہیں ملتا اور یہاں یہ لڑکیاں دو تین سو روپے میں سوئٹر بیچ رہی تھیں۔ میں نے ایک افغان لڑکی سے سویٹر خرید نے کے بعد ان کی کم قیمت کی وجہ پوچھی تو اس نے بتایاکہ ہمارے مرد پڑوسی ملک جرمنی میں کپڑوں کی فیکٹری میں کام کرتے ہیں اور ہر مہینے فیکٹری والے صحیح طرح نہ بنے ہوئے مسترد کردہ کپڑے تول کے حساب سے نیلام کرتے ہیں جو ہم لوگ خرید کر یہاں بیچتے ہیں۔

ہم نے غور سے خریدے ہوئے سوئٹر اور قمیصوں کو دیکھا لیکن جب ہمیں ان میں کسی قسم کی خرابی نظر نہ آئی تو ہم نے لڑکیوں سے دوبارہ پوچھا۔ انہوں نے جواب دیاکہ "اس کے بارے میں ہم آپ کو کچھ نہیں بتاسکتے کیونکہ اگر ہم نے یہ راز آپ کے سامنے اگل دیا تو آپ ہم سے یہ اشیاءنہیں خریدیں گے۔" ہم نے انہیں سمجھایاکہ "دیکھو ہمیں جو لینا تھا وہ ہم لے چکے اور آپ نے ہم سے لی ہوئی رقم بھی اپنے پرس میں ڈال لی ہے۔ ان میں چاہے کتنا

ہی بڑا نقص کیوں نہ ہو ہم تو یہی لے سکتے ہیں۔ بڑی دکان یا ڈپارٹمنٹل اسٹور سے ہم یہ اشیاءتوکیا موزے اور بنیان بھی نہیں لے سکتے۔"

یہ سن کر ایک لڑکی نے مسکرا کر ایک سوئٹر اٹھایا اور کہاکہ "دیکھیں ان کی سلائی سیدھی لائن میں نہیں ہے اور قمیصوں کی جیبوں کی دھاریاں باقی قمیص کی پٹیوں سے مطابقت نہیں رکھتی۔" میرے ساتھ میرین چیف انجنیئر راحت عزیز بھی تھا اس نے ہنس کر کہا "یہ تو کوئی خامی نہیں ہوئی اور دوسری بات یہاں کی سردی میں ہر وقت قمیص کے اوپر جیکٹ اور اوورکوٹ پہننا پڑتا ہے۔ یہاں پر قمیص کا صرف کالر ہی سلامت ہو تو بھی چلے گا۔"

"لیکن سوئیڈن کے لوگ اس معاملے میں بڑے نخرے والے ہیں۔ وہ ایک بڑی دکان سے تین ہزار روپے کی قمیص یا بنیان خریدلیں گے لیکن معمولی نقص والی چیز مفت میں بھی قبول نہیں کریں گے۔"

سوئیڈن کے بارے میں ایک افغان تاجر لڑکی کی یہ رائے کسی حد تک بالکل صحیح ہے۔ اور یہی حال اس طرف کے دوسرے امیر ممالک یعنی ناروے، ڈنمارک، فن لینڈ، ہالینڈ، بیلجئیم وغیرہ کا ہے۔ راٹرڈم کے ایک مقامی ترک دکاندار نے بتایا "ایک مرتبہ خریداری کے سلسلے میں پاکستان بھی گیا تھا۔ مسلمان ہونے کے ناتے میں اپنی دکان پر پاکستانی چادریں اور تولئے رکھنا چاہتا تھا اور پاکستان کی یہ چیزیں مجھے کافی سستی پڑیں لیکن افسوس کہ یہاں راٹرڈم میں نہ چل سکیں کیونکہ ان کی فنشنگ اچھی نہیں تھی۔"

ناروے کے شہر اوسلو کے ایک خوبصورت علاقے میں ایک پاکستانی کی اعلیٰ قسم کی دکان ہے جہاں پر زیادہ تر چمڑے کی مصنوعات فروخت کی جاتی ہیں جو وہ بھارت سے درآمد کرتا ہے۔

میں نے اس سے پوچھا "یہ مصنوعات تو پاکستان میں بھی اعلیٰ قسم کی بنتیں ہیں آپ وہاں سے کیوں نہیں منگواتے؟"

"ابھی بتاتا ہوں۔" اس نے جواب دیا۔ چائے پینے کے بعد وہ مجھے دکان کے تہہ خانے میں بنے گودام میں لے گیا جہاں ایک کونے میں ڈھیر ساری چمڑے کی جیکٹیں پڑی تھیں جن کو وہاں پڑے پڑے پھپھوندی لگ چکی تھی۔

"دیکھو پیارے!" دکاندار نے بتایا۔ "پاکستان سے ایک شخص نمونہ لے کر آیا تھا جس پر ہم نے آرڈر بھی بھیجا۔ ہم نے اس سلسلے میں خصوصی تاکید کی تھی کہ مال اس نمونے کے مطابق ہی آنا چاہیے اور اس میں کہیں بھی کوئی داغ دھبہ یا جوڑ نہیں ہونا چاہیے۔"

"اور اس نے یہ خراب مال بھجوا دیا۔" میں نے کہا۔

"نہیں۔" دکاندار نے جواب دیا اس نے مال صحیح بھیجا اور ہمارا مال بک بھی گیا پھر دوسری مرتبہ ہم نے اس سے بھی زیادہ مال کا آرڈر بھیجا اور جب مال آیا تو گٹھری کھولنے پر پتہ چلاکہ اس مرتبہ سارا کا سارا مال ہی ناقص اور گھٹیا بھیجا گیا ہے ہر ایک پر داغ دھبوں کے علاوہ پیچھے سے جوڑ تھے جو پاکستانی برآمدکنندہ تو شاید سمجھتا ہوگا کہ خریدنے والے کو پتہ ہی نہیں چلے گا لیکن یہاں ایسا نہیں ہے۔ یہاں کے لوگ مہنگے داموں پر چیز ضرور لیتے ہیں لیکن خراب چیز ہرگز نہیں لیتے اور یہ بات ہمارے پاکستانی تاجروں کو پتہ نہیں کیوں سمجھ میں نہیں آتی۔"

خودکشی اور طلاق

سوئیڈن میں خودکشی کے سب سے زیادہ واقعات ہوتے ہیں۔ دیکھا جائے تو ظاہری طور پر ہر ایک خوشحال ہے۔ اور یہ ملک دنیا کے بہترین ممالک میں شمار ہوتا ہے جہاں ہر ایک کے پاس رہنے کے لئے گھر اور تین وقت کے کھانے کے لئے حکومت کی طرف سے بے روزگاروں کو اس قدر موٹی رقم ملتی ہے کہ کئی لوگ چھوٹی موٹی نوکری کرنے کی بجائے بے روزگار رہنا ہی پسند کرتے ہیں۔ انگریزی میں ایک کہاوت ہے From womb to tomb تو یہاں سوئیڈن میں بچہ جب ماں کے پیٹ میں ہوتا ہے تو سرکار کی طرف سے اس کے لئے رقم ملنا شروع ہو جاتی ہے۔ پیدائش، حتی کہ اس کا کفن دفن بھی حکومت کی ذمہ داری ہے پھر بھی یہاں کے کئی لوگ زندگی سے مایوس ہو کر موت کو گلے لگا لیتے ہیں۔ دو سال قیام کے دوران مجھے اس کی بڑی وجہ انسان کی تنہائی لگی۔

سوئیڈن کے لوگ خود کو تنہا محسوس کرتے ہیں۔ ماں بیٹی، باپ بیٹا یا بھائی بہنیں سب الگ الگ ہیں۔ ہر ایک کی اپنی اپنی دنیا ہے جس میں وہ مگن رہتے ہیں بلکہ جب تک مگن رہتے ہیں خوش رہتے ہیں لیکن معمولی ساغم انہیں پریشان کر دیتا ہے اور زندگی ان کے لئے ناقابل برداشت بن جاتی ہے۔ ایسے وقت پر ان کا کوئی پرسان حال نہیں ہوتا ہے اور لوگ اس پریشانی سے فرار کی ایک ہی صورت پاتے ہیں اور وہ ہے خودکشی۔ اس طرح تنہائی کا احساس سردیوں کی لمبی راتوں میں اور بڑھ جاتا ہے۔ اس لئے سردیوں میں خودکشی کے واقعات بہت زیادہ ہوتے ہیں۔ حکومت لوگوں کو مصروف رکھنے کے لئے سردیوں کے موسم میں ٹی وی چینل بڑھا دیتی ہے تاکہ اندھیری، سرد اور لمبی راتوں میں لوگ اکیلے سوچ سوچ کر پریشان اور زندگی سے بیزار ہونے کے بجائے ٹی وی دیکھنے میں مشغول رہیں۔

پاکستان سمیت ایشیا کے دیگر ممالک میں، یہاں تک کہ یورپ کے فرانس، اسپین، انگلینڈ جیسے ممالک میں رہ کر اس تنہائی کا اتنا احساس نہیں ہوتا کیونکہ ان جگہوں پر ہر وقت ایک میلے کا سماں لگا رہتا ہے۔ لیکن سوئیڈن، ناروے، فن لینڈ جیسے ممالک میں موسم سرما مایوسی کا پیغام لیکر آتا ہے۔ یہ کیفیت بحری جہاز پر بھی اس وقت محسوس ہوتی ہے جب شام ہو چکی ہو۔ حالانکہ صبح سویرے ہر کوئی ہشاش بشاش نظر آتا ہے۔ یہ مایوسی چاندنی راتوں میں عورتیں کو اور بھی بے چین کردیتی ہے چاہے چاند نظر آرہا ہو یا بادلوں میں چھپا ہوا ہو۔ قبطی ملکوں کے کئی لوگ اس ذہنی دباؤ ے اور تنہائی سے نجات پانے کیلئے شراب کا سہارا لیتے ہیں لیکن شراب کا خرچہ بھی ان کی مایوسیوں میں مزید اضافہ کرتا ہے اور حد سے زیادہ شراب نوشی ان کے لئے جان لیوا ثابت ہوتی ہے۔

سوئیڈن میں مقیم پاکستانیوں کی ایک محفل میں ایک پاکستانی نے مجھے بتایا کہ سوئیڈن میں طلاق کا رواج بہت زیادہ ہوتا جارہا ہے معمولی بات پر طلاق ہو جاتی ہے۔ طلاق کے بعد بچے ماں کے پاس رہتے ہیں یا باپ کے پاس اس کا فیصلہ فریقین خود کرلیتے ہیں یا عدالت سے رجوع کرتے ہیں۔

اس نے بتایا کہ اس کی بیٹی کے ساتھ پڑھنے والے سولہ بچوں کی پوری کلاس میں کوئی بھی بچہ ایسا نہیں ہے جس کے ماں باپ کی علیحدگی نہ ہوئی ہو یعنی کوئی بچہ ماں کے ساتھ رہتا ہے تو کوئی باپ کے ساتھ۔ اس پاکستانی کی یہ بیٹی بھی اس کی پہلی بیوی سے ہے جو سوئیڈش تھی اور اب اس سے طلاق لے چکی ہے۔

عالم برزخ میں

آج کل جہاز رانی کی بجائے میری مصروفیات جہاز رانوں کو جہاز سازی سے متعلق مختلف مضامین پڑھانا ہے جن میں اہم نیول آرکیٹکچر اور فن جہاز سازی ہے۔ مختلف ممالک کے جہاز سازی کے نت نئے طریقوں کا جائزہ لینے کے سلسلے میں مجھے کچھ عرصہ ہیلسنکی (فن لینڈ) میں رہنا پڑا تھا اور وہاں کی شپ یارڈ میں بنے جدید ترین چھوٹے بحری جہازوں (Ferries) پر ہیلسنکی سے اسٹاک ہوم، ٹالن اور کوپن ہیگن سفر کرنا پڑتا تھا۔ یورپ کی طرح مسافروں اور ان کی گاڑیوں کو سمندر کے چھوٹے حصے اکار کر ایک بندرگاہ سے دوسری بندرگاہ تک پہنچانے کے لئے فیریاں استعمال ہوتی ہیں جو دیدہ زیب ہونے کے ساتھ ساتھ آرام دہ بھی ہیں۔

دوران سفر میرا زیادہ تر وقت جہاز کے انجن روم یا کیبن میں گزرتا تھا۔ لیکن چائے پینے کے لئے جہاز کے ریستوران میں آجاتا تھا تاکہ مسافروں کے ساتھ گپ شپ لڑاسکوں یا ان کے دلچسپ قصے سن سکوں۔ ایک دفعہ میں دو نوجوانوں کے ساتھ بیٹھ گیا جو شکل و صورت سے ایرانی لگ رہے تھے۔ آپس میں فارسی اور سوئیڈش زبانوں میں گفتگو کررہے تھے "کیا تم ایرانی ہو؟" میں نے دائیں طرف بیٹھے ہوئے نوجوان کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

"نہیں میں عراقی ہوں۔" اس نے جواب دیا۔

"اور تمہارا ساتھی؟" میں نے پوچھا۔

"وہ ایرانی ہے۔ ہم دونوں سوئیڈن کے شہر گوتا برگ کے رہنے والے ہیں۔ اس وقت ہم ہیلسنکی کی سیر کی غرض سے آئے تھے اور اب کوپن ہیگن گھومنے جا رہے ہیں۔"

"اپنا ملک چھوڑ کر یہاں کیسے آنا ہوا؟" میں نے ایرانی سے سوال کیا۔

"میں خمینی صاحب کی طرز حکومت سے تنگ آکر یہاں بھاگ آیا ہوں اور اس نے صدام حسین کے ظلم سے نجات پانے کیلئے یہاں پناہ لے رکھی ہے۔"

"سوئیڈن میں رہنا آپ کو کیسا لگ رہا ہے؟" میں نے ان سے پوچھا۔

"اپنے ملک سے تو بہتر ہے لیکن ہم یہاں پر ہمیشہ رہنے کے لئے نہیں آئے ہیں۔ بس پاسپورٹ ملنے کا انتظار ہے جو ایک آدھ سال مزید رہنے کے بعد مل جائے گا جس کے بعد ہم امریکہ بھاگ جائیں گے، جو یہاں سے بدرجہا بہتر ہے اور وہاں ہر قسم کا موسم اور لوگ موجود ہیں۔"

"تو ابھی سے کیوں نہیں چلے جاتے؟" میں نے سوال کیا۔

"اس لئے کہ اس وقت ایرانی یا عراقی پاسپورٹ پر سوائے سوئیڈن کے اور کوئی ملک ہمیں لفٹ نہیں کرائے گا۔" ایک نے کہا۔

"ایک دفعہ سوئیڈن کا پاسپورٹ ہاتھ آجائے۔" دوسرے نے کہا۔ "تو پھر ہم دوسرے ملک میں سوئیڈش یعنی یورپی کے طور پر جانے پہچانے جائیں گے۔"

ناروے میں رہنے والا ایک پاکستانی بھی اسی قسم کے خیالات کا اظہار کرچکا تھا۔ "مجھے ناروے کی آب و ہوا اور ماحول بالکل پسند نہیں لیکن یہاں کی قومیت حاصل کرنے کے لئے یہاں رہنے پر مجبور ہوں۔ ایک دفعہ مجھے یہاں کی شہریت مل جائے تو اس کے بعد میں ایک نارویجن کی حیثیت سے چاہے سعودی عرب، کویت، دبئی، برونائی چلا جاؤں یا انگلینڈ، آسٹریلیا، نیوزی لینڈ مجھے اس کے لئے کسی ویزے کی ضرورت نہیں پڑے گی۔ میرے لئے ایک ملک سے دوسرے ملک جانا ایسے ہو جائے گا جیسے میانوالی سے چیچہ وطنی یا ٹنڈو آدم سے مٹیاری۔ اپنے پاکستانی پاسپورٹ پر مجھے کوئی عرب ملک ایک دن کے لئے بھی اپنی زمین پر قدم نہیں رکھنے دے گا ہر چند کہ میں کتنا ہی نیک نمازی، متقی اور پرہیزگار کیوں نہ ہوں اور چاہے میں ڈاکٹر، انجنیئر، قابل سائنسدان کیوں نہ ہوں۔ عرب ممالک پاکستانی، بھارتی اور بنگلہ دیشی باشندے کو ایک انتہائی کمتر سمجھتے ہیں لیکن کسی یورپی ملک کے پاسپورٹ کے ساتھ چاہے کوئی کالا چور ہی کیوں نہ ہو عرب لوگ اس کی عزت کرتے ہیں۔"

عراقی نوجوان سے میں نے پوچھا۔ "آپ لوگ کس زبان مین گفتگو کررہے تھے۔"

"سوئیڈش اور فارسی میں۔" اس نے جواب دیا۔

"عربی میں نہیں؟" میں نے پوچھا۔

"نہیں۔ اس لئے کہ میرے ساتھی کو عربی نہیں آتی۔"

"آپ نے فارسی کہاں سے سیکھی؟"

"یہاں آنے سے پہلے میں نے ایران کے ایک ہوٹل میں پانچ سال کام کیا تھا اور وہیں میں نے فارسی سیکھی۔"

"عراق کیوں چھوڑا؟" میں نے سوال کیا۔

"اپنا ملک کوئی نہیں چھوڑنا چاہتا۔ ہمارے ملک میں قدرت کی طرف سے ہر نعمت میسر ہے۔ ہمارے رہنما اچھے ہوتے تو ہمارا ملک سنگاپور، سوئیڈن، جاپان، اسپین سے بھی زیادہ خوشحال ہوتا۔ بے مقصد جنگوں میں ہمارے ہزاروں لوگ مارے گئے۔ ہمیں زبردستی لڑنے کے لئے مجبور کیا جاتا ہے۔ میری ماں نہیں چاہتی تھی کہ میں فوج میں جاؤں اور ایک بے مقصد جنگ جو ایک مسلمان دوسرے مسلمان کے خلاف لڑ رہا ہے اس میں حصہ لوں۔ وہی حال اس ایرانی نوجوان کا تھا۔"

"ایران اور عراق کے تعلقات آج کل کہاں تک پہنچے ہیں؟، میں نے پوچھا۔

"عالم برزخ میں ہیں۔" ایرانی نے جواب دیا۔

"کیا مطلب؟" میں نے وضاحت چاہی۔

'بس یہی کہ نہ اچھے ہیں نہ بُرے۔ آگے کیا ہونا ہے اس فیصلے کا انتظار ہے۔ جیسے انسان مرنے پر اچانک جنت یا دوزخ میں نہیں جاتا، فیصلہ ہونے تک اسے عالم برزخ میں ہی رہنا پڑتا ہے۔"

ٹائپنگ سیکھنا آسان نہیں

مالمو میں دو سال کے قیام کے دوران، ہر ایک کو اپنے اپنے مضمون پر تھیسز لکھنا تھا جسے ٹائپ بھی خود ہی کرنا تھا۔ ابتدائی دنوں میں ہی ہمارا ٹائپنگ ٹیسٹ لیا گیا۔ ایک یا دو انگلیوں سے ٹائپنگ کرنے والوں کو دو ہفتے کے لئے مالمو کے مقامی ٹائپنگ اسکول سے ٹائپنگ سیکھنے کے لئے کہا گیا۔ ان میں سے ایک میں بھی تھا۔ میرے علاوہ تقریباً بیس ملکوں کے نمائندے اور بھی تھے۔

ٹائپنگ اسکول میں ہمارا پہلا دن بڑے مزے کا گزرا۔ لیکن دوسرے تیسرے دن سے ہی ٹائپنگ کی کلاسیں ہمارے لئے درد سر بن گئیں۔ ہم سب نے یہی سوچا تھا کہ ایک دو گھنٹے کی ٹائپنگ سے ہمارا شمار ایسے ماہریں میں ہونے لگے گا جیسے پاکستانی عدالتوں کے سامنے بیٹھے ریٹائرڈ کلرک۔۔۔ جو ٹوٹے ہوئے ٹائپ رائٹر پر ٹائپ کرتے نظر آتے ہیں۔ لیکن پہلے دن ہی ہم لوگوں نے محسوس کیا کہ عشق نہیں ہے وہ کھیل جس سے کھیلے ہر کوئی کے مصداق ٹائپنگ سمجھنا اور بات ہے لیکن ٹائپنگ کرنا اور بات کہ میڈم انیلی کے دو لیکچر اٹینڈ کرکے بندہ دس انگلیوں سے ٹک ٹک، ٹک ٹک کرنا شروع کردے۔

ٹائپنگ سکھانے والی ستر سالہ سوئیڈش خاتون سے ہم نے اپنے خوف کا اظہار کرتے ہوئے کہا "ہم نہیں سمجھتے کہ دو ہفتے میں ہم لوگ ٹائپنگ میں مہارت حاصل کرلیں گے۔"

"بالکل نہیں کر سکتے۔" میڈم انیلی نے ہمت افزائی کرنے کی بجائے خبردار کرتے ہوئے کہا۔ "اس کے لئے تو آپ کو کم ازکم دس ہفتے گھر میں بیٹھ کر دل لگا کر مشق کرنا پڑے گی۔" میڈم انیلی نے 'دل لگا کر' کچھ اس طرح زور دے کر کہا جیسے عمر بھر ہم ٹائپنگ سیکھ ہی نہیں سکیں گے۔

ہم میں سے کئی لوگ تو دوسرے دن ہی اپنی قابلیت اور میڈم انیلی کا پیغام اچھی طرح سمجھ کر مزید ٹائپنگ سیکھنے کی بجائے ایک انگلی سے خط ٹائپ کرنے لگے جس کی ابتداء گھانا کی بندرگاہ کی ایڈمنسٹریٹیو افسر ایلس نے کی۔ جو بھی اس کے پاس سے گزرتا اس سے ضرور پوچھتا۔

"ایلس تم یہ کیا کر رہی ہو؟"

"خط لکھ کر وقت گزار رہی ہوں۔" ایلس نے جواب دیا۔

”کس کو بھئی؟“ آذربائیجان کے چنگیز نے پوچھا۔

”اپنے خاوند کو۔“ ایلس نے جواب دیا

”میرا سلام ضرور لکھنا۔“ چنگیز نے کہا۔

ایلس جس منزل پر رہتی ہے میرا فلیٹ بھی اسی منزل پر ہے۔

”ایلس میرا سلام بھی ضرور لکھنا۔“ میں نے ایلس سے کہا۔

جس پر اس نے تنگ آکر کہا کہ “الطاف صاحب کیا آپ نے مجھے پاگل سمجھا ہے کہ میں اپنے شکی مزاج شوہر کو، جسے گھانا چھوڑ کر یہاں آئی ہوں اپنے گروپ کے ان ارکان کا سلام لکھوں جو سارے کے سارے مرد ہیں؟“

چلو غصہ تھوک دو ان کے بجائے اپنے شوہر کو میرا سلام ضرور لکھنا۔ میرے جواب دینے سے پہلے کولمبیا پورٹ اتھارٹی کی ڈپٹی سیکریٹری اینا روزانے ایلس سے کہا۔

”اب تم لوگ خاموش ہوجاؤ اور مجھے خط مکمل کرنے دو۔“ ایلس نے کہا جس پر سب خاموش ہوگئے۔

اس وقت میری ایک جانب افریقی ملک گھانا کی میرین افسر فاطمہ ٹائپ کر رہی تھی جبکہ دوسری جانب مراکش کا کیپٹن امین تھا۔ دونوں عربی کے ساتھ ساتھ فرانسیسی بھی بول لیتے تھے۔ مراکش کے لوگ یورپی باشندوں کی طرح گورے بھی ہیں اور افریقی حبشی بھی۔ ان میں سے بعض لوگ ہسپانوی زبان بھی بولتے ہیں۔ کیپٹن امین فاطمہ کی طرح شیدی نسل کا ہے۔

فاطمہ نے مجھ سے کہا۔ “ایلس مردوں کے سلام کے ساتھ ساتھ اینا روزا کے سلام بھی اپنے میاں کو نہیں لکھے گی۔“

”کیوں؟“ مراکش کے کیپٹن امین نے پوچھا اور ظاہر ہے میں بھی یہی معلوم کرنا چاہتا تھا۔

”کہتی ہے اس کا میاں دل پھینک قسم کا آدمی ہے۔ کسی عورت کے بارے مین لکھوں گی تو پھر وہ اس کا پتہ مانگے گا۔“ فاطمہ نے بتایا۔

”تو پھر گھانا میں اس کو کس کے سہارے اکیلا چھوڑ آئی ہے۔“ میں نے فاطمہ سے پوچھا۔

”اس بات کی ایلس یہ وضاحت کرتی ہے کہ جہیز میں اسے جو نوکر اور نوکرانیاں ملی تھیں ان میں سے ایک آدم خور قسم کی حبشن کو خاوند کی نگرانی پر مامور کرکے آئی ہے۔ اس کے میاں کی گاڑی جیسے ہی پٹری سے اترنے کی کوشش کرتی ہے تو وہ خونخوار نوکرانی اس کے نٹ بولٹ کس دیتی ہے۔“

”توبہ! توبہ!“ مراکش کے امین نے کانوں کو ہاتھ لگاتے ہوئے مجھ سے کہا۔ “اسی لئے تو میں گھانا یا سینیگال کی کسی حبشن سے شادی نہیں کرنا چاہتا حالانکہ میرا ننھیال انہی ممالک میں ہے۔ میں نے تو اپنی ماں سے صاف صاف کہہ رکھا ہے کہ میں شادی کسی فرانسیسی لڑکی سے ہی کروں گا لیکن اس کا رنگ گورا ہونا ضروری ہے۔“

گھاناکی فاطمہ مراکش کے امین کا یہ آخری جملہ سن کر امین کو غصے سے دیکھنے لگی وہ کچھ بولنے کا سوچ رہی تھی کہ اتنے میں ٹائپنگ کی ٹیچر نے کلاس ختم ہونے کی خوشخبری سنائی۔

ٹائپنگ کی کلاس میں ہر ایک کو یہ انتظار رہتا تھا کہ کلاس کی انچارج میڈم انیلی حاضری لگالے تو انہیں ادھر ادھر گھومنے پھرنے کی آزادی ملے۔ انیلی نے پہلے دن ہی یہ مشورہ دیا تھا کہ پورے دو گھنٹے ایک جگہ ٹک کر ٹائپ کرنا نہیں چاہیے۔ پندرہ بیس منٹ ٹائپ کرنے کے بعد ایک دو منٹ ٹہلنا چاہیے۔ آدھی کلاس تو ایک دو منٹ ٹائپ کر کے پندرہ بیس منٹ ٹہلنے میں گزارتی تھی، خاص طور پر آذربائیجان کا چنگیز، ترکی کا حسن بقال، ماریطانیہ کا دبلا پتلا حبشی کیپٹن شیخنا غاوض تو ہروقت کھڑکی کے پاس کھڑے رہتے تھے جہاں سے نیچے سوئمنگ پول صاف دکھائی دیتا تھا۔

"آپ لوگ وقت ضائع کررہے ہیں۔" انیلی نے ایک دن ان کو خبردار کرتے ہوئے کہا۔ "اگلے سال جب آپ کو تھیسز خود ٹائپ کرنا پڑے گا تو آپ کو اس کا احساس ہوگا۔"

"ٹائپنگ سیکھنے سے فائدہ ہی کیا ہے؟" ماریطانیہ کے کیپٹن شیخنا نے ایک دن انیلی سے پوچھا۔

"کمال ہے۔" انیلی نے تعجب کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔ "سب سے بڑا فائدہ یہ ہے کہ جہاز کی راز دارانہ رپورٹیں آپ خود لکھ کر اپنے شپنگ آفس بھیج سکیں گے۔"

"لیکن میں تو اس کے باوجود ٹائپنگ کے لئے ایک خوبصورت سیکریٹری رکھوں گا۔" آئی وری کوسٹ (Ivory coast) کے کمانڈر مائیکل نے کہا۔

مائیکل مغربی افریقہ کے ملک کوٹاڈی آئی وری سے آیا تھا جو چند سال قبل آئی وری کوسٹ کہلاتا تھا۔ اس کی ایک بندرگاہ عابد جان خاصی معروف بندرگاہ ہے۔ جہاں ہمارے پاکستانی جہازوں کا بہت آنا جانا رہتا ہے۔ ٹائپنگ کلاس میں بیٹھے ہوئے کیپٹن عاشق بھی لگتا ہے وہاں کے بڑے چکر لگا چکا ہے اور عابد جان بندرگاہ اور آئی وری کوسٹ سے اچھی طرح واقف ہے تبھی تو کمانڈر مائیکل کی سیکریٹری والی بات سن کر اس نے منہ بنایا اور اردو میں مجھ سے کہا۔ "الطاف کبھی جہاز لیکر عابد جان گئے ہو؟"

"دو تین مرتبہ چاول لے کر گیا ہوں۔" میں نے جواب دیا۔

"اور عابد جان میں جو حور پریاں پھر رہی ہیں وہ تو آپ نے بھی دیکھی ہوں گی۔" کیپٹن عاشق نے کمانڈر مائیکل کی طرف نظریں گھما کر مجھ سے کہا اور میں سمجھ گیا کہ کیپٹن عاشق خان کو عابد جان کے کمانڈر مائیکل کی خوبصورت سیکریٹری رکھنے والی عامیانہ بات پر غصہ آیا ہے جس پر میں مسکرانے لگا۔

"بات تو ایسی کرتا ہے جیسے ہمیں اس کے ملک کا پتہ ہی نہیں۔ یا خود کو شاید شیراز یا مشہد کا سمجھتا ہے۔"

"یار عاشق رنگ پر نہ جاؤ۔ کچھ حبشنیں بھی بڑی خوبصورت ہوتی ہیں۔" عاشق کی بات کی ہم کبھی بھی مخالفت نہیں کرتے لیکن آج میرے منہ سے اچانک نکل گیا۔

"الطاف شاعروں والی باتیں نہیں کرو۔" عاشق نے مجھے سمجھانے کے انداز میں کہا۔ "معلوم نہیں تم کس موسم میں جہاز کو لے کر آئی وری کوسٹ گئے ہو اور نجانے کن حبشنوں کو وہاں دیکھا ہے۔ میری نظروں میں تو سب ایمی جیسی ہی ہیں۔"

"کپتان صاحب حد ہوگئی! آپ سینیگال کی ایمی کو ایسی ویسی سمجھتے ہیں؟"

پورٹ آفیسر ایمی جو ماشاءاللہ ہماری طرح ٹائپنگ میں فیل ہوکر اس ٹائپنگ کلاس میں پہنچی تھی اسے اپنا نام سن کر تشویش ہوئی اور مجھ سے پوچھنے لگی کہ کیا بات ہے۔ میں نے اسے ہاتھ کے اشارے سے تھوڑی دیر صبر کرنے کے لئے کہہ کر عاشق کی بات سنی جو طنز کررہا تھا۔

"بالکل صحیح کہتے ہو۔" میں نے عاشق کو انگریزی میں جواب دیا تاکہ ایمی بھی سن سکے۔ "یہاں سے واپسی پر ایمی کی شادی ہو رہی ہے۔ مجھے معہ اہل خانہ شرکت کی پیشگی دعوت مل چکی ہے۔"

عاشق نے ایمی کی طرف دیکھا۔ "کیپٹن عاشق"!

ایمی نے عاشق سے کہا۔ "ان دنوں اگر آپ کا جہاز ہماری بندرگاہ ڈاکار یا کسی پڑوسی ملک میں ہو تو آپ بھی ضرور آنا۔"

ایک دن ہمارا ایک ساتھی وسطی امریکہ کے ایک ملک نکاراگوا کا گونزا لے ٹائپنگ سکھانے والی سوئیڈش استانی سے پوچھنے لگا۔ "ہم مردوں کیلئے کونسا بیت الخلاءمخصوص ہے۔ یہاں Gents اور Ladies کی بجائے H اور D لکھا ہو اہے۔"

آپ لوگوں کے لئے H والاہے۔ سوئیڈش زبان میں مردکو HERR کہتے ہیں اور عورت کو DAME میڈم انیلی نے بتایا۔

"صحیح کہتی ہو۔" نکاراگواکے گونزالے نے کہا۔ "میں H والاعورتوں کا سمجھ کر D والے میں چلا گیا۔ لیکن دیواروں پر I Love Charles اور My boy friend is sexy جیسے جملے پڑھ کر سمجھ گیا کہ غلط جگہ پر آگیا ہوں۔"

"بہتر یہ ہے کہ ہم لوگ سوئیڈش سیکھ لیں۔" سعودی عرب کے لیفٹیننٹ کمانڈڑ خالد نے کہا۔

"لیکن اس سے پہلے سوئیڈش زبان کا ایک نمبر سات ہزار سات سو ستتر Sujstsensjuhundra sujuttiosjuضرور یاد کرنا۔" انیلی نے کہا۔

کھلائے پلائے اور پیمپر تبدیل کرے

کچھ عرصہ مالمو شہر کے وسط میں رہنے کے بعد مجھے شہر سے باہر دو کمروں والا فلیٹ کرائے پر مل گیا۔ یہاں زیادہ تر یورپ کے مختلف ممالک کے وہ لوگ رہتے ہیں جو سوئیڈن میں ملازمت کر رہے ہیں۔۔۔ یا کئی سال سوئیڈن میں رہنے کے بعد انہوں نے ہمیشہ کے لئے اس ملک میں رہائش اختیار کرلی تھی۔ بعض مقامی باشندے بھی

ہیں۔کچھ پاکستانی، ایرانی اور عرب بھی رہتے ہیں جنہوں نے یہاں سیاسی پناہ حاصل رکرکھی ہے ان میں سے اکثر لوگوں کی بیویاں سوئیڈش ہیں۔

اس علاقے میں لاوس روفوز نامی ہنگری کے ایک باشندے سے ہماری اچھی خاصی دوستی ہوگئی۔ روفوز کو انگریزی اتنی اچھی نہیں آتی تھی لیکن پھر بھی میری بات سمجھ لیتا تھا اورکچھ ڈکشنری کی مدد سے اپنی سنانے میں کامیاب ہوجاتا تھا۔ ہنگری سے آئے ہوئے اسے تقریباً آٹھ نو سال ہوچکے تھے۔ وہ یہاں اکیلا رہتا تھا اور ابھی تک شادی نہیں کی تھی۔ اس کی ایک گرل فرینڈ ہنگری میں واقع اس کے گاؤں بڈاپسٹ میں رہتی تھی جو سال میں ایک مرتبہ اس سے ملنے مالمو آتی تھی اور ایک بار وہ خود اس سے اور اپنے ماں باپ اور دیگر عزیزوں سے ملنے بڈاپسٹ جاتا تھا۔ وہ اپنی ہم وطنی گرل فرینڈ سے شادی کرنا چاہتا تھا لیکن اس کی گرل فرینڈ کا شاید ارادہ کہیں اور تھا۔ ایک دن میں نے مذاق مذاق میں روفوز سے کہا" تم کسی مقامی سوئیڈش لڑکی سے دوستی کیوں نہیں کرلیتے؟"

"یہاں کی لڑکیاں ہمیں اتنی لفٹ نہیں کراتیں۔" روفوز نے بتایا۔

"یار تم تو یورپی گورے ہو اور اس ناطے سے تو تم ان کے رشتے میں خالہ زاد چچا زاد ہوئے۔" میں نے کہا۔

"نہیں یہاں کی لڑکیاں صرف ناروے اور ڈنمارک والوں کو اپنا سمجھتی ہیں باقی پورے یورپ کے لوگوں کو ایسا ویسا ہی سمجھتی ہیں خصوصاً مشرقی یورپ کے ممالک البانیہ، ہنگری، آسٹریا، یوگو سلاویہ وغیرہ کے لوگوں کو تو بالکل جاہل اور اچھوت سمجھتی ہیں۔" روفوز جو یہاں کے ماحول سے اچھی طرح واقف تھا اس نے بڑے وثوق سے بتایا۔

"مجھے تو تمہاری بات پر یقین نہیں آتا۔" میں نے روفوز سے کہا۔ " میں بھی گزشتہ چھ ماہ سے اس ملک میں ہوں مجھے یہاں یورپی تو کیا کئی پاکستانی، عراقی، افغانی، ایرانی بھی نظر آئے ہیں جن کی بیویاں سوئیڈش ہیں۔"

"ہاں تم درست کہہ رہے ہو۔" روفوز نے میری تائید کرتے ہوئے کہا۔ "ان کی سوئیڈش بیویاں ہیں لیکن سوائے چند لوگوں کے باقی لوگوں کی بیویاں Problemetic Women (مسائل والی عورتیں)ہیں۔"

"کیا مطلب؟" میں نے روفوز سے وضاحت چاہی کیونکہ اس کے ایجاد کردہ پرابلم ویمن کے الفاظ میری سمجھ میں نہیں آئے۔"

"یہاں کی عورت سے شادی کرنا کوئی ایسا مشکل کام نہیں ہے لیکن ہم جیسے یورپی اور ایشیائی کو مسائل والی عورتیں ہی ملتی ہیں جن کے تین درجے ہیں۔" روفوز نے مجھے سمجھانے کی کوشش کی۔

"پہلے درجے میں وہ عورتیں شامل ہیں جو بڑھاپے کے قریب آگئی ہیں۔ جوانی اور حسن والے دن انہوں نے کہیں اورگزار لئے اور اب ان کو کوئی مڑکر نہیں دیکھتا۔ الہڑ جوانی کے دنوں کی دعوتوں اور ڈسکوکلبوں میں ان کے آگے پیچھے پھر نے والے بھنورے اب ان کو فون پر ہیلو بھی نہیں کہتے۔ تنہائی اور محرومی کا احساس ان کو دیمک کی طرح چاٹتا رہتا ہے۔ اس سے نجات حاصل کرنے کے لئے اس بڑھاپے میں انہیں کسی مستقل ساتھی کی ضرورت محسوس ہوتی ہے جس کے لئے وہ ہم جیسے لوگوں کی تاڑ میں رہتی ہیں۔

”دوسرے درجے کی وہ عورتیں ہیں جو خوبصورت نہیں ہیں بہت زیادہ موٹی بے ڈول جسامت کی ہیں۔ نفسیاتی یا ذہنی مریض ہیں۔ ان کا درد سر غریب ملک کا کوئی مجبور ہی لے سکتا ہے۔ یہاں کا پاسپورٹ اور رہائش اختیار کرنے والا ضرورت مند ہی اس قسم کی عورتوں کے نازنخرے اٹھا سکتا ہے اور ایسے ہی مرد پر یہ عورتیں اپنا رعب چلا سکتیں ہیں۔“

”تیسری قسم ان عورتوں کی ہے جن کی یہاں کے کسی مقامی مرد سے شادی ہوگئی اور پھر علیحدگی بھی ہوگئی۔ ہر مہینے میاں کی تنخواہ کا ایک حصہ حاصل کرنے اور حکومت کے سوشل سیکورٹی فنڈ سے رقم حاصل کرنے کیلئے انہوں نے بچے اپنے پاس رکھے ہیں لیکن شراب، کباب، دعوتوں، گھومنے پھرنے اور عیاشیوں کی وجہ سے نہ پیسہ بچتا ہے نہ اتنا وقت ملتا ہے کہ بچوں کی دیکھ بھال کرسکیں۔ ایسے مسائل والی یہاں کی عورتیں ہنگری، البانیہ، چیکو سلواکیہ جیسے غریب یورپی ملک کا باشندہ ڈھونڈتی ہیں یا پاکستان، بھارت، عراق جیسے کالے ایشیائی لوگوں کی تلاش میں رہتی ہیں جو گھر بھی چلائے ان کا خیال بھی رکھے اور پہلے شوہر (یا شوہروں) سے پیدا ہوئے بچوں کو کھلائے، پلائے اور ان کے پیمپر (Pampers) تبدیل کرے۔“

عربوں کا کچھ پتہ نہیں چلتا...

ہر ملک میں میری ٹائم سیفٹی ایڈمنسٹریشن نام کا ایک شعبہ ہوتا ہے جو بحری جہازوں، اس کے عملے اور مسافروں کی سلامتی کے حوالے سے کام کرتا ہے۔ بحری جہازوں کی سلامتی اور سمندروں کو آلودگی سے بچانے کے لئے جو ملکی اور بین الاقوامی قوانین بنائے جاتے ہیں ان کی تکمیل میں یہ شعبہ اہم کردار ادا کرتا ہے۔ ہمارے ملک میں یہ شعبہ مرکنٹائل میرین ڈپارٹمنٹ (MMD) کہلاتا ہے اور وزارت مواصلات کے ماتحت کام کرتا ہے۔ اس کے علاوہ بندرگاہیں، جہاز رانی، جہاز سازی سے تعلق رکھنے والے ادارے اور تعلیمی درسگاہیں (جیسا کہ پاکستان میرین اکیڈمی، سی مینس ٹریننگ سینٹر، میرین کالج وغیرہ) بھی وزارت مواصلات میں آتے ہیں۔ بعض ممالک میں جہاز رانی وزارت صنعت میں، میری ٹائم تعلیمی ادارے وزارت تعلیم میں اور ماہی گیری اور اس کے لئے استعمال کی جانے والی کشتیاں وغیرہ وزارت جنگلات میں آتی ہیں۔ بعض ممالک (جیسا کہ پانامہ اور نمیبیا) میں جہاز رانی اور شہری ٹرانسپورٹ وزارت انصاف میں آتی ہے۔

جیسے شہریت، معاشرتی علوم اور پولیٹیکل سائنس کے طالب علم کو بعض اہم ممالک کا آئین اور ان کے نظام حکومت کا مطالعہ کرنا پڑتا ہے اس طرح وہ جہاز ران جو میری ٹائم ایڈمنسٹریشن میں ایم ایس سی یا پی ایچ ڈی کرتے ہیں ان کو بعض اہم ملکوں کا میری ٹائم نظام سمجھنا پڑتا ہے۔ ہمارے وقت میں ان ممالک کے پروفیسر صاحبان مالمو (سوئیڈن) آکر لیکچر دیتے تھے اور پھر ماحول کو خوشگوار بنانے کے لئے ٹیکنیکل چیزوں کے ساتھ ہلکا پھلکا مذاق بھی کرتے تھے۔

ایک دفعہ ناروے کے پروفیسر کیپٹن اوز نے کہا۔ "دنیا کی نظروں میں وائیکنگ (VIKINGS) لٹیرے اور قزاق تھے یا سمندر کا مقابلہ کرنے والے دلیر جہاز ران لیکن اس حقیقت کو کوئی نہیں جھٹلا سکتا کہ وہ دنیا کے بہترین جہاز ران (Navigators) تھے جو سب سے پہلے دنیا کے دور دراز ساحلی علاقوں تک پہنچے تھے۔ ان کی کشتیاں براستہ آئس لینڈ اور کینیڈا امریکہ آتی جاتی تھیں۔ کولمبس کے امریکہ دریافت کرنے سے پانچ سو برس قبل ناروے کا مشہور جہاز راں لیف ارکسن وہاں پہنچا تھا جس کے کئی ثبوت موجود ہیں۔ بہر حال سمندر میں رہنے والے ان ملاحوں نے جہاز رانی اور جہاز سازی کی کئی بنیادی چیزیں ہمیں مہیا کی۔"

فرانس کے پروفیسر باکسیل نے اپنے ملک کے جہازوں کی دنیا کے بارے میں بتاتے ہوئے کہا۔ "شروع شروع میں تو فرانس کا سمندری دنیا کی طرف رجحان نہیں تھا لیکن ناروے کے وائیکنگز (بحری قزاقوں) نے ایسا ہمارے ناک میں دم کیا کہ ہمیں مجبوراً اپنے بچاؤ کے لئے ہاتھ پاؤں مارنے پڑے اور ان سے مقابلہ کرنے کے لئے اپنے جہاز بنانے پڑے بہر حال اس خیال سے ہم ناروے والوں کے شکرگزار ہیں۔"

اپنے ملک کی میری ٹائم ایڈمنسٹریشن کے بارے میں بتاتے ہوئے انہوں نے کہا۔ "فرانس کا مرکنٹائل میرین ڈپارٹمنٹ انتہائی پیچیدہ ہے۔ دس سال نوکری کرنے کے بعد اس کے ملازم کو یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ اس کا باس کون ہے اور یہ ڈپارٹمنٹ کس کس وزارت کے ماتحت ہے کیونکہ اس ڈپارٹمنٹ کے مختلف سیکشن مختلف وزارتوں کے تحت کام کرتے ہیں۔" اور پھر ہنس کر کہا۔ "بعض ممالک کا تو پورا نظام ہی نرالا ہے۔ امریکی عوام ملک کے لئے جو صدر چنتی ہے اسے معاشقہ تک نہیں کرنے دیتی روس اپنے رہنما کا چناؤ کمیونسٹ پارٹی کے اہم ارکان میں سے کرتے ہیں اور وہ اہم ارکان کے ساتھ مل کر عیاشی کرتا ہے۔ چین کے کروڑوں باشندے بعض نمائندوں کو حکومت چلانے کے لئے کہتے ہیں جو اپنا ایک رہنما سامنے لاتے ہیں جو پوری عوام کا مقابلہ کرتا ہے۔ ویٹیکن کا رہنما پوپ جان پال عوام یا کسی اور کا جوابدہ ہونے کے بجائے خود کو آسمانی طاقت کا ماتحت سمجھتا ہے۔ لیٹن جنوبی امریکہ کی قیادت کا کچھ پتہ نہیں چلتا کوئی اوپر تک پہنچتا ہے تو کچھ دنوں کے بعد پتہ چلتا ہے کہ اسے کسی نے مار دیا اور دوسرے نمبر والا رہنما بن گیا۔ کبھی کبھی یہ قوم کا رہنما نمبر دو والے کو مروا دیتا ہے اس خوف سے کہ کہیں وہ اس کی چھٹی نہ کردے۔ اٹلی میں الگ الگ ٹولے اپنے علاقوں میں راج کرتے ہیں جن کی مافیا کا ایک رہنما ہوتا ہے۔ یونان میں ایک فوجی جنرل کے اوپر دوسرا جنرل ہوتا ہے۔ دوسرے کے اوپر تیسرا اور چوتھا حکومت کرتا ہے۔ عربوں کا کچھ پتہ ہی نہیں چلتا کہ حاکم کے مرنے یا ملک بدر ہونے کے بعد کس کی باری آئے گی۔ نیا حاکم عوام میں سے ہوگا یا وفات پانے والے حاکم کا بیٹا، بھائی یا بھتیجا ہوگا۔"

افریقہ کی مس ایمی

مڈغاسکر، سیچلس، زنجبار، موریشس جیسے جزیرے ملاکر براعظم افریقہ کے تقریباً 40 ممالک بنتے ہیں جن میں سے ہر ملک سے ایک یا دو نمائندے ورلڈ میری ٹائم یونیورسٹی مالمو (سوئیڈن) میں دو سال کے لئے آتے ہیں

آج سے 25 یا 30 سال قبل جب نہر سویز بند ہونے کی وجہ سے ہمارے جہازوں کا افریقہ کی کئی بندرگاہوں پر جانا ہوتاتھا تو وہاں کے مقامی لوگ جہاز رانی اور جہاز سازی وغیرہ میں اتنے ترقی یافتہ نہیں تھے۔ موزمبیق اور روانڈا جیسے ملک تو ابھی آزاد بھی نہیں ہوئے تھے۔ لیکن اب حالات تبدیل ہوچکے ہیں۔ تقریباً ہر افریقی ملک کی اپنی جہاز ران کمپنی ہے، بندرگاہوں کا انتظام اور جہاز چلانے کا کام انکے مقامی لوگ کرتے ہیں۔ نائیجیریا، کینیا جیسے ممالک میں جہاز رانی کی تعلیم دینے کے لئے میری ٹائم اکیڈمیاں موجود ہیں جن میں ان کے اپنے لوگ پڑھاتے ہیں۔ ان کے اپنے ماہر معاشیات اور شپ چارٹرز ہیں۔ مرد تو کیا ان کی خواتین بھی اس میدان میں آچکی ہیں۔ سوئیڈن کی اس یونیورسٹی میں میرے ساتھ مختلف افریقی ممالک کے سینئر افسران میں کئی خواتین بھی تھیں اور ان میں مسلمان خواتین بھی شامل تھیں۔

ان میں ایک سینیگال کی بندرگاہ ڈاکار کی پورٹ آفیسر مس ایمی بھی تھی۔ ایمی اپنے بالوں کے اسٹائل کی وجہ سے سب میں نمایاں تھی۔ اسٹائل تو کیا خاک تھا (کوئی دلیپ کٹ یا وحید مراد کٹ بال نہیں بنے ہوئے تھے) ایک یا دو چٹیوں کی بجائے اس نے سینکڑوں چٹیاں کر رکھی تھیں جن میں سے ہر ایک چٹیا تقریباً دس بیس بالوں کی ہوگی اور یہ چٹیاں اتنا کھینچ کر بنائی گئی تھیں کہ ان کا دو تین سال تک خودبخود کھل جانا مشکل تھا۔ آخر تقریباً ڈیڑھ سال بعد ایمی نے اپنی سہیلی کی مدد سے انہیں ایک ایک کرکے بڑی مشکل سے کھولا۔ ایمی نے بتایا کہ سینیگال کے جنگلوں میں ایک خاص قبیلے کی حبشنیں ہوتی ہیں جو اس قسم کا آرٹ ورک کرتی ہیں اور ایمی نے اپنے بال اس طرح اس لئے بنوائے تاکہ اس کا روزانہ بال بنانے میں وقت ضائع نہ ہو اور دوسرا سبب یہ تھا کہ (جو ایمی نے نہیں سعودی عرب کے جہازراں نمائندے کمانڈر صالح نے بتایا تھا) کہ اگر ایمی اپنے بالوں کو ایسے کھینچ کر نہ رکھے گی تو اس کا سر قراقلی ٹوپی کی طرح نظر آئے گا اور اس صورت میں ایمی کو دوسری حبشی عورتوں کی طرح سر پر رومال باندھ کر چلنا پڑے گا۔

ایمی کی مادری زبان کوئی قبائلی قسم کی افریقی زبان تھی مگر اس نے تعلیم فرانسیسی زبان میں حاصل کی تھی کیونکہ سینیگال فرانس کی کالونی رہ چکا ہے لہذا وہاں فرانسیسی زبان میں ہی تعلیم دی جاتی ہے۔ ایمی نے سوئیڈن کی اس یونیورسٹی میں اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے لئے دوسروں کی طرح انگریزی سیکھنے کا چھ مہینے کا کورس یہاں آکر کیا تھا۔ ایمی کی حس مزاح قابل تعریف تھی۔ حاضر جوابی اور لطیفے اس کی وجہ شہرت تھے۔

صحیح انگریزی نہ آنے کی وجہ سے فرانسیسی بولنے والوں کے ساتھ تو ایمی خوب سوال و جواب کرتی تھی لیکن بات چیت انگریزی میں شروع ہوتی تو کم بولتی تھی۔ اس کے بعد جب دوسرے سال کے آخری آدھے حصے تک اس نے انگریزی میں مہارت حاصل کرلی تو ہمیں احساس ہوا کہ ایمی نہ صرف حاضر جواب ہے بلکہ پڑھائی میں بھی تیز ہے حالانکہ وہ شکل سے خاصی بے وقوف سی لگتی تھی۔ وہ پروفیسر صاحبان جو فرانسیسی بولتے تھے ایمی کو ذہین قرار دیتے تھے۔

ایک دن معاشیات کے فرانسیسی پروفیسر کیپٹن حوسن نے شپنگ اکنامی کا ایک مشکل سوال پوچھا جس کا کوئی جواب نہیں دے سکا تو ایمی کھڑی ہوگئی۔ پیچھے سے ایرانیوں اور عرب جہاز رانوں نے اس کا مذاق اڑایا اور کہا کہ "ایمی خدا کے واسطے بیٹھ جاؤ۔ تم نے کبھی جہاز رانی کی ہے؟" ایمی نے جواب میں کچھ کہنا چاہا لیکن وہ صرف ہونٹ ہلاکر خاموش ہوگئی۔ "پاگل ہے یہ حبشن ایمی۔" بنگلہ دیشی کیپٹن حبیب نے مجھے اردو میں کہا۔ کولمبیا سے آنے والی ایک گوری لڑکی نے ایمی کو بیٹھنے کا اشارہ کیا اور وہ بالآخر بیٹھ گئی۔

پروفیسر نے ایمی کو بیٹھنے سے منع کرتے ہوئے ہمیں مخاطب کیا۔

"مجھے لگتا ہے ایمی کو اس کا جواب آتا ہے لیکن انگریزی میں کمزور ہونے کی وجہ سے اس کا جواب نہیں دے پا رہی ہے۔ ایمی مجھے اس کا جواب فرانسیسی میں بتاؤ۔" پروفیسر نے ایمی سے فرنچ میں بات کی اور ایمی فرانسیسی میں ایسے بولنے لگی جیسے یہ ہکلا کر انگریزی بولنے والی ایمی نہیں اس کے اندر کوئی جن بول رہا ہو۔ سوال کافی مشکل تھا لیکن اس نے جواب اتنا اچھا دیا (جو پروفیسر ہمارے لئے انگریزی میں ترجمہ کرتا گیا) کہ ہم لوگ کافی دیر تک تالیاں بجاکر ایمی کو داد دیتے رہے۔ ایمی اور دوسرے کئی افریقی ساتھیوں سے مل کر یہ تاثر غلط ثابت ہوتا ہے جو بچپن میں گوروں کے کتابوں میں افریقہ سے متعلق پڑھ کر قائم ہوا تھا کہ افریقہ کے کالے لوگ جاہل، کند ذہن اور نکمے ہیں۔ میرے خیال میں کسی کو بھی بہتر مواقع ملیں تو وہ اچھا ڈاکٹر، انجنیئر، پائلٹ، پروفیسر بن سکتا ہے۔ ایمی نے بتایا کہ وہ افریقہ کے ایک دور دراز گاؤں کی رہنے والی ہے جو ایسے گھنے جنگل میں تھا جہاں شہر کی ہوا بھی نہیں لگتی تھی۔ "پھر میری امی کو قریبی شہر میں رہنے والی ایک فرانسیسی ہیڈمسٹریس کے گھر میں کپڑے دھونے کا کام ملا۔ میں ان دنوں پانچ سال کی تھی۔ فرانسیسی مالکن نے مجھے پڑھایا پھر بعد میں مجھے اپنے ساتھ فرانس لے آئی اور اس طرح مجھے پیرس سے معاشیات میں ایم اے کرنے کا موقع مل گیا اور آج کل میں اپنے ملک کی سب سے بڑی بندرگاہ کی افسر ہوں۔"

ایمی کو دیکھ کر مجھے ہمیشہ اپنے گاؤں کی حبشن عورت ملوکاں شیدیانی یاد آتی تھی۔ ہم چھوٹے تھے تو ملوکاں ہمارے گھر کی صفائی اور روٹی پکانے کے لئے آتی تھی۔ ایمی اور ملوکاں کتنی ایک دوسرے سے ملتی ہیں۔ رنگ روپ، شکل و صورت میں، ایمی کا منہ ٹیڑھا کر کے فرانسیسی زبان میں بات کرنا اور ملوکاں کا سندھی میں بات کرنے کا انداز بھی ایک جیسا تھا۔ ایمی کی طرح ملوکاں کے بال بھی گھنگھریالے تھے اور ہونٹ موٹے تھے اور ملوکاں کی طرح ایمی کے کان بھی چار پانچ جگہوں سے چھدے ہوئے تھے جن میں سے مختلف ڈیزائن، سائز اور وزن کے جھمکے لٹکتے رہتے تھے۔ لیکچر ہال میں ایمی کی نشست مجھ سے اگلی لائن میں ہوتی تھی اور میں حیرت سے ایمی کو دیکھ کر سوچتا رہتا تھا کہ ہمارے گاؤں کی شیدیانی ملوکاں کو اگر لکھنے پڑھنے کے مواقع ملتے تو یقیناً وہ بھی پڑھ لکھ کر افسر بن جاتی یا یہ ایمی جو آج ہرے رنگ کے کوٹ پر پھولدار ٹائی لگاکر کالی میم بن کر آتی ہے،

پڑھایا لکھایا نہ جاتا تو ہمارے ملک کی ملوکاں کی طرح یا اپنی ماں کی طرح آج کسی کے گھر میں روٹی پکا رہی ہوتی یا کپڑے دھو رہی ہوتی۔ ملوکاں کے بچوں نے بھی اپنے ماں باپ کی طرح بچپن سے محنت مزدوری کی۔ اسکول کی کبھی باہر سے بھی شکل نہیں دیکھی۔ بہر حال یہ بھی اچھی بات ہے کہ ملوکاں کے پوتے پوتیاں، نواسے نواسیاں اسکول میں پڑھ رہے ہیں اور انشاءاللہ ایک دن ایمی جیسے افسر ضرور بن جائیں گے۔

"ایمی تم جب ساٹھ سال کی ہو جاؤ گی تو معلوم ہے کیسی لگو گی؟" ایک دن میں نے لیکچر ہال میں ایمی سے کہا۔

"یار کیوں ایمی کو تنگ کرتے ہو۔"

میرے برابر والی کرسی پر بیٹھے ہوئے بنگلہ دیشی شپنگ کارپوریشن کے چیف انجینئر فرقان نے ہنستے ہوئے کہا۔

ایمی کچھ کہنے کے بجائے مسکراتی رہی۔ "ایمی تمہارا کبھی ہمارے ملک آنا ہوا تو تمہیں تمہاری ہم شکل دکھاؤں گا۔" میں نے اسے کہا۔

ایمی صرف مسلمان نہیں بلکہ عملی مسلمان ہے یعنی صوم و صلوٰۃ کی بھی پابند تھی۔ کمرے میں ہر وقت سعودی عرب کے صالح کی طرف سے دیا ہوا تحفہ جائے نماز بچھا رہتا تھا۔ ماہ رمضان المبارک میں ہم سب کے ساتھ روزہ افطار کرتی تھی۔ سگریٹ نہیں پیتی تھی لیکن بیئر کے بغیر نہیں رہ سکتی تھی۔ ایک دن گنی بساؤ کی ایک لڑکی مریم نے اسے کہا کہ "ایمی تم کیسی مسلمان ہو؟ نماز پڑھتی ہو، روزہ رکھتی ہو اور بیئر بھی پیتی ہو۔"

"میں بار بار کہہ تو چکی ہوں کہ اس کا مجھے افسوس ہے۔ پیرس میں رہائش کے دوران اس کی پینے کی عادت پڑ گئی اب اس کا مطلب یہ تو نہیں کو میں نماز روزہ بھی چھوڑ دوں۔ دعا کرو ایک دن انشاءاللہ پینا چھوڑ دوں گی"۔ ایمی نے انگریزی کے چھوٹے چھوٹے جملوں میں حال دل سنایا۔

افریقہ سے آئے ہوئے ہمارے ان ساتھیوں کے لئے میں ابتداء میں یہ لکھ چکا ہوں کہ ان کا ایک جیسا کالا رنگ نہیں بلکہ اس کے بھی مختلف Shades ہیں۔ بعض افریقیوں کی جلد چکنی ہونے کی وجہ سے ان کا رنگ ایسا لگتا ہے جیسے کسی گاڑی کا Metallic کلر ہوتا ہے۔ سوڈان، چاڈ، زیمبیا جیسے ملکوں کے لوگوں کا تو ایک دم کوئلے یا توے کے نیچے والے حصے جیسا کالا رنگ ہوتا ہے۔ کچھ حبشیوں (افریقہ کے کالوں) کا چاکلیٹ نما کالا رنگ بھی ہے۔

افریقہ کے مغربی کنارے کے ملک سینیگال کی یہ ہماری ایمی اس قدر کالی تھی کہ بقول اردن سے آئے ہوئے جہازوں کے چیف انجینئر عبدالکریم کے ایمی کے کالے رنگ کی انتہا (Infinity) ہے۔ ریاضی میں Infinity لامحدود عدد کے لئے استعمال ہوتا ہے یعنی بڑے سے بڑا عدد جو سوچا جائے اس سے بھی بڑا نمبر یعنی ایمی کا کالا رنگ سوچ سے بھی زیادہ کالا ہے۔

ایک دن کوئی عالمی سیمینار ہو رہا تھا۔ ہمیشہ کی طرح میرے دائیں طرف بنگلہ دیش کا چیف انجنیئر فرقان بیٹھا تھا اور بائیں طرف مصر کا کیپٹن حنفی۔ ہم سے آگے والی نشستوں پر ایمی صاحبہ رومانیہ کے گورے کیپٹن کا ستروت کے ساتھ بیٹھی تھی۔ فرقان نے کچھ دیر ایمی کے چہرے کو غور سے دیکھ کر مجھ سے اردو میں کہا۔ "یار

ایمی کا رنگ کوئل جیسا کالا ضرور ہے لیکن اس کا ناک نقشہ بہت خوبصورت ہے۔ گوری ہوتی تو دیکھنے والوں کی خیر نہ ہوتی۔"

"بس صرف رنگ کی وجہ سے تو ایمی مار کھا گئی ہے۔" میں نے ہنستے ہوئے فرقان سے کہا۔ "ہمارے ایک سندھی شاعر امداد حسینی نے کسی خوبصورت لڑکی کے گورے گورے مکھڑے کو دیکھ کر ایک شعر کہا ہے جس کا مفہوم یہ ہے کہ اس کے آنے سے ایسا لگتا ہے جیسے چودھویں کا چاند نکل آیا ہے جبکہ اس کے جانے کے بعد انتیسویں کی تاریکی چھا جاتی ہے۔"

"اچھا ہوا تمہارے شاعر نے ایمی کو نہیں دیکھا ہے ورنہ اسے دیکھنے کے بعد اسے ضرور یہ کہنا پڑتا کہ ایمی کی موجودگی میں سورج کو بھی گرہن لگ جاتا ہے۔" فرقان نے کہا۔

"ویسے ایمی کو اپنے جیسے حبشیوں کے ساتھ بیٹھنا چاہیے یا ہم جیسے ایشیائی افراد کے ساتھ یہ ہمیشہ کسی یورپ کے بے انتہا گورے شخص کے ساتھ بیٹھتی ہے اور وہ بھی شمالی یورپ کے لوگوں کے ساتھ۔ اب رومانیہ کے گورے کیپٹن کاستروت کے ساتھ بیٹھنے سے وہ اور زیادہ گورا نظر آرہا ہے اور یہ اور زیادہ کالی۔"

ہم ایمی اور کاستروت کے بار بار نام لے رہے تھے۔ لیکچر جیسے ہی ختم ہوا تو دونوں نے مڑکر ہماری طرف دیکھا۔ "کیا معاملہ ہے؟" ایمی نے پوچھا۔

"ایمی ہم تمہارے حسن کی تعریف کر رہے ہیں۔" فرقان نے مسکرا کر کہا۔

"کیوں جھوٹ بولتے ہو۔" ایمی نے شرماتے ہوئے کہا۔

"قسم اٹھائیں کیا؟" میں نے ایمی سے کہا۔ "یہ بنگلہ دیشی کہہ رہا تھا کہ تم بلیک بیوٹی ہو۔"

"اور سفید رنگ کے بارے میں تمہارا کیا خیال ہے" ایمی کے ساتھ بیٹھے رومانیہ کے کاستروت نے پوچھا جس کا ہمارے پاس فی الحال کوئی جواب نہیں تھا۔

"ایمی یہ جھوٹ بول رہے ہیں۔" کاستروت نے ایمی کو خبردار کیا اور پھر ہمیں مخاطب ہو کر بولا۔ "انسان کا رنگ ایک ہونا چاہیے یا براعظم افریقہ میں رہنے والوں کی طرح کالا یا یورپ کے لوگوں کی طرح سفید۔ یہ کیا ہے کہ تم ایشیائی باشندوں کا رنگ نہ کالوں سے ملتا ہے اور نہ گوروں سے۔ تم لوگ نہ گدھوں کے ساتھ نہ گھوڑوں کے ساتھ۔"

کاستروت کی تقریر بیچ میں کاٹ کر فرقان نے ایمی سے کہا۔ "ایمی یہ تمہارا پڑوسی تمہیں گدھوں میں شامل کر رہا ہے۔"

"اب ہمیں نہ لڑاؤ میری بات کا جواب دو۔" کاستروت نے کہا۔

"بات سنو کیپٹن کاستروت" میں نے حال ہی میں آغا سلیم کے ایک افسانے میں پڑھی ہوئی بات اسے سنانا شروع کی۔ آپ دونوں سے ہم ایشیائی اچھے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے جب پہلا انسان مٹی سے بنایا تو وہ کچا یعنی سفید رہ گیا جو یورپ میں اتارا گیا۔ اس کے بعد اسے دوسری بھٹی میں ڈالا تو وہ زیادہ پک کر کالا ہوگیا۔ جسے افریقہ میں پھینکا گیا اس کے بعد تیسرا صحیح بنا جو نہ زیادہ کالا تھا نہ گورا، اسے ایشیاء میں رکھا گیا۔"

”چلیں اس خوشی میں تم لوگ چائے پلاؤ۔“کاستروت نے ماحول خوشگوار بنانے کے لئے کہا۔

”چلو میں پلاتا ہوں۔ ایسے مواقع کے لئے میں ہمیشہ جیب میں کھلے پیسے لئے پھرتا ہوں۔“ فرقان نے جیب میں ہاتھ ڈال کر سوئیڈن کے سکوں کو ہلایا۔ “ایمی تم کیا پیوگی؟کافی یا دودھ۔“

”یار ایمی سے زیادہ مذاق نہیں کرو۔“ میں نے فرقان کو تنبیہہ کرتے ہوئے کہا۔ “سمسٹر کی چھٹیوں میں افریقہ سے اس کا دیو جیسا میاں آدم بو آدم بو کہتا ہوا ضرور یہاں آئے گا اور تمہیں سرسوں کے دانوں میں تبدیل کردے گا۔“

ایمی ہنسنے لگی اور ہمیں کچھ بتانے کے لئے کیپٹن حنفی کو اشارہ کیا۔

”یارو ایمی کی ابھی شادی کہاں ہوئی ہے۔“ حنفی نے ہنستے ہوئے کہا۔ “مجھے بھی اس نے کل ہی بتایا ہے ابھی تو یہ 29 سال کی ہوئی ہے کہتی ہے بے نظیر کی طرح 34 سال کی عمر میں شادی کروں گی۔“

”بھئی یہ بے نظیر کی پیروی کیوں کرتی ہے؟“ میں نے حنفی سے کہا۔

”وہ میری پسندیدہ ہے۔“ ایمی نے جواب دیا۔

”آپ نے اس کے پرس میں بے نظیر کی تصویر نہیں دیکھی۔“ حنفی کہنے لگا۔ “کہتی ہے اس سے میرے شکل ملتی ہے۔“

بہرحال ایمی کی ایک ہی خوبی جو کئی خوبیوں کے برابر تھی (یا بقول مصری کیپٹن حنفی کے کئی خامیوں کے برابر تھی) کہ وہ بولتی بہت کم تھی۔ ہر وقت مسکراتی رہتی تھی۔ اسے جتنا بھی تنگ کیا جاتا غصہ نہیں کرتی تھی۔ میرے پاکستانی دوست خاص طور پر کیپٹن سلیم اور چیف انجنیئر راحت عزیز تو اسے”گونگی گائے“کہتے تھے اور میں ہمیشہ یہ کہتا تھا کہ یہ اتنی بڑی بندرگاہ کا کاروبار کیسے چلاتی ہوگی۔ بندرگاہ وہ جگہ ہوتی ہے جہاں پڑھے لکھے لوگوں سے زیادہ جاہل قسم کے لوگ ہوتے ہیں۔ مقامی مزدور لوگوں سے لے کر جہاز چلانے والے غیر ملکی لوگ، سامان اتارنے چڑھانے کے مسئلے،کرینوں اور ٹگ بوٹوں (Tug Boats) کے مسئلے، مزدوروں کی یونینوں کے مئلے ان سب مسائل کو یہ درویش صفت ایمی کیسے حل کرتی ہے۔ افریقہ کے مغربی کنارے کی بندرگاہ ڈاکار جہاں کی ایمی بالا آفیسر ہے کوئی پسنی یا گڈانی جیسی چھوٹی اور ویران بندرگاہ تو نہیں۔

بہرحال یہ سارے معمے اس وقت آہستہ آہستہ حل ہوتے گئے جب ایمی کی انگریزی اچھی ہوگئی۔ فرانسیسی بولنے والے جو ایمی سے فرانسیسی میں بات کرتے تھے وہ تو پہلے دن سے ہی یہ کہتے تھے کہ “ایمی نہ صرف لکھنے پڑھنے میں ہوشیار ہے لیکن بولنے میں بھی تیز ہے انگریزی گرامر اور ذخیرہ الفاظ کی کمی اس کی خاموشی کا سبب ہے۔“

دوسرے سال کی آخر میں ہمارے لئے گروپ کے مباحث رکھے گئے۔ دس دس لوگوں کا گروپ بنایا جاتا تھا گروپ والے آپس میں قرعہ اندازی کرکے ایک چیئرپرسن بناتے تھے اور کوئی عالمی مسئلہ جس کا تعلق جہازوں سے یا سمندر سے ہو اس پر پورا دن سوچ بچار کرتے تھے۔ اس کے حل کے لئے تجاویز تیار کرتے تھے اور مسائل کے حل کے لئے قوانین بناتے تھے وغیرہ وغیرہ۔

ایک دن میں اور میرا پاکستانی جہازراں ساتھی راحت عزیز، ایسے گروپ میں آگئے جس میں ایمی بھی تھی۔ چیئرپرسن کے لئے قرعہ اندازی کی تو ایمی کا نام نکل آیا۔ ہم بھی یہی چاہتے تھے۔ راحت عزیز نے بھی ایمی کا نام سن کر مجھ سے اُردو میں کہا۔ "یارو آج کا دن تو چھٹی ہی سمجھو، اس پگلی کی کون پرواہ کرتا ہے۔" جنوبی امریکہ کے چھ یا سات افراد جو ہسپانوی زبان بولنے والے تھے اور باقی افراد کا تعلق چین، ویتنام اور کوریا سے تھا، سب دل ہی دل میں خوش تھے کہ کام کم کریں گے اور آرام زیادہ۔ ہمیں سمندر کو تیل اور دوسرے کچرے سے صاف رکھنے کے لئے تدابیر سوچنا تھیں۔

کچھ دیر گرما گرم بحث ہوتی رہی ایمی نے ہم میں سے ایک کو سیکریٹری مقرر کیا تھا تاکہ وہ ہر بات کاغذ پر درج کرتا جائے، حالانکہ ہم میں سے کچھ لوگوں نے اس پر کچھ اعتراض بھی کیا لیکن ایمی نے طوطے کی طرح کہا کہ میں نے کہہ دیا ہے اس لئے ایسا کرنا ہوگا۔

کوریا کا کپتان کہنے لگا۔ "لگتا ہے ایمی اتنی بھی پاگل نہیں جتنی ہم سمجھتے ہیں۔" وہ کچھ اور بھی کہنا چاہتا تھا لیکن ایمی کے زور سے "شٹ اپ" کہنے پر وہ بیچارہ ایسا ہکابکا رہ گیا کہ وہ مزید کچھ نہ بول سکا۔

ساڑھے دس بجے چائے کا وقفہ ہوا۔ ویسے ہم جلدی جلدی چائے پی کر واپس آتے تھے لیکن آج راحت عزیز اور میں نے سینڈوچ کھانے کا سوچا۔ باقی لوگ چلے گئے ہم دونوں بیٹھے رہے۔ "یار آج ایمی ہے۔ اسے کون پوچھتا ہے۔" اتنے میں دیکھا تو خلیج بنگال میں بغیر اطلاع کے آنے والے سمندری طوفان کی طرح ایمی کینٹین میں چلی آرہی ہے۔ "جناب عالی یہ میرا اکیلے کا کام نہیں ہے۔ یہ ٹیم ورک ہے جس میں سب کو برابر کا حصہ لینا ہے۔ حصہ چاہے نہ بھی لو لیکن وقت کی پابندی ضروری ہے۔" ایمی اب فرسٹ کلاس انگریزی میں ہمیں ڈانٹنے لگی اور ہم ایک دوسرے کا منہ دیکھتے رہے کہ اس گونگی گائے کو کیا ہوا ہے۔ کوئی بہانہ کرنے میں ہی شرافت سمجھی۔ "ایمی ہماری طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔"

"طبیعت ٹھیک نہیں ہے یا کام سے بھاگ رہے ہو؟"

یہ کہہ کر وہ اپنے ہیل والے سینڈل سے کھٹ کھٹ کرتی ہوئی چلی گئی۔ جب وہ کینٹین کا مرکزی دروازہ بھی پار کرکے باہر نکل گئی تو راحت عزیز نے اپنی ٹائی درست کرتے ہوئے (غصے میں وہ ہمیشہ ایسا کرتا ہے یا اپنی قمیص کے اوپر والے بٹن کو زور سے پکڑ کر بات کرتا ہے) کہا۔ "کمبخت کو چھوٹے بڑے کا بھی خیال نہیں ہے۔ جب ہم چیئرمین ہوتے ہیں تو ان فرانسیسی بولنے والے حبشی افراد کو کتنا آرام فراہم کرتے ہیں اور سارا وزن انگریزی بولنے والے ممالک کے نمائندوں پر ڈال دیتے ہیں۔"

اور پھر ایک دوسرے کا چہرہ دیکھ کر یہی فیصلہ کیا کہ شرافت اسی میں ہے کہ چل کر کام کرنا چاہیے ایمی ایسی بھی گونگی گائے نہیں ہے۔ اور اس دن کے بعد کوئی اگر کہتا تھا کہ "ایمی بندرگاہ کا کام کیسے چلاتی ہوگی" تو میں ہنس کر کہتا تھا۔ "بھائی بڑی خیر خوبی سے چلاتی ہوگی۔ ایمی کی خبریں ہم سے پوچھو جنہوں نے ایمی کی ڈانٹ کھائی ہے اور یہ تو شکر ہے کہ اس نے انگریزی میں ڈانٹا جس میں وہ اتنی ہوشیار نہیں ہے۔ اپنے ملک میں فرانسیسی اور اپنی قبائلی زبانوں میں تو وہ لوگوں کا لہو پی جاتی ہوگی۔"

ایرانیوں کو کیسا پایا

اس وقت تک میں ایران نہیں جاسکا۔کئی برس تک کسی ایرانی سے بھی ملاقات نہیں ہوئی تھی۔ پھر اچانک یورپ میں مجھے کچھ ایرانی لوگوں کے قریب رہنے اور ان کے ساتھ کام کرنے کا پہلی مرتبہ موقع ملا۔ اس سے پہلے ایران میں رہنے والوں کے بارے میں جو میری رائے تھی یا ذہن میں جو تصور تھا وہ مغربی میڈیا میں ان کے متعلق آنے والی خبروں اور مضامین سے اخذ کیا ہوا تھا جو اچھا نہیں تھا۔

سوئیڈن، ناروے اور ڈنمارک میں جہاں میری رہائش تھی وہاں اتفاق سے ایرانی جہازرانوں کے بھی گھر تھے جن کے ساتھ مل کر مجھے جہاز اور سمندر کے مختلف پہلوؤں پر کام کرنا پڑتا تھا۔ ایک ہی محلے میں رہنے کی وجہ سے شام کو بھی ہماری اکثر ملاقاتیں ہوتی تھیں۔ ان کے ساتھ رہنے کے بعد میں نے ان کو کیسا پایا؟

☆..... ایرانی لوگوں کا مذہب کی طرف بہت رجحان تھا۔

☆..... پاکستانیوں کا بہت خیال کرتے تھے۔

☆..... چھوٹی سی داڑھی اور بغیر ٹائی کی قمیص میں وہ دوسروں سے نمایاں لگتے تھے۔

☆..... دنیا کیا سوچتی ہے یا کوئی کیا کہے گا اس کی ان کو پرواہ نہیں ہوتی تھی۔

☆..... مخلوط اور پینے والی دعوتوں میں آنے سے گریز کرتے تھے۔کسی آفیشل دعوت میں اگر آنا لازمی ہوتا تو وہ آتے ضرور تھے لیکن شراب کو ہرگز ہاتھ نہیں لگاتے تھے۔

☆..... ہر وقت اپنے اہل خانہ کے ساتھ گھومنے پھرنے نکلتے تھے، ان کی خواتین رومال سے سر ڈھانپے رکھتی تھیں۔

☆..... کمپیوٹر میں نہ صرف مرد حضرات بلکہ ان کے بچے بھی ماہر تھے اور ہر نئی ٹیکنالوجی سیکھنے کے خواہش مند رہتے تھے۔ کھیلوں کے نہ صرف شوقین تھے بلکہ ان میں ماہر بھی تھے۔ ہر کھیل میں حصہ لیتے تھے، ہمارے گروپ کے کھیلوں کا انچارج بھی ایک ایرانی کیپٹن بہزاد سیف الہی تھا۔ بچے بھی اسکول اور محلے کی کھیلوں میں حصہ لیتے تھے یہاں تک کہ کئی یورپی ممالک کے جہاز رانوں کے بچوں کو گھڑ سواری اور تیر اندازی نہیں آتی تھیں لیکن ہمارے ایرانی دوستوں کی لڑکیاں تک ایسی کھیلوں اور سائیکلنگ اور ایتھلیٹکس میں ماہر تھیں۔

ہماری والی بال ٹیم کے ایرانی کپتان محمد علی شابیا کہا کرتے تھے کہ صحت مند دماغ کے لئے صحت مند جسم ضروری ہے اور جسم کو صحت مند رکھنے کے لئے ورزش اور کھیل ضروری ہے۔ ایرانی اپنی قوم اور ملک کا خیال رکھتے تھے۔ دنیا کے کئی ممالک نے حالانکہ ایرانیوں کو الگ کرنے اور ان کی ترقی کی راہیں بند کرنے کی کوشش کر رکھی ہیں لیکن ان کو اس کی کوئی پرواہ نہیں ہے۔ وہ محنت اور جستجو میں لگے رہتے ہیں۔ مائیکل جیکسن اپنے ایک گانے میں "خمینی پاگل ہے" کا بینر دکھاتا ہے لیکن وہ وقت دور نہیں جب مغرب والوں کو اس کا احساس ہو جائے گا کہ ایران میں انقلاب لانے والے امام خمینی کو ایسا کہنے والے خود پاگل ہیں اور دنیا والوں کو چین کی طرح ایک دن ایران کی عظمت کو بھی ماننا پڑے گا۔

ایک دفعہ ہمارے پورے گروپ میں سے ہر ایک کو ناروے کی مختلف اور دور دراز کی بندرگاہوں میں جا کر وہاں بندرگاہوں اور جہاز سازکارخانوں کی کارکردگی دیکھنے کے لئے کہا گیا۔ مالمو (سوئیڈن) سے تو ہم سب ایک ہی طیارے میں نکلے لیکن اوسلو (ناروے) کے ہوائی اڈے پر پہنچ کر ہر ایک کو مختلف سمتوں اور طیاروں میں جانا تھا۔ آخر میں ایران کی بندرگاہ کے ڈائریکٹر کیپٹن غلام رضا ساسانی رہ گئے، جنہیں ٹرنڈ ہام جانا تھا اور مجھے مزید آگے ٹرومسو جانا تھا۔ خراب موسم کے باعث وہاں کی پرواز بار بار منسوخ ہو رہی تھی۔ وقت گزارنے کیلئے ہم دنیا جہاں کی باتیں کرتے رہے۔ وہ بحیرہ کیسپن کے بارے میں ایک تھیسز پر کام کر رہے تھے۔ انہیں ہر وقت یہ پریشانی رہتی تھی کہ وہ جو تحقیقی کام کر رہے ہیں یا جو خیالات ان کے دماغ میں ہیں ان کی بھنک ادائلی مرحلے میں آذربائیجان اور ترکمانستان سے آئے ہوئے جہاز رانوں کو نہ پڑے جن کے ممالک کا بحیرہ کیسپن پر اتنا ہی حق ہے جتنا ایران کا۔ غلام رضا ساسانی بھی دوسرے ایرانیوں کی طرح اہل خانہ کے ہمراہ سوئیڈن میں رہتا تھا اس کی بیوی جولی فلپائن کی ڈینٹل سرجن ہے جہاں ساسانی نے کچھ سال نوکری کی تھی یا شاید اس کی بیوی نے ایران میں ملازمت کی تھی۔ اس کی تین بیٹیاں مریم، فاطمہ اور سارہ مالمو کے اسی اسکول میں پڑھتی تھی جس میں میری بیٹی ماروی جاتی تھی۔

اس رات اوسلو کے ہوائی اڈے پر ایران کے جہاز ران ساسانی نے جو باتیں بتائیں اس میں سے بعض دلچسپ اور معلوماتی باتیں اپنے قارئین کے لئے لکھنا ضروری سمجھتا ہوں کیونکہ ان میں کئی چیزیں ہمارے لئے رہنمائی کا باعث اور غور طلب ہیں۔

☆..... ہمیں یعنی مسلمانوں کو اصلاح کی ضرورت ہے۔ ہم شراب کو تو معیوب سمجھتے ہیں لیکن پتہ نہیں کیوں پیٹھ پیچھے کسی کی برائی گلہ، اور غیبت جیسی چیزوں کو معیوب نہیں سمجھتے۔ اسلام نے تو ان باتوں سے بھی سختی سے منع کیا ہے۔

☆..... کوئی اپنے گھر میں بیٹھ کر کیا کرتا ہے اس کی کھوج لگانا ہمارا فرض نہیں ہے۔ وہ شراب پیتا ہے ساری رات ٹی وی دیکھتا ہے، ناچتا کودتا ہے اس سے ہمیں کوئی سروکار نہیں ہونا چاہیے۔ اللہ تعالیٰ ہر انسان کو دیکھ رہا ہے اور ہم مسلمانوں کا اللہ تعالیٰ سے براہ راست تعلق ہونا چاہیے۔ ہمیں عیسائیوں، ہندوؤں یا دوسروں کی طرح پادری پنڈت، برہمن بھکشو یا کسی اور مڈل مین کی ضرورت نہیں ہے۔ ہر انسان کو جزا یا سزا اس کے اعمال مطابق ملے گی۔

☆..... ہاں البتہ کوئی شراب پی کر باہر آکر دنگا فساد کرتا ہے جس سے دوسروں کو تکلیف پہنچتی ہے، ریڈیو یا ٹی وی کی آواز اونچی رکھتا ہے جس سے دوسرے ڈسٹرب ہوں تو پھر ہمارا فرض بنتا ہے کہ ہم اسے سمجھائیں اور اسے اس سے باز رکھیں۔

☆..... کسی کو سیدھی راہ دکھانے کے لئے اتنا کہنا کافی نہیں ہے کہ فلاں چیز چھوڑ دو۔ مثلاً اگر کسی کو جوا کھیلنے کی عادت ہے تو اس کو یہ عادت ختم کرنے کے لئے صرف حکم صادر کرنے سے کہ جوا خراب چیز ہے اسے بند کردو۔ بند نہیں کراسکتے۔ ٹی وی پر ناچ گانے آتے ہیں اب کوئی بھی حکومت یہ کہہ کر ان پر بندش نہیں لگا سکتی کہ یہ غیراسلامی ہیں اس سے اخلاقی پستی پیدا ہو رہی ہے وغیرہ وغیرہ۔ میں نہیں سمجھتا کہ عوام دوسرے دن سے ٹی وی کے سامنے گردن جھکا کر صرف اذانیں سننے میں محو ہو جائیں گے۔ ہرگز نہیں۔ ایسی بندش لگانے سے وہ لوگ ناچ گانوں سے بھی زیادہ غلط قسم کی کیسٹ کرائے پر لاکر وی سی آر پر دیکھیں گے۔ یہ ساری چیزیں بتانے سے میرا مطلب یہ ہے کہ جب آپ کسی سے کوئی چیز چھینتے ہیں تو اس سے بہتر نہیں تو کم از کم اس جیسا نعم البدل تو مہیا کریں۔ ٹی وی پر ناچ گانے بند کرتے ہیں اس کی جگہ پر دلچسپ سائنسی اور معلوماتی پروگرام، دستاویزی فلمیں، کھیلوں کے مقابلے وغیرہ پیش کریں تاکہ دیکھنے والا بھی لطف اٹھائے۔ کسی بچے سے آپ جب یہ کہہ کر کھلونا لے لیتے ہیں کہ یہ تمہارے لئے نقصان دہ ہے تو آپ کو چاہیے کو آپ اسے کوئی اور کھلونا دیں۔

☆..... بہت سارے مولوی حضرات یہ کہتے ہیں کہ گوروں کے ملک میں نہیں جانا چاہیے یعنی یہاں یورپ میں آنا نہیں چاہیے لیکن میں تو یہی کہوں گا کہ کسی کی اچھائی سیکھنے میں کیا عیب ہے۔ علم سیکھنے کے لئے تو چین بھی چلے جانا چاہیے۔ ہاں البتہ یہ ضرور ہے کہ اگر کوئی چیز غیراخلاقی ہے تو اس سے دور رہنا چاہیے۔

☆..... یہاں (یورپ میں) رہنے والے بعض مسلمان نماز پڑھنے کے معاملے میں کبھی کبھی بہت پریشان کرتے ہیں۔ زمین کا وہ حصہ جہاں ہم نماز پڑھنا چاہتے ہیں اگر خشک اور صاف نظر آ رہا ہے تو جائے نماز یا کپڑا بچھا کر نماز پڑھ لینی چاہیے۔ فضول کے وسوسوں میں مبتلا ہو کر نماز ترک نہیں کرنی چاہیے۔ بہت سارے لوگ بال کی کھال نکالنا چاہتے ہیں وہ ہر وقت یہ سوچتے رہتے ہیں کہ یہاں ہو سکتا ہے کسی نے بیٹھ کر شراب پی ہو۔ ہو سکتا ہے کسی بچے نے پیشاب کیا ہو۔ کوئی خنزیر گزر گیا ہو۔ توبہ توبہ کیا وسوسے ہیں جن کی خاطر لوگ نماز نہیں پڑھتے۔ اسلام میں اتنی تنگ نظری اور پیچیدگی نہیں ہے۔ آپ کی آنکھوں کے سامنے نماز پڑھنے والی جگہ کو اگر کوئی خراب کر گیا ہے یا آپ کو کسی نے بتایا ہے کہ یہ جگہ ناپاک ہے تو ایک علیحدہ بات ہے اس صورت میں آپ وہ جگہ چھوڑ کر دوسری جگہ پر نماز پڑھ لیں جو صاف ستھری اور خشک نظر آئے۔

☆..... سر کو رومال یا دوپٹے سے ڈھانپنا اسلام کے عین مطابق ہے۔ اس میں ہمیں شرمندگی یا احساس کمتری کا شکار نہیں ہونا چاہیے۔ انگریزوں نے سخت سردی سے گلے کو بچانے کے لئے ٹائی ایجاد کی اور ان کی کاپی

کرنے کے لئے ہم گرم ملکوں میں بھی ٹائی لگا کر چلتے ہیں لیکن سر ڈھانپنے میں عیب محسوس کرتے ہیں۔ میرے فلپینو بیوی اور بیٹی جو اب نو سال کی ہوگئی ہے ہر وقت سر ڈھانپ کر رکھتی ہے اور ان کو اس کی اس قدر عادت پڑگئی ہے کہ اس کے بغیر ان کو عجیب سا لگتا ہے۔

☆.... یہ یورپ کے لوگ ہمیں مل جل کر زندگی گزارنے اور یکجہتی کی تلقین کرتے ہیں لیکن اس پر ہمیں عمل کرنے نہیں دیتے۔کئی برس سے ہم ایرانی عرب ملکوں سے دوستی اور اتحاد کے عمل کو بڑھا رہے تھے اور اس میں کافی حد تک ہم دونوں فریقین میں قربانی اور درگذر کرنے کا جذبہ پیدا ہو چکا تھا تو مغرب والوں نے خلیج عرب اور خلیج فارس کا شوسہ چھوڑ کر ہمارے تعلقات خراب کردیئے۔ اب ایک چیز جو صدیوں سے خلیج فارس کے نام سے پہچانی جاتی ہے اس کے لئے آپ مغرب والوں کو کیا پریشانی ہوئی۔ اسی طرح ایران کا ایک چھوٹا سا جزیرہ جو ماضی میں چند برس کے لئے کسی عرب حاکم نے ادھار یا کرائے پر لیا ہوا تھا اب واپس کرنے کی رضامندی ظاہر کی تو یورپ اور امریکہ والے کود پڑے اور ان کے میڈیا نے اتنا ہنگامہ کھڑا کردیا کہ بات کا بتنگڑ بن گیا۔ ہم لوگوں کے اچھے خاصے تعلقات خراب ہوگئے۔ قصہ مختصر یہ کہ یہ ترقی یافتہ یورپ کی قومیں اور امریکہ امن، یکجہتی، سلامتی وغیرہ کی باتیں ضرور کرتے ہیں لیکن وہ یہ نہیں چاہتے کہ ہم ان پر عمل کریں۔

سوئیڈن میں ایک سکھ سے ملاقات

ایک دن مالمو کے سینٹرل اسٹیشن پر ایک سکھ (سردار جی) کو دیکھ کر بڑی حیرت ہوئی۔(

پٹھانوں کی طرح سکھ بھی تقریباً دنیا کے ہر ملک میں نظر آئیں گے اور پٹھانوں کی طرح ان کو بھی ہر ملک کے مقامی لوگ پسند کرتے ہیں کیونکہ یہ لوگ بھی جفاکش اور ایمانداری سے کام کرنے کے علاوہ مقامی سیاست اور ثقافت مین دخل اندازی نہیں کرتے۔ بس اپنے کام سے کام رکھتے ہیں۔

مالمو سوئیڈن کا تیسرا بڑا شہر ہے لیکن مردم شماری ٹنڈو آدم یا ٹنڈو جام جتنی ہے۔ ایک مہینے میں ہی ہمیں یہ اندازہ ہوگیا کہ مقامی لوگ سوئیڈش کون ہیں۔ لال بالوں والے پولش کون ہیں۔ افریقہ یا ایشیا کے مختلف

ملکوں کے جہاز ران نمائندے کون ہیں اور سیاسی پناہ لینے والے کون ہیں۔ سکھ تو اپنی پگڑی اور داڑھی کی وجہ سے دور سے ہی پہچانا جاتا ہے۔ مالمو میں آتے ہی ہمیں عرب، ایرانی، ترک، افریقہ کے حبشی اور یورپ کے گورے تو نظر آئے لیکن کوئی سکھ نہیں دیکھا۔ اس لئے اس دن پورے مہینے ڈیڑھ مہینے بعد جب سردار جی پر پہلی دفعہ نظر پڑی تو بڑا تعجب ہوا۔ بس آنے میں ابھی دیر تھی وقت گزارنے کے لئے میں نے آگے بڑھ کر سردار جی کو ہیلو کہا اور اس سے اردو میں بات کرنا چاہی۔ انہوں نے سوئیڈش زبان میں مجھے جواب دیا لیکن مجھے خالی خالی محسوس کرکے پنجابی میں پوچھا۔

"سوئیڈش آتی ہے؟"

"بالکل نہیں۔" میں نے جواب دیا۔

'پنجابی؟"

"سمجھ سکتا ہوں لیکن بول نہیں سکتا مجھے صرف اردو آتی ہے۔" میں نے جواب دیا۔

"چلیں یہ بھی ٹھیک ہے میں اردو سمجھ جاتا ہوں بول نہیں سکتا انگریزی بھی زیادہ نہیں آتی۔ یہاں دس بارہ سال سے ہوں اور سوئیڈش بولتا ہوں۔ اس سے پہلے ایک دو سال دبئی میں تھا جہاں پنجابی چلتی تھی۔"

میں نے اپنا تعاف کرایا۔ سردار جی کی عمر تقریباً چالیس برس ہوگی اور مالمو شہر میں وہ اکیلے سکھ تھے۔ "ایک اور بھی سکھ تھا لیکن یہاں گور دوارانہ ہونے کی وجہ سے وہ دریا کے اس پار ڈنمارک چلا گیا۔" سردار جی نے سامنے نظر آنے والے ڈنمارک کے شہر کوپن ہیگن کی طرف اشارہ کرکے بتایا جو بالٹک سمندر کی وجہ سے سوئیڈن کے شہر مالمو سے کٹا ہوا ہے۔

سردار جی جس کا نام ستنام سنگھ تھا، بتایا کہ وہ امرتسر کا رہنے والا ہے۔ بھارتی وزیراعظم اندرا گاندھی کے قتل کے بعد ہونے والے ہنگاموں میں وہ یہاں سوئیڈن میں آگیا۔ "یہاں کے جہاز ساز کارخانے "کوکم" اور کاریں بنانے والی کمپنیوں "وولوو اور صاب" کو ویلڈروں، مشین آپریٹروں اور ڈرائیوروں وغیرہ کی ضرورت تھی۔ میں کرین آپریٹر کی نوکری کے لئے چنا گیا۔ کچھ سال اچھے گزرے اس کے بعد جہازوں کے کاروبار میں مندی آگئی۔ تیل کی قیمتیں بڑھ گئی۔ مال برداری زیادہ نہ ہونے کی وجہ سے جہازوں کا کاروبار بہت کم ہوگیا اور کئی جہازراں کمپنیاں بند ہوگئیں۔ جب بنے بنائے جہاز ہی بیکار کھڑے تھے تو نئے بنوانے کی ضرورت نہیں تھی۔ سوئیڈن کا بڑا شپ یارڈ بند ہوگیا اور ہمیں نوکری سے جواب مل گیا۔" ستنام سنگھ نے بتایا کہ اس دوران اسے سوئیڈن کی قومیت اور پاسپورٹ مل چکا تھا لہذا وہ ان سب سہولتوں کا حقدار تھا جو مقامی لوگوں کو میسر ہیں۔ سوئیڈن، ناروے اور ڈنمارک دنیا کے وہ ممالک ہیں جہاں رہنے والوں کی فلاح و بہبود کیلئے بہت اچھا نظام موجود ہے۔ تعلیم سے لے کر تیمارداری تک حکومت کی ذمہ داری ہے۔ بے روزگاری کی صورت میں حکومت ہر بے روزگار کو اتنے پیسے دیتی ہے جس سے اس کے گھر کا کرایہ، بجلی، پانی اور دو وقت کے کھانے کا بندوبست ہوسکے۔ ان پیسوں کو عام طور پر "سوشل" کہتے ہیں جو آج کل تقریباً تین ہزار کرونے (18000 روپے) بنتا ہے۔ بچوں کی صورت میں ہر بچے کے ایک ہزار کرونے مزید ملتے ہیں۔ کئی لوگ خصوصاً یہاں کے اصل باشندے حکومت سے سوشل لینے میں عار محسوس کرتے ہیں اور انتہائی مجبوری کی حالت میں لیتے ہیں۔ کئی لوگ خصوصاً افریقہ اور ایشیا کے وہ لوگ جو سیاسی پناہ حاصل کرنے کے بہانے ٹھہرے ہوئے ہیں (یا پڑوس کے غریب ممالک پولینڈ وغیرہ کے لوگ) بہانہ کرکے نوکری چھوڑ دیتے ہیں

تاکہ ان کو گھر بیٹھے مفت کا سوشل ملتا رہے بلکہ ان کا سارا زور زیادہ سے زیادہ بچے پیدا کرنے پر ہوتا ہے تاکہ ہر مہینے ان کو زیادہ پیسے مل سکیں۔

"اسکینڈی نیوین ممالک سوشل سیکورٹی کے حوالے سے مشہور ہیں۔" ستنام سنگھ نے بتایا۔ "لیکن نوکری چلی جانے کی بعد، میں نے ان سے خیرات کی درخواست نہیں کی۔ حکومت جو یہ بیروزگاری کا الاؤنس دیتی ہے وہ خیرات ہی تو ہے۔ میں نے دل میں سوچا۔ ستنام تیرے ہاتھ پاؤں سلامت ہیں تجھے کام کرنا چاہیے ایک شیر مرتے مرجاتا ہے لیکن گھاس نہیں کھاتا۔ لہذا میں نے اخبار فروشی شروع کردی۔ روزانہ صبح کو اٹھ کر گھروں میں اخبار تقسیم کرتا تھا جس سے مجھے دو ہزار کرونے مل جاتے تھے جن میں سے 1100 کرونے گھر کا کرایہ دیتا تھا باقی سے پیٹ کی آگ بجھاتا تھا۔ چند ماہ بعد پیسے جمع کر کے گھاس کاٹنے کی مشین لے لی اور شام کو گھروں میں گھاس کاٹ کر کچھ مزید پیسے کماتا تھا۔"

"سردار جی آپ واپس اپنے ملک کیوں نہیں چلے جاتے؟" میں نے پوچھا۔

"بہت اچھا سوال کیا ہے آپ نے۔" سردار جی نے کہا۔ اتنے میں بس آگئی۔ "کہاں جانا ہے آپ کو؟"

"ہولما۔" میں نے جواب دیا۔

"چلیں میں بھی اسی بس میں ہولما تک چلتا ہوں جہاں سے دوسری بس میں آگے روزن گارڈ چلا جاؤں گا جہاں میری رہائش ہے۔"

بس میں آخری سیٹ پر ہم آکر بیٹھ گئے۔

"آپ کچھ پوچھ رہے تھے کہ نوکری ختم ہونے کے بعد میں واپس امرتسر کیوں نہیں گیا یا آپ یہ کہہ سکتے ہیں کہ میں یہاں کیوں ٹھہر گیا اور میں نے بچوں کو بھی یہاں کیوں بلوالیا۔"

"جی ہاں یہی میرا سوال ہے۔" میں نے کہا۔

"میں سکون اور عزت کی زندگی کی تلاش میں ہوں۔ وطن چھوڑ کر پہلے عرب ممالک میں گیا جہاں میں نے کچھ سال گزارے لیکن عربوں کے پاس نوکری، مزدوری یا کاروبار کرنے سے انسان دور ہی رہے تو اچھا ہے۔ ان کے پاس پیسہ تو آگیا ہے لیکن انسانیت کا خیال نہیں رکھتے۔ میں یہ اس لئے نہیں کہتا کہ میں سکھ یعنی غیرمسلم ہوں لیکن عربوں کا ہم سب پاکستان، بھارت، بنگلہ دیش، سری لنکا، افغانستان کے رہنے والوں سے یکساں سلوک ہے حالانکہ پڑوسی ممالک کا ان کو زیادہ خیال رکھنا چاہیے۔ ایک وقت تھا کہ وہ خود بھی غریب تھے۔ دولت آنی جانی چیز ہے جو قدرت نے ان کو تیل کے روپ میں عطا کی ہے اور بغیر محنت کے ان کے دروازوں کے پاس پہنچائی ہے۔ یہی تیل کی ندیاں ہزار دو ہزار میل ادھر ادھر ہونے پر ہمارے ممالک کی ملکیت بن سکتی تھیں۔ اس پر اتنا ناز نہیں کرنا چاہیے۔ لیکن یار ایک چیز میں نے محسوس کی کہ عربوں کے پاس دولت ضرور آگئی ہے لیکن ان کو اس کے صحیح استعمال کا طریقہ نہیں آیا اور اس معاملے میں گورے تیز ہیں۔"

"آپ نے سوئیڈن کو کیسا پایا۔" میں نے سوال کیا۔

”دیکھیں بھائی صاحب مین کوئی پڑھا لکھا نہیں ہوں کہ آپ کو اس کا بہتر جواب دے سکوں لیکن اتنا ضرور کہوں گا کہ اپنے ایشیائی ممالک کی سیاسی دشمنیاں، پولیس کے ظلم، ناانصافیاں، رشوت خوری، اور بدامنی میں دن گزار کر جب کوئی اس طرف کی دنیا میں آتا ہے تو وہ خود کو بڑا پرسکون محسوس کرتا ہے۔ سارا دن گدھے کی طرح محنت کرنے کے باوجود انسان یہاں پر ذہنی طور پر تازگی اور خوشی محسوس کرتا ہے۔ میں کہتا ہوں یہاں کے لوگ امیر نہیں ہیں۔ ہمارے ممالک کے صرف ایک شہر کے لوگوں کا سونا چاندی جمع کیا جائے تو ان کے پورے ملک میں اتنا نہ ملے۔ یعنی یہاں کا آدمی پیسے کے معاملے میں امیر نہیں ہے لیکن ان کے پاس زندگی کا اعلیٰ معیار ہے جو ہمارے پاس نہیں ہے۔ ان کے پاس ہر کام کا سسٹم ہے، ایک قاعدہ قانون ہے جو غریب اور امیر کے لئے یکساں ہے۔“

اس نے بتایا کہ اس کا تعلق امرتسر کے زمیندار گھرانے سے ہے۔ “ہاں واقع میرے بڑے بنگلے کے سامنے یہاں کا دوکمرے کا فلیٹ جس میں آج کل رہتا ہوں کوئی حیثیت نہیں رکھتا، کچھ بھی نہیں ہے۔ وہاں نوکر چاکر، کھیت میں کام کرنے والے کسان، مزارعے سب تھے لیکن پھر بھی امرتسر میں میرا دل نہیں لگا کیونکہ وہاں پر حالات بدلتے دیر نہیں لگتی تھی۔ پولیس جس وقت چاہے آپ کو جھوٹے الزام میں اندر کردے اور آپ کی داد فریاد سننے والا بھی آپ کو نہیں ملے گا۔ لیکن یہاں کی دنیا مختلف ہے آپ اگر حق پر ہیں تو دنیا چاہے ادھر کی اوھر ہو جائے آپ کا کوئی کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔ آپ کا کسی دفتر میں کام ہے تو دفتر پہنچ کر آفیسر کی منتیں کرنے یا رشوت کی آفر دینے کی بجائے آپ گھر بیٹھے ٹیلیفون پر اپنی تکلیف اسے بتا سکتے ہیں اور آپ کا مسئلہ حل ہو جائے گا اور یہی باتیں مجھے اچھی لگتی ہیں اور یہ باتیں ان گوروں میں ہیں لیکن افسوس ہماری ملک کے لوگ ان اچھی باتوں سے عاری ہیں اس لئے تو میں کہتا ہوں کہ پاکستان اور بھارت غریب نہیں بلکہ ان کا نظام غریب ہے۔“

پاگل ہے سالہ۔۔۔

ستنام سنگھ نامی سردار جی کی کچھ دلچسپ باتیں پہلے بھی لکھ چکا ہوں۔ وہ سوئیڈن کے اس شہر مالمو میں واحد سکھ ہیں۔ حالانکہ دنیا کے ہر شہر میں کئی سکھ نظر آتے ہیں۔ ہو سکتا ہے ہمارے پنجابی اور پٹھان بھائی بھی ہوں لیکن سکھ لوگ تو اپنی داڑھی اور پگڑی کو وجہ سے دور ہی سے پہچانے جاتے ہیں۔ مالمو کھلا شہر ہے۔ جگہ جگہ خوبصورت پارک ہیں۔ لوگ بسوں اور سائیکلوں پر سواری کرتے ہیں یا میلوں پیدل چلنے میں فخر محسوس کرتے ہیں۔ شہر کی آبادی بھی بہت کم ہے۔ دو تین ہفتوں کے اندر ہی شہر کے کئی لوگ جانے پہچانے لگتے ہیں اور شہر میں کوئی نیا آدمی آجائے تو ایک دم پتہ چل جاتا ہے۔ مالمو میں دو سال کی رہائش کے دوران ایک دفعہ مجھے ستنام کے علاوہ ایک اور سکھ بھی نظر آیا۔ میں بس میں جا رہا تھا تو راستے میں آنے والے ایک پارک کی بینچ پر یہ سردار جی بیٹھے ہوئے نظر آئے جو اپنے اردگرد دانہ چگتی بطخوں کو بڑے غور سے دیکھ رہے تھے۔ میں نے اسی دن شام کو ستنام سنگھ کو فون کرکے یہ خوشخبری سنائی: بھئی مبارک ہو، ایک اور سکھ مالمو میں رہنے آیا ہے۔"

ستنام سنگھ یہ سن کر بہت ہنسا۔

"اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ کو پہلے ہی پتہ چل گیا؟" میں نے کہا۔

"جی ہاں۔" ستنام نے جواب دیا۔ "اور یہ بھی معلوم ہے کہ وہ کل واپس جا رہے ہیں کیونکہ وہ میرے ماموں ہیں۔ بریڈ فورڈ سے ڈنمارک آنے پر ایک دن کے لئے یہاں مالمو بھی میرے پاس آئے ہوئے ہیں۔"

بہرحال ہمارے دور میں مالمو شہر میں ایک ہی سکھ ستنام سنگھ تھا جس سے کبھی کبھی پارک میں، بس اسٹاپ پر یا چہل قدمی کرتے ہوئے سڑک پر ملاقات ہو جاتی تھی اور اس کے ساتھ ساتھ ہنسی مذاق بھی ہو جاتا تھا۔ ایک دن میں نے ہنستے ہوئے ستنام سے پوچھا۔ "یہاں سوئیڈن میں کوئی چور ڈاکو نہیں ہے؟"

"نہیں۔ سوئیڈش لوگ چور نہیں ہیں۔" ستنام نے بتایا۔ "لیکن جو ہیں وہ بہت ہی اونچے درجے کے ہیں۔ ایسے نہیں کہ جیب تراشی کرتے پھریں یا خواتین کو گھروں میں اکیلا دیکھ کر بندوق کے زور پر لوٹ مار کرکے چلے جائیں۔ یہاں کا تعلیمی معیار کافی بلند ہے۔ ہر آدمی سائنس اور آرٹس میں ماہر ہے۔ دوسرے کاموں کی طرح یہاں کے چور بھی چوری میں ماہر ہیں۔ انہوں نے چوری کے بھی وہ سائنسی طریقے ایجاد کئے ہیں کہ عام آدمی حیران رہ جاتا ہے۔ کاروں، تجوریوں اور بینکوں کی اسٹرانگ روم کے تالوں کی چابیاں بنالیتے ہیں اور اس کے کوڈ نمبروں کا بھی منٹوں میں پتہ چلا لیتے ہیں اور نہ صرف پیسوں کی چوری کے ماہر ہیں بلکہ ٹیلیفون اور بجلی کی بھی ایسی چوری کرتے ہیں کہ خود متعلقہ محکموں کے اہلکاروں کو بھی اس چوری کی سمجھ نہیں آتی۔

"دو چار سال ہوئے تو یہاں کے چوروں نے مصنوعی سیارے کے ذریعے ایک ایسا آلہ ایجاد کیا جس کے ذریئے وہ ایک ملک سے دوسرے ملک آرام سے بات کرتے رہے۔ لیکن ایک بات ہے کہ ان ممالک کی پولیس بھی بہت ایماندار اور محنتی ہے۔ ان چوروں سے بھتہ لے کر آنکھیں بند کرنے کی بجائے آنکھوں پر دوربین لگا کر چور کی تلاش میں نکل پڑتی ہے اور جب تک مجرم کو پکڑ کر سزا نہیں دلواتیں تب تک سکون سے نہیں بیٹھتی۔"

یورپ، خصوصاً ان ممالک میں، جہاں ہمارے ملک کے ان پڑھ لوگ زیادہ رہتے ہیں دوسرے ملکوں کے مقابلے میں جرائم میں زیادہ حصہ لیتے ہیں۔ باہر کے ملکوں میں رہنے والا ہر پاکستانی اپنے اردگرد کا جائزہ لے کر دیکھے تو اسے اندازہ ہو جایے گا کہ بھارتیوں کے مقابلے میں ہم پاکستانی زیادہ جوشیلے اور غصیلے ہیں۔ چھوٹی چھوٹی باتوں پر لڑ پڑتے ہیں۔ اس کے مقابلے میں بھارتی خاموش طبع اور ٹھنڈے دماغ کے ہیں۔ خود کو جھگڑے سے دور رکھتے ہیں۔ اس چیز کو ہم چاہے اس سے تعبیر کریں کہ ہندو ڈرپوک ہیں لیکن یہ حقیقت ہے کہ ہمارے پنجابی اور پٹھان بھائی (سندھی اور بلوچ تو برطانیہ میں بہت کم ہیں ورنہ وہ بھی) اور دوسرے نمبر پر سکھ اور بنگالی ہیں جو معمولی باتوں پر ایک دوسرے کا سر پھاڑ کر رکھ دیتے ہیں۔

ایک دفعہ یہ بات میں نے ستنام سے کی تو اس نے تائید کرتے ہوئے کہا کہ ہندو لوگ جھگڑے سے کوسوں دور بھاگتے ہیں۔ ہم لوگ (سکھ) بھی تھوڑا سا تاؤ دلانے پر جھگڑا کر بیٹھتے ہیں لیکن کسی ہندو کو جتنا بھی کہو کہ فلاں تمہارے خلاف بول رہا تھا فلاں تمیں گالیاں دے رہا تھا وغیرہ وغیرہ۔ وہ صرف سنتا رہے گا۔ اگر آپ اسے بہت کچھ سنائیں گے تو بھی وہ لڑے گا نہیں۔ صرف زبان سے اتنا کہے گا۔ "پاگل ہے سالا۔" لیکن ہم لوگ بغیر خاطر میں لائے دوسرے کے گریبان پر ہاتھ ڈال دیں گے۔

"اس کا مطلب یہ ہوا کہ بھارت میں صرف ہندو ہوتے تو بڑے چین و سکون سے رہتے اور زبردست ترقی کرتے؟" میں نے ستنام سے پوچھا۔

"نہیں باہر کے ممالک میں وہ بہت اچھے ہیں آپس میں لڑتے ہیں نہ مقامی لوگوں کے ساتھ لیکن اپنے ملک میں اپنوں کے ہی جان کے دشمن بنے ہوئے ہیں۔ اس کے علاوہ ذات پات کے چکروں کی وجہ سے بھی ایک دوسرے کے لئے نفرت رکھتے ہیں اور کھینچاتانی میں لگے رہتے ہیں۔"

دنیا کے بادشاہوں کا حال

سوئیڈن میں بادشاہت ضرور ہے لیکن یہاں کے بادشاہ کی بادشاہی میں حاکموں والا رعب و دبدبہ نہیں ہے بلکہ وہ خود اس کا قائل نہیں ہے۔ وہ عوام میں سے ہی ایک لگتا ہے اور عام آدمیوں کی طرح دکانوں پر سے خریداری کرتے یا اہل خانہ کے ہمراہ شہر کے پارکوں میں پکنک مناتے نظر آتا ہے اور یہی حال اس کی ملکہ کا ہے۔ یہ ایسی باتیں ہیں جو ابتدائی دنوں میں ہمارے خطے کے ممالک کے لوگوں کے لئے باعث تعجب تھیں۔ ظاہر ہے ہمارا یعنی ایشیائی، افریقی اور دیگر باشندوں کا تعلق ایسے ممالک سے ہے جہاں ایک این جی او میں کام کرنے والا، پولیس اہلکار یا رکن

صوبائی و قومی اسمبلی وغیرہ، جس کا کام خدمت خلق ہے اپنے آپ کو بادشاہ سے کم نہیں سمجھتا اور ہر وقت اپنی شان و شوکت دکھانے کے چکروں میں ہوتا ہے کو لوگ اس کے سماجی اور مالی مرتبے کو بالاتر سمجھیں اور اس کی شاندار طرز زندگی پر رشک کریں۔

ہم جیسے لوگ جن کے ملک میں انکم ٹیکس اور روینیو جیسے اداروں کے کلرک، تحصیلدار حتی'کہ چپراسی تک بھی خود کو بادشاہ سے کم نہیں سمجھتے ان کے لئے سوئیڈن جیسے ماڈرن، امیر اور طاقتور ملک کے بادشاہ کو عام آدمی کی طرح چلتے پھرتے دیکھ کر حیرت کیوں نہ ہو۔ لیکن کچھ دنوں کے بعد محسوس ہوا کہ ایک طرح سے تو یہ لوگ اچھا ہی کرتے ہیں اور خود کو روایتی بادشاہ نہ سمجھ کر حقیقت پسندی کا ثبوت دیتے ہیں۔ آج کل کے بادشاہوں کی نہ وہ شان رہی ہے اور نہ ہی کوئی رعب و دبدبہ جو ان کے دادا اور پر دادا کے تھے اور نہ ہی اب وہ رعایا رہی ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ اس ترقی یافتہ اور معاشی افراتفری کے دور مین راجاؤں، نوابوں، بادشاہوں اور شہنشاہوں کے نخرے اٹھانے والے لوگ نظر ہی نہیں آتے۔ آج کا انسان تعلیم یافتہ ہونے کے ساتھ ساتھ پیدا ہونے سے مرنے تک معاشی مسائل میں ایسا جکڑا ہوا رہتا ہے کہ اسے سمجھ میں نہیں آتا کہ وہ اپنا اور اپنے بچوں کا پیٹ کیسے پالے، کسی کو بادشاہ مان کر اسے عیش کرانا تو دور کی بات ہے۔ ویسے بھی آج کل کئی ممالک کے بادشاہ تو صرف نام کے تاج اور تخت کے مالک ہیں اور وہ خود بھی سمجھتے ہیں کہ آج نہیں تو کل کوئی اور، انہیں دھکا دے کر تخت سے جدا کر کے تختے پر بٹھادیگا۔ اس لئے عافیت اسی میں ہے کہ وہ خود ہی رضاکارانہ طور پر اپنے دادا پر دادا کا تخت چھوڑ کر چٹائی یا چادر پر جا کر لیٹ جائیں اور زندگی کے باقی دن آرام اور سکوں سے گزاریں۔

اس طرح دیکھا جائے تو یہاں (سوئیڈن) کا بادشاہ کارل گستاف عقل مند ہے۔ وہ شیخی بگھارتا ہے اور نہ عیاشی یا ظلم کرتا ہے۔ وہ نہ رعایا سے اپنی شان میں قصیدے پڑھواتا ہے اور نہ اپنے یوم پیدائش پر لوگوں کو جشن منانے کے لئے مجبور کرتا ہے۔

ویسے بچپن میں ہم نے سنا تھا کہ آخر میں دنیا میں صرف پانچ بادشاہ رہ جائیں گے جن میں سے چار تاش کے پتوں کے پان 'چڑیا' اینٹ اور حکم کا بادشاہ اور پانچواں انگلینڈ کا۔ لیکن آج کل انگلینڈ کا تخت اور اس کی ملکہ اور اس کے خاندان کو جس طریقے سے اسی ملک کے اخبارات اور الیکٹرانک میڈیا لتاڑ رہے ہیں اس سے تو لگتا ہے کہ وہ دن اب دور نہیں جب اس دنیا میں پانچ نہیں بلکہ صرف چار ہی بادشاہ بچیں گے۔

بہرحال گزشتہ صدی کا جائزہ لیں تو صاف ظاہر ہوگا کہ کئی بادشاہوں، سلاطین اور نوابیں اور شاہی خاندانوں کے بستر گول ہو چکے ہیں یا ہونے کے قریب پہنچ چکے ہیں۔ دوسری جنگ عظیم کے بعد عرب دنیا کے کئی تخت و تاج الٹ گئے۔ جن میں عراق، یمن، مصر اور لیبیا کی بادشاہتیں شامل ہیں۔ سعودی عرب کا بادشاہ اور کویت کا امیر خود احتسابی کی بات کرتے ہیں۔ عوام نے 1973ءمیں افغانستان کے بادشاہ سے اور 1979ءمیں شاہ ایران سے تخت چھین کر ان کو ملک بدر کر دیا۔ 1975ءمیں سکم (Sikkim) کی عوام نے اپنے راجہ کو چھوڑ کر بھارت کے ساتھ شامل ہونے کے لئے ووٹ دیا۔ اس کے پڑوسی ملک بھوٹان کا بادشاہ بھی صرف نام کا بادشاہ ہی ہے حالانکہ دوسرے پڑوسی ملک نیپال کے بادشاہ بریندرا کا تخت 1990ءکے انقلاب میں ٹھوکر کھا چکا ہے لیکن پارلیمنٹری ڈیموکریسی کے نام پر اس نے اپنے تخت کو فی الحال آئینی تحفظ دلوا رکھا ہے۔

ویتنام کے شہنشاہ باؤ دائی کو 1955ءمیں معزول کیا گیا جس کے بعد وہ پیرس مفرور ہوگیا۔ 1975ءمیں کمیونسٹوں نے لاؤس پر قبضہ کرلیا جس کے بعد وہاں کا بادشاہ ملک سے غائب ہوگیا۔ کمبوڈیا کے بادشاہ سہانوک نے 1955ءمیں اپنا تخت باپ کے حوالے کر دیا پھر 1970ءمیں صدر اور شہزادے کے رتبے پر رہا اس کے بعد 1990ءکی آخر میں فنام پین کے محل میں چیئرمین سپریم کونسل کی حیثیت سے داخل ہوا۔

جب تک انگریز، فرانسیسی یا پرتگالی وغیرہ افریقہ اور ایشیا میں رہے انہوں نے اپنے مقاصد کے خاطر نوابین، راجاؤں، سرداروں، جاگیرداروں، پیروں اور ٹھاکر نندکروں وغیرہ کا درجہ اور مرتبہ قائم رکھا۔ ان کے جانے کے بعد ایشیا کی کئی روایتی گدیوں اور تختوں پر جیسے جھاڑو پھر گیا۔ انڈونیشیا کی کوئی آدھی درجن چھوٹی چھوٹی سلطنتیں اور ان کے سلطان انڈونیشیا کی آزادی کے بعد عام آدمی بن گئے، سوائے وسطی جاوا کے دو سلطانوں کے۔ وہ ابھی تک اپنے القاب استعمال کرتے ہیں، چھوٹے پیمانے کی درباریں چلاتے ہیں اور گھر کے خرچے کے لئے حکومت وقت بھی ان کو تھوڑا بہت پیسہ دیتی رہتی ہے، یہ ہیں: جوگجاکرتا صوبے کا سری سلطان ہمکو دھم اور جزیرہ سولو کا سری پاکو۔ سراواک کا سفید فام راجہ بروک 1946ءمیں ہمیشہ کے لئے بادشاہت چھوڑ کر انگلینڈ جا بسا۔ فلپائن کے جنوبی علاقے سولو (SULU) کے سلطان کے پاس اب نہ تخت رہا ہے نہ تاج، بس صرف لقب رہ گیا ہے، وہ بھی نام کا۔ غیر سرکاری طرح سے آج کل ان ملئی علاقوں Archipelago میں صرف برونائی کا سلطان عیاشی کر رہا ہے اور تیل سے ملنے والی بے حساب دولت سے کھیل رہا ہے۔ ملائیشیا کی نو ریاستوں کے سلطان (جن میں سے ہر ایک باری آنے پر 4 سال کیلئے پورے ملک کا بادشاہ بنتا ہے) کا کوئی زمانہ تھا کہ (1990ءتک) عوام اسے والدین کا درجہ دیتے تھے۔ کسی نجی محفل میں بھی کسی کو ان کے خلاف بولنے کی ہمت نہیں ہوتی تھی۔ لوگ انہیں پیرو مرشد مانتے تھے۔ آج کل اخباری میڈیا ان کی چھپی ہوئی حرکات ظاہر کرکے عوام کو ان کے خلاف بولنے اور احتساب کی بات کرنے کے مواقع فراہم کر رہا ہے۔

آسٹریلیا، پاپوانیوگنی، جزیرہ سولومن اور تووالو (Tuvalu) والے ملکہ برطانیہ کو اپنا بڑا سمجھتے ہیں جن کی نمائندگی ان کا مقرر کردہ گورنر کرتا ہے لیکن گورنر مقرر کرنے کے لئے وہ کابینہ سے صلاح مشورہ کرنے کی پابند ہیں۔ ٹونگا اور سموا (Samoa) جزیروں کے اپنے بادشاہ ہیں لیکن ہیں ایسے تہی دامن کہ عوام کے پیسوں یا امیر ملکوں کی خیرات پر چلتے ہیں۔ 1947ءمیں برصغیر کی آزادی سے قبل ہندوستان میں کئی نواب، راجے اور مہاراجے تھے۔ آزادی کے بعد ان کا راج ختم کیا گیا یا کم کیا گیا۔ 1971ءمیں بھارتی وزیراعظم اندراگاندھی نے ان کی بچی کھچی سہولتیں اور الاؤنس وغیرہ بھی ختم کر دئیے۔

پرانے زمانے میں، براعظم ایشیا میں ایسے بادشاہ بھی گزرے ہیں جن کی طرف عوام کو نظریں اٹھاکر دیکھنے کی اجازت بھی نہیں تھی۔ جاپان کا شہنشاہ ہیروہٹو ان میں سے ایک تھا۔ کئی لوگوں کا یہ اعتقاد تھا کہ وہ انسان نہیں بکہ آسمان سے اُترا ہوا کوئی دیوتا ہے۔ دوسری جنگ عظیم میں بری طرح ہارنے کے بعد یہ تاثر یک لخت ختم ہوگیا۔

آج کل کی دنیا میں تھائی لینڈ (سیام) کا بادشاہ بھومی بھال اور اس کی ملکہ سری کٹ سب سے زیادہ مانے اور بڑی عزت کی نگاہوں سے دیکھے جاتے ہیں۔ اپنے بڑوں کی طرح یہ بادشاہ بھی عوام کی بھلائی کے لئے سرگرم

رہتا ہے۔ اس کی معمولی سی نصیحت کو بھی لوگ قانون اور حکم کا درجہ دیتے ہیں۔ تھائی لینڈ کا یہ بادشاہ غریب عوام کے پیسوں پر عیش نہیں کرتا بلکہ جیب سے ٹیکس تک ادا کرتا ہے تاکہ اس کا ملک ترقی کرے اور عوام خوش حال رہے۔

ہرن کے گوشت کی دعوت

سوئیڈن میں ہمارے قریبی بلاک میں رہنے والا عمر سلام جس کا ذکر اس سے پہلے بھی کر چکا ہوں ہر وقت مصروف اور بھاگ دوڑ میں رہتا تھا۔ کیا کرے وہ ایک ہی وقت میں دس کام کرتا تھا۔ وہ سرکاری نوکری کرتا۔ مذہبی اور فلاحی کام بھی کرتا تھا اس کے علاوہ اسے دوستوں سے ملنے، سیرو سیاحت، کھانے پینے، دعوتیں کرنے اور شکار کا بھی شوق تھا۔

عمر سلام کو مذہبی قسم کے لوگوں سے بھی ملنے کا شوق تھا۔ سوئیڈن یا پڑوسی ملک ڈنمارک میں کسی بھی عالم دین کی آمد کا سنتے ہی ان سے ضرور ملنے جاتا تھا۔ کئی بار مجھے بھی اپنے ساتھ لے گیا۔ عمر سلام کو شکار کا بھی شوق تھا اور اپنے ساتھ چلنے کے لئے مجھے بھی ہر وقت دعوت دیتا رہتا تھا لیکن وہ میں ٹال دیتا تھا۔

”نہیں یار! ایسے برفانی موسم میں گھنٹوں کسی خرگوش یا ہرن کے پیچھے دوڑنا میرے لئے ناممکن ہے۔“

”تم ایک دفعہ شکار کے لئے Woods جنگل) میں چل کر تو دیکھو۔“ عمر سلام مجھے کمپنی دینے کے لئے کہتا تھا۔” جس وقت گولی لگنے پر شکار گرتا ہے اس وقت ساری تھکاوٹ دور ہو جاتی ہے۔“

"بس عمر تم شکار کھیل کر مجھے کہانی آ کر سنانا تو میں کسی ڈائجسٹ کے لئے لکھ دوں گا۔"

"چلو کہانی سناؤں یا نہ سناؤں تمہیں اس جانور کا گوشت ضرور لا کر دوں گا۔" عمر سلام کہتا تھا۔

سوئیڈن کے جنگلات میں خرگوش، بڑے سینگوں والے ہرن (Reindeer اور بھیڑئیے بہت ہیں ان کے شکار کے لئے یہاں کی حکومت نے کچھ مہینے مقرر کئے ہوئے ہیں اور ہر وہ شخص شکار کرسکتا ہے جو لائسنس یافتہ ہو اور یہاں پر شکار کا لائسنس صرف بڑے آدمیوں کو نہیں ملتا بلکہ شکار کا کوئی بھی شوقین حکومت کی طرف سے مقرر کردہ فیس جمع کروا کر لائسنس لے سکتا ہے۔

یہ اور بات ہے کہ کچھ لوگ شوقیہ شکار پر نکلتے ہیں تو کچھ روزگار کی خاطر یعنی یہ لوگ شکار کئے ہوئے جانوروں کا گوشت مارکیٹ میں لا کر بیچتے ہیں۔ لائسنس فیس، ٹیکس اور کارتوس گولیوں کی قیمت نکالنے کے بعد کبھی فائدے میں رہتے ہیں تو کبھی نقصان میں۔

ایک دن صبح دفتر جاتے ہوئے عمر سے ملاقات ہوئی۔ وہ دور سے ہی چلایا "خرگوش کا گوشت کھاؤ گے؟"

"کہیں سے ملا ہے کیا؟" میں نے پوچھا۔

"نہیں۔" عمر نے بتایا۔ "آج خرگوش کے شکار کا پروگرام ہے۔ پانچ چھ بجے لوٹوں گا اور کچھ خرگوش آپ کے گھر بھجوا دوں گا۔"

یونیورسٹی پہنچ کر میری جیسے ہی اپنے پاکستانی ساتھیوں کیپٹن سلیم قاسم اور جہازوں کے انجنیئر راحت عزیز سے ملاقات ہوئی تو میں نے ان کو یہ قصہ سنایا اور رات کے کھانے کی دعوت دی۔

شام کو ہم نے پیاز بھی کاٹ لئے لیکن عمر سلام کا دور دور تک کوئی نام و نشان نہ تھا۔ وہ اب تک کیوں نہیں آیا۔ پانچ کے بعد چھ اور پھر سات بج گئے۔ عمر کے گھر فون کیا تو اس کی بیوی نے ٹوٹی پھوٹی انگریزی میں بتایا کہ اسے کیا پتہ۔ وہ خود ہم سے پوچھتی رہتی ہے کیونکہ عمر کا کوئی ایک پروگرام تو ہوتا نہیں۔

سخت سردی میں بھوک بھی زیادہ لگتی ہے۔ عمر کا کتنا انتظار کیا جا سکتا تھا کٹی ہوئی پیاز میں انڈے ڈال کر ہم لوگوں نے آملیٹ بنالیا۔

تین چار دنوں بعد عمر سلام سامنے سے آتا ہوا نظر آیا۔ وہ اپنی ہی دھن میں سیٹیاں بجاتا آ رہا تھا۔ خیر عافیت دریافت کرنے کے بعد جب میں نے خرگوش کے شکار کی بات چھیڑی تو پہلے تو اسے یاد ہی نہیں آیا۔ پھر ایک دم یاد آتے ہی مجھ سے معافیاں مانگنے لگ گیا۔ "ارے یار دیکھو تو مجھ سے کتنی بڑی غلطی ہوگئی اور آپ کو اپنے دوستوں کے آگے سخت ندامت محسوس ہوئی ہوگی۔ دراصل اس دن دفتر پہنچا تو پتہ چلا کہ جنوبی افریقہ سے ایک عالم دین کوپن ہیگن آ رہے ہیں۔ ہم ان کا وعظ سننے کے لئے سیدھے کوپن ہیگن چلے گئے اور اس چکر میں شکار کی بات دماغ سے نکل گئی۔"

"چلیں کوئی بات نہیں۔" میں نے اس سے کہا۔

"خیر کوئی بات تو نہیں۔ مجھ سے واقعی غلطی ہوگئی۔ اچھا یہ بتاؤ تم نے کبھی ہرن کا گوشت کھایا ہے؟" عمر سلام نے پوچھا۔

"جی ہاں۔" میں نے جواب دیا۔

"کہاں کھایا ہے؟"

"ملائیشیا میں۔" میں نے اسے بتایا۔

"میں یہاں کا، سوئیڈن کے ہرنوں کا پوچھ رہا ہوں۔" عمر سلام نے کہا۔

"نہیں۔ یہاں نہیں کھایا ہے۔"

"تو بس کل شام میں آپ کو یہاں کے ہرن (Reindeer) کا گوشت کھلاؤں گا۔ آپ اپنے اہل خانہ کے علاوہ دو اور دوستوں کو ان کے اہل خانہ سمیت ڈنر پر میرے گھر لے آنا۔" عمر سلام نے پکا پروگرام بتایا اور مین نے اسی دن اپنے پاکستانی دوستوں کیپٹن سلیم اور جہازوں کے انجنیئر راحت عزیز کو دعوت کا پرگرام بتا دیا۔ "ایسا کرنا کل ہمارے گھر چھ بجے آجانا۔ وہاں سے میں آپ کو عمر سلام کے گھر لے چلوں گا۔"

دوسرے دن صبح سے اتنی شدید برف باری ہوتی رہی کہ پورا شہر بند ہوگیا۔ پبلک ٹرانسپورٹ بھی بارہ بجے کے بعد بند ہوگئی۔ اپنی گاڑی نکالنے کی تو کسی کو ہمت ہی نہیں ہو رہی تھی۔

سڑکیں تو کیا ان کے کنارے رکھی بینچیں بھی برف میں دب گئیں۔ مالمو شہر کے بلدیہ کے اہلکار باقی شہر کو چھوڑ کر شاہراہ کو صاف کرنے میں لگ گئے۔ ایک طرف نمک سے لدے ٹرک سڑکوں پر نمک چھڑکتے رہے دوسری طرف ٹریکٹر برف کو ہٹاتے رہے تاکہ دوسرے شہروں سے گزرنے والی تیز رفتار گاڑیاں ہائی وے کو بلاک نہ کردیں۔ دوپہر کو بھی رات کا سماں لگ رہا تھا۔ موسم صاف ہونے کا شام تک کوئی امکان نہیں تھا۔ میرے پاکستانی دوستوں نے تو فون پر آنے سے معذرت کرلی۔ عمر سلام کو بتایا تو وہ کہنے لگا کسی اور کو ہی لے آنا۔ تھوڑا قریب، پڑوس کے علاقے میں رہنے والے بنگلہ دیش کے کیپٹن حبیب اور ملائیشیا کے کیپٹن یعقوب رزالی کو ہرن کی دعوت کا قصہ سنا کر آنے کے لئے کہا۔ وہ لوگ اپنی بیگمات اور بچوں کے ساتھ واک کرتے ہوئے ہمارے گھر پہنچ گئے۔ وہاں سے ہم سب لوگ عمر سلام کے گھر پہنچے۔

ادھر ادھر کی خبروں کے بعد ہم لوگ کھانے کی ٹیبل پر بیٹھ گئے۔ بنگالی کیپٹن حبیب جسے تھوڑی اردو بھی آتی تھی مجھے مخاطب کرکے سرگوشی کی "یار تمہارے اس یاسر عرفات کے ملک کے عرب دوست کے پاس یہاں کا ہرن (Reindeer) مارنے کا لائسنس واقعی موجود ہے؟ کہیں سانتا کلاز کی سواری کا ہرن کاٹ کر تو نہیں لے آیا ہے۔" بہرحال ہم لوگوں نے ہنسی مذاق کرتے ہوئے کھانا شروع کیا۔ دعوت عمر سلام نے دی تھی لیکن میزبان کے فرائض میں بجالارہا تھا۔ ویسے بھی آج ہمارے دوست عمر اور اس کی بیگم کچھ خاموش خاموش نظر آرہے تھے۔ خراب موسم ہونے کی وجہ سے شاید ان کی طبیعت خراب ہو یا نئے لوگوں (میرے دوستوں) کی وجہ سے کم بول رہے ہوں۔ ٹیبل پر چاول، نان آلو کی سبزی، دو بڑی ڈش سالن کے تھے۔ ایک میں مرغی تھی اور دوسرا ظاہر ہے ہرن کے گوشت کا تھا۔ عمر سلام نے حالانکہ مجھ سے وعدہ کیا تھا کو وہ زیادہ تکلف نہیں کرے گا صرف ہرن کے گوشت کی ایک ہی ڈش کافی رہے گی۔ لیکن پھر بھی اس نے مرغی اور سبزی بھی بنوالی۔ بہرحال ہم نے مرغی اور سبزی بھی کھائی لیکن سب لوگوں نے ہرن کا گوشت زیادہ پسند کیا۔ کھانے کے دوران میں چاہتا تھا کہ عمر سلام یہاں کے ہرن اور ان کی نسل کے بارے میں کچھ بتائے لیکن وہ دوسری باتیں ہی کرتا رہا بلکہ ایک دفعہ میں نے ہرن کا ذکر چھیڑا تو بات گول مول کر گیا۔ کھانے کے بعد ہم لوگ چائے کے لئے ڈرائنگ روم میں آکر بیٹھے۔ جس صوفے پر میں بیٹھا تھا وہاں

مزید کسی کے بیٹھنے کی گنجائش نہیں تھی لیکن عمر تھوڑی بہت جگہ بنا کر بیٹھ ہی گیا اور جس وقت باقی مہمان آپس میں محو گفتگو تھے تو عمر نے آہستہ سے مجھے کہا: "الطاف کھانا پسند آیا؟"

"بہت اچھا تھا۔" میں نے جواب دیا۔ "خاص طور پر یہاں کے ہرن کا تو جواب نہیں ہے۔"

اور پھر تھوڑی دیر سوچنے کے بعد عمر نے پھر سرگوشی کی۔ "آپ لوگ اونٹ کا گوشت کھاتے ہیں۔"

"چھوڑ یار عمر۔" میں نے قدرے زور سے کہا۔ "خرگوش اور ہرن تک تو ٹھیک ہے اونٹ کا گوشت نہ کھلانا۔"

میرا یہ جملہ دوسرے مہمانوں نے بھی سنا اور سب ہنسنے لگے۔ حبیب اور رزالی دونوں نے ایک ساتھ پوچھا۔ "کیا اونٹ حلال ہے؟" ان کے سوال کرنے میں حیرت زیادہ تھی۔ ظاہر ہے اونٹ ریگستان کا جانور ہے اس سے عربوں اور ہم پاکستانیوں کا تو واسطہ پڑتا ہے لیکن بنگلہ دیش اور ملائیشیا کے لوگوں کو اونٹ کا کیا پتہ جن کے ملک میں سارا سال بارش ہوتی ہے۔ ان لوگوں نے اونٹ کو تصویریوں میں دیکھا ہے یا چڑیا گھر میں۔ ملائیشیا کے ملاکا والے چڑیا گھر میں گدھے اور اونٹ ہیں لیکن کوالالمپور والا چڑیا گھر اونٹوں سے خالی ہے۔ تو ان کو کیا معلوم کہ یہ آفت چیز اونٹ حلال ہے یا حرام۔

"بلکل حلال ہے۔" عمر سلام نے کہا۔

"لیکن عمر سلام ہمیں اونٹ نہیں کھلانا۔" کیپٹن حبیب نے کہا۔

"نہیں میں یہ پوچھ رہا ہوں کہ آپ نے کبھی اونٹ کھایا ہے؟" عمر سلام نے بڑے ادب سے پوچھا۔

"نہیں بھائی نہیں۔ توبہ کرو۔" رزالی اور حبیب نے ایک ساتھ کہا اس کے ساتھ میں نے دیکھا کہ ان کی بیگمات بھی شکلیں بنانے لگیں۔

"الطاف آپ نے کھایا ہے؟" عمر نے میرے طرف گردن کر کے مجھ سے پوچھا۔

"یار میں نے تو کئی دفعہ کھایا ہے۔ طرابلس (بیروت)، دبئی، دوحہ، سعودی عرب میں بہت کھایا ہے خاص طور اس گوشت کی سینڈوچز جسے عرب لوگ شوارما کہتے ہیں۔"

"ارے وہ تو میں نے بھی کھائے ہیں۔" کیپٹن حبیب کہنے لگا۔

"تو وہ ہی تو اونٹ کا گوشت ہے۔" میں نے کہا۔

"او خانہ خراب" حبیب نے پٹھانوں کی نقل کرتے ہوئے کہا۔ "لیکن یارو ہوتا بڑا لذیذ ہے"

"لذیز ہوتا ہے نا؟" عمر نے خاطری کرنے کے لئے پوچھا۔

"بالکل" ہم نے مل کر جواب دیا۔

"بھلا آج کا گوشت کیسا لگا؟" عمر نے پوچھا۔

"وہ تو بہت ہی لذیذ تھا۔ ہرن کے گوشت کا تو جواب ہی نہیں۔" ملائیشیا کے کیپٹن رزالی نے کہا۔

میرے پاس بیٹھے ہوئے عمر سلام نے اپنا منہ میرے کان کے قریب لاتے ہوئے آہستہ سے کہا۔: "الطاف آج جو گوشت آپ لوگوں نے کھایا ہے وہ ہرن کا نہیں اونٹ کا گوشت تھا۔"

"قسم سے۔۔۔؟" میں نے پوچھا۔

"ہاں۔ ہوا یہ کہ موسم خراب ہونے کی وجہ سے ہرن نہیں مل سکا۔ یہ تیونس سے درآمد کئے گئے اونٹ کے چھوٹے بچے کا گوشت تھا۔"

"تو پہلے کیوں نہیں بتایا؟" مین نے آہستہ سے اس سے پوچھا۔

"تو آپ لوگ نہیں کھاتے۔" عمر نے کہا۔

"اور جب ہم لوگوں نے کھالیا تو اب بتانے کی کیا ضرورت ہے۔" میں نے پوچھا۔

"آپ اس سالن کی اتنی تعریف کر رہے تھے کہ مجھے اور میری بیوی کو اپنی غلط بیانی کا احساس ہو رہا تھا اور ہم سوچ رہے تھے کہ آپ کو سچ بتایا جائے۔ مرغی بھی ہم لوگوں نے اس لئے احتیاطاً بنائی کہ کیا پتہ آپ لوگوں کو اونٹ کا گوشت پسند آئے نا آئے تو کھانے کو کچھ اور تو ہو۔" عمر نے کہا۔

"بھائی میرے بات سنو۔" میں نے کیپٹن حبیب کو خاموش کراتے ہوئے کہا جو ملائیشیا کے کیپٹن رزالی سے ابھی تک بحث کر رہا تھا کہ اونٹ حلال ہے یا حرام یا مکروہ۔

"جنہوں نے اونٹ کا گوشت نہیں کھایا ہے ان سب کو آج زندگی میں پہلی مرتبہ اونٹ کا گوشت کھانا مبارک ہو۔"

افریقی ممالک کی زبوں حالی

گزشتہ صدی کے آخری عشرے میں بلکہ درمیانی برسوں میں افریقی ملکوں کی معاشی ترقی کی رفتار دیکھ کر لگ رہا تھا کہ افریقہ ترقی کی راہ پر گامزن ہے۔ افریقہ میں بیداری کا دور آ رہا ہے۔کئی برسوں کے غموں اور مشکلات کے بعد افریقہ میں خوشحالی آ رہی ہے۔ یا یہ کہا جائے کہ کم ازکم اس کے آثار نظر آنے لگے ہیں۔ میں ان دنوں میں سوئیڈن میں تھا اور میرے ساتھ سو سے زائد ملکوں کے جہاز ران جن میں کئی افریقی ملکوں کے اکنامسٹ بھی تھے۔ ان کا بھی یہ کہنا تھا کہ اعداد و شمار یہ بتاتے ہیں کہ افریقہ کی مالی حالت سدھر گئی ہے۔

اس کے علاوہ پورے افریقہ میں کثیر جماعت جمہوریت پھیل رہی تھی۔ سیاسی رہنماؤں کی ایک نئی فصل نمودار ہو رہی تھی۔ جنوبی افریقہ میں نیلسن منڈیلا، یوگنڈا میں یوویری موسیوعنی، ایتھوپیا میں میلز زیناوی وغیرہ وغیرہ۔ سیاسی رہنماؤں کی یہ نئی فصل بنیادی صحت اور تعلیم مہیا کر کے عوام کی زندگی کو بہتر بنانا چاہتی تھی۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے اس براعظم کے ستائے ہوئے لوگوں کے اچھے دن آنے والے ہیں۔

لیکن یہ سارا سراب تھا۔ نئے سیاسی رہنما آپس میں لڑنے جھگڑنے لگ گئے اور معاشی ترقی کی جو رفتار اور وہ جو شادابی بتائی جارہی تھی وہ اس سال کی اچھی بارش اور غلط گنتی کا نتیجہ تھا حقیقت میں تو مردم شماری کا تناسب بڑھنے کی وجہ سے حالات اور خراب ہوگئے۔

کیا افریقہ سے کوئی خاص باتیں وابستہ ہیں جن کی وجہ سے یہ پورا براعظم (سوائے دو تین ملکوں کے) غربت کی حالت میں رہتا ہے۔ اپنے افریقی دوستوں اور جہاز راں ساتھیوں سے پوچھو تو ان مین سے کچھ اس کا سبب جنگیں، کرپشن اور سرداری نظام بتاتے ہیں۔ کچھ لوگ اس کا سارا الزام یورپی ملکوں پر لگاتے ہیں جنہوں نے مختلف افریقی ملکوں پر قبضہ کئے رکھا اور خوب لوٹ کھسوٹ کی۔ ہم ایشیا کے لوگ بھی ہر ناکامی کا الزام انگریز راج پر لگاتے ہیں اور کچھ باتوں میں تو واقعی ہماری گرتی ہوئی معیشت کے ذمہ دار ہیں جنہوں نے ہمارے لئے خواہ مخواہ کشمیر جیسے مسائل پیدا کرکے ہمیں الجھا رکھا ہے۔ لیکن افریقی لوگ اس معاملے میں ان یورپی افراد کو کچھ زیادہ ہی گالیاں دیتے ہیں۔ کئی باتوں میں تو ان کی موجودہ حکومت کا قصور ہوتا ہے لیکن حاکم وقت خود کو بچانے کے لئے الزام اپنے گورے حاکموں پر لگاتے ہیں۔ اس کے علاوہ روز بروز گرتی ہوئی معیشت اور تجارت کے لئے بھی یہ لوگ آئی ایم ایف اور عالمی بینک کو مورد الزام ٹھہراتے ہیں۔

ویسے بھی دیکھا جائے تو سرداری نظام تو بوسنیا اور آئرلینڈ میں بھی ہے۔ ڈکٹیٹر شپ تو شمالی کوریا اور کیوبا میں بھی ہے اور کرپشن دنیا کے کس ملک میں نہیں ہے۔ یعنی یہ ساری چیزیں صرف افریقہ میں نہیں بلکہ دیگر ممالک میں بھی ہیں۔ لیکن یہ چیز باعث تعجب ہے کہ یہ ساری برائیاں افریقی ممالک میں ایک ساتھ ہیں اس لئے سوڈان اور نائیجیریا جیسے ملک جن سے تیل نکلتا ہے ابھی تک مقروض ہیں۔

براعظم افریقہ کی کچھ باتیں جو غورطلب ہیں۔

یورپی افراد براعظم افریقہ کے کناروں تک پہنچے اس سے قبل افریقہ کے حالات اتنے اچھے نہیں تھے۔ افریقہ پر قدرت بھی کوئی خاص مہربان نہیں رہی ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ براعظم انسانوں کا اوائلی جنم بھومی رہا ہے۔ سب سے پہلے انسان کی پیدائش اس خطے میں ہوئی لیکن یہ بھی تعجب کی بات نہیں ہے کہ ہر دور میں اس براعظم کے لوگوں نے یہاں سے ہجرت کرکے دوسرے علاقوں میں رہنا پسند کیا۔

براعظم افریقہ کا بہت بڑا حصہ زراعت کیلئے مناسب نہیں کیونکہ کئی جگہوں پر مٹی بہت خراب یا پتلی ہے جہاں لگاتار مشکل سے دو یا تین فصلیں کی جا سکتی ہیں۔

افریقہ میں سورج نکلتے وقت اس کی تپش سے انسان جانور، چرند پرند اور کھیت وغیرہ بہت زیادہ متاثر ہوتے ہیں۔

افریقہ میں بارش کا بھی عجیب سلسلہ رہتا ہے۔ یورپ کی طرح مستقل بوندا باندی نہیں ہوتی جو ہریالی قائم رکھنے کیلئے بہتر ثابت ہو۔ افریقہ میں بارش ہوگی تو پھر رکنے کا نام نہیں لے گی اور سیلاب برپا کردے گی جس کے باعث بویا ہوا بیج یا نپیری اور کبھی کبھی تو کھڑی فصل تباہ ہوجائے گی اور ایسی بارش رحمت کی بجائے زحمت اور قحط کا پیغام ثابت ہوتی ہے (جیسے آجکل موزمبیق میں ہوا) فصل تو ساری تباہ ہو ہی گئے مکان وغیرہ بھی بارش میں بہہ گئے۔ یا پھر بالکل بارش نہیں ہوگی۔ کھیتی باڑی تو کیا انسان اور جانور بھی پانی کی بوند کو ترستے رہیں گے۔ (جیسے اس سال ایتھوپیا میں ہوا ہے(

افریقہ میں مچھر ہو یا مگرمچھ، خنزیر ہو یا کنکھجورا ہر چیز بڑے سائز کی نظر آئے گی جن کا کاٹا ہوا مرنے سے بچ بھی جائے لیکن وہ دوبارہ چلنے پھرنے کے قابل نہیں رہتا اور تمام مہلک ترین بیماریاں آپ کو افریقہ میں ہی ملیں گی۔

انیسویں صدی کی نصف میں جب یورپی افراد افریقہ میں داخل ہونے لگے تو افریقہ میں غلاموں کی بڑھتی ہوئی ڈیمانڈ کی وجہ سے افراتفری مچی ہوئی تھی۔ براعظم افریقہ کے مشرقی کنارے والے ممالک میں عربوں نے کھلبلی مچا رکھی تھی جن کے پالتو غنڈے اور ڈاکوؤں کے گروہ و سطی افریقہ کے گھنے جنگلوں تک جا کر حبشیوں کو غلام بنا کر بیچنے کے لئے پکڑ کر لاتے تھے اور مغربی کنارے پر مقامی سردار نہ صرف ان حبشیوں کو جو مجرم تھے بلکہ کئی معصوم جانوں کو چند سکوں کی خاطر گوروں کے حوالے کر دیتے تھے۔ یہ غلام اس زمانے کے خوفناک قسم کے مال بردار جہازوں پر رسیوں سے باندھ کر امریکہ بھیجے جاتے تھے۔

بیسویں صدی کی تیسری چوتھائی میں افریقی ممالک کو یورپیوں کی طرف سے آزادی ملنی شروع ہوئی۔ حکومت مقامی حبشی لوگوں کے ہاتھوں میں آئی لیکن افسوس کی بات یہ تھی کو حکومت حاصل کرنے کے بعد انہوں نے اپنے لئے گوروں والی عیاشیاں قائم رکھیں اور عوام کے لئے وہی مصیبتیں برقرار رکھیں جو پہلے تھیں۔ افریقہ کے عوام کے لئے ملک کی آزادی کا مطلب اس سے زیادہ کچھ اور نہ تھا کہ ایک سفید فام ظالم حکمران کی جگہ کالے نے لے لی۔

امریکی اور یورپی ممالک میں سیاستدان جو عوام کے نمائندے ہوتے ہیں انہیں ہر وقت عوام کے مسائل کی فکر پڑی رہتی ہے اور وہ انہیں دور کرنے کی پوری کوشش کرتے ہیں۔ افریقی سیاستدان ووٹ ملنے، رکن یا وزیر بننے کے بعد مسائل کی بجائے ان لوگوں کو دور کرنے کی کوشش کرتے ہیں جو مسائل لے کر آتے ہیں وہ نمود و نمائش کے ذریعے عوام کو یہ بتانے کی کوشش کرتے ہیں کہ انہوں نے 'عام زندگی' سے خود کو بچالیا ہے اور اب وہ ایک اہم اور "بڑے آدمی" بن گئے ہیں۔ وہ طاقتور اور امیر بن گئے ہیں۔ وہ ان چیزوں کا مظاہرہ کرنے کے لئے عجیب حرکتیں کرتے ہیں۔ عوام کے ہی فنڈ غبن کرکے محل نما گھر بناتے ہیں۔ اعلیٰ قسم کی کاریں خریدتے ہیں جن پر پھڑکتے ہوئے جھنڈے کے ساتھ ان کے دل بھی پھڑکتے ہیں۔ ملکی خزانے میں چاہے ایک سکہ بھی نہ رہے لیکن ان کے گھر دولت سے بھرے ہونے چاہئیں۔

ذاتی طاقت کو بڑھانے کی خاطر افریقی رہنماؤں نے کئی قومی ادارے تباہ کر دیئے۔ مثال کے طور پر ملک کی ہوائی کمپنی یا پولیس کے ادارے کا سربراہ ایسا رکھیں گے جو اس ادارے کو خوشحال بنانے کی بجائے اپنے سیاسی رہنما کو خوش رکھنے کی کوشش کرے، اس کو زیادہ سے زیادہ مال پہنچائے اور پھر نیچے تک ادارے کا ہر ایک کارندہ ملک اور قوم کی خدمت کا سوچنے کے بجائے اپنے افسر کا ذاتی نوکر بن جاتا ہے اور ناجائز طریقوں سے لوٹ کھسوٹ کرکے خود اور اپنے صاحب کو "عیش" کراتا ہے جس کے نتیجے میں چاروں طرف کرپشن ہی کرپشن عام ہو جاتی ہے۔ زمبابوے کی مثال لے لیں۔سوائے چند بہادر اور نیک ججوں کے باقی سارے سرکاری افسر یعنی بیوروکریٹ یہ سمجھ کر اس پر عمل کررہے ہیں کہ ان کی وفاداری ملک کے صدر کے ساتھ ہے نہ کہ ریاست کے ساتھ۔

افریقہ کے کئی ممالک میں صرف نام کی جمہوریت قائم ہے تاکہ یورپ اور امریکہ کی امدادی ایجنسیوں سے خیرات حاصل کی جاسکے۔کئی ممالک میں تو اس وقت تک الیکشن بھی نہیں ہوتے جب تک ان پر عالمی دباؤ نہ بڑھ جائے۔ غریب عوام کیا کرسکتے ہیں۔

افریقی ملکوں کا سربراہ چاہے صدر ہو یا وزیراعظم، پوزیشن حاصل کرنے کے بعد عجیب شکنجے میں آ جاتاہے۔ حکومت ملنے کے بعد ان کو طاقت اور کنٹرول چاہیے یعنی وہ یہ چاہتا ہے کہ جو اس کے جی میں آئے وہ کرے۔ وہ خود کو اور اپنے عزیزوں اور دوستوں کو بغیر کسی میرٹ کے بڑی نوکریاں، بڑے قرضے اور بڑے انعامات دینا چاہتا ہے۔ مخالف پارٹی کے لوگوں کو جوتے کی نوک پر رکھنا چاہتا ہے۔ ان کو جھوٹے مقدمات میں پھنسا کر اور جیلوں میں ڈال کر ذلیل کرنا چاہتا ہے۔

باہر کی دنیا خاص طور امریکہ اور یورپ کے ممالک جو طاقتور ہیں، جن میں جمہوریت ہے اور جن کی خیرات پر زیادہ تر افریقی ملک چل رہے ہیں ان ملکوں کی حکومتیں افریقی سربرا ہوں سے انسانی حقوق اور گڈ گورننس چاہتے ہیں۔ لیکن افریقی رہنماؤں کو یہ بات اچھی نہیں لگتی۔ افریقی حاکم تو ملک کے خزانے کو اپنا ذاتی بینک سمجھ کر اپنے لئے استعمال کرنا چاہتا ہے۔ ملک کی پولیس کو اپنی فوج تصور کرتا ہے۔ یہی سبب ہے کہ افریقہ کے کئی ملکوں کے سربراہ ملک کی خدمت کرنے کی بجائے (جس کے لئے عوام نے انہیں ووٹ دیا ہے اور اس نے خود بھی یہ نعرہ لگا کر حکومت حاصل کی ہے) اسے تباہ اور برباد کردیتے ہیں۔

ظاہری طور پر ہر افریقی ملک میں ایک جدید ریاست ہے۔ اس کے پاس سرحد ہے، پرچم ہے، وزیر ہیں، سول سروس، کورٹ اور پولیس جیسے ادارے ہیں لیکن اندر سے کئی ملک کھوکھلے ہیں۔ زائر (Zaire) ایک ایسے ملک کی مثال ہے جس کے سپریم ماسٹر موبوتو تھے (1997ءمیں موبوتو کو حکومت سے ہٹانے کے بعد زائر کو اب اپنے اصلی نام کانگو سے پکارا جاتا ہے) موبوتو (Mobutu Sese Seko) کے 35 سالہ دور حکومت میں اس ملک زائر (کانگو) کے وزیر تھے، کابینہ تھی، گورنر تھا، سرکاری افسر تھے اور سفیر تھے۔ ان سب نے مل کر ایک مکمل حکومت کا نمونہ پیش کیا تھا لیکن بقول مغربی میڈیا کے یہ سب موبوتو کے ذاتی نوکر بن کر کام کرتے تھے اور ان کے ذریعے موبوتو نے کانگو کی دولت چرائی اور یہی حال افریقہ کے اور کئی ممالک کا ہے۔

اس دفعہ کوپن ہیگن سے مالمو (سوئیڈن) آتے ہوئے میرے ساتھ ایک جرمن یا شاید بیلجیئم کا پروفیسر بیٹھا تھا جسے سوئیڈن کے شہر گوتھن برگ جانا تھا جہاں نیچرل ہسٹری میوزیم میں دنیا کے قدیمی اور بڑے جانور ڈائنو سارس کی ہڈیوں کی نمائش منعقد کی جانے والی تھی۔ یہ پروفیسر اس مضمون کے ماہر سائنسدان تھے اور انگریزی پر بھی عبور رکھتے تھے۔ مالمو تک ہماری گفتگو کا موضوع ڈائنو سارس رہا۔ ان کی بتائی ہوئی چند باتیں جو مجھے ابھی تک یاد ہیں قارئین کی نذر کر رہا ہوں۔

موئن جو دڑو یا اہرام مصر کافی پرانے ہیں۔ تقریباً پانچ چھ ہزار سال پرانے سمجھ لیں۔ اسی طرح دس ہزار سال اور اس سے بھی زیادہ ایک لاکھ سال بہت بڑا عرصہ ہے۔ اسی طرح دس لاکھ سال جو ایک ملین برس ہوئے اور بھی زیادہ عرصہ ہوا۔ سائنس کی تحقیقات کے مطابق ڈائنو سار کب پیدا ہوئے اس کے لئے 100 سال یا ایک ہزار سال کا یونٹ نہیں بلکہ ایک ملین برسوں کے یونٹ کا استعمال ضروری ہے۔

یہ بھاری بھرکم جانور آج سے 220 ملین برس قبل اس زمین پر نمودار ہوئے تھے۔ ڈیڑھ سو ملین برس تک ان کی کئی نسلیں موجود رہیں اور پھر اچانک غائب ہوگئیں۔ ان کو ختم ہوئے بھی آج تقریباً 65 ملین برس ہوگئے ہیں۔

ڈائنو سارس (Dinosaurs)قدیم یونانی لفظ ہے۔ ڈائنو کا مطلب خطرناک اور سارس کے معنی چھپکلی ہے۔ اور اس چھپکلی کی کیا بات کی جائے جس کی بعض اقسام اونچائی اور لمبائی میں سوفٹ سے بھی زیادہ تھیں۔ یعنی چھ فٹ کے بیس آدمی ایک دوسرے کے کندھے پر کھڑے ہو جائیں تب جاکر اس کے منہ تک پہنچیں۔ خصوصاً سیسمو سارس (Seismosaurs) جیسے ڈائنو سارس جو 120 فٹ سے بھی زیادہ اونچے تھے۔ سیسمو سارس چلتا تھا تو اردگرد کی زمین ہل جاتی تھی۔ اس لئے اس ڈائنو سارس کو سیسمو سارس یعنی "زلزلہ پیدا کرنے والی چھپکلی" کہتے ہیں۔

یہ جانور دریاؤں اور سمندروں میں تو ایسے چلتے تھے جیسے کتا یا بلا بارش کے پانی میں چل رہا ہو۔ بعض اقسام کے ڈائنو سار تو گہرے سمندر میں تیر سکتے تھے اور بعض پرندوں کی طرح اڑتے تھے۔ ان کے اڑنے کے وقت زمین پر اتنا سایہ ہوتا تھا جیسے بارش کے لئے بادل امنڈے آئے ہوں۔

"سائنسدانوں کو یہ کیسے معلوم ہوا کہ اتنے بڑے جانور، اتنے سال قبل زمین پر موجود تھے؟" ڈائنو سار کے اس ماہر سے میں نے سوال کیا۔

"سائنسدانوں کو زمین سے ملی ہوئی ہڈیوں سے معلوم ہوا۔ یہ ہڈیاں جو پتھر کی صورت اختیار کر چکی ہیں آج بھی اس کرہ ارض پر مختلف جگہوں سے ملتی رہتی ہیں جن سے ان جانوروں کے قدو قامت کا پتہ چلتا ہے۔"

ان جانوروں میں سے کچھ کی ہڈیاں گوہ (Iguana)یا سانڈے کی ہڈیوں سے ملتی ہیں اور ڈائنو سار کی ایک مخصوص جنس) Saurischiaus چھپکلی کی کمر والے جانور) کہلاتی ہے اور دوسری)Ornithischiausپرندے کی کمر والے جانور) کہلاتے ہے۔ یہ ڈائنو سار گھاس اور درختوں کے پتے کھاتا تھا جس کا سائنسدانوں کو علم اس جانور کے دانتوں کی گھسائی سے ہوا ہے۔ یعنی اس کے دانت اونٹ اور گائے بھینس کی دانتوں کی طرح گھسے ہوئے ہیں۔

جس دور میں ڈائنو سار کی اوائلی جنس پیدا ہوئی یعنی تقریباً 220 ملین برس قبل اس دور کو ٹریسک (Traissic)کہتے ہیں یہ دور تقریباً دس ملین برس رہا۔ اس کے بعد کا دور جو آج سے 210 ملین برس قبل شروع ہوکر 150 ملین برس قبل تک رہا۔ جوارسک (Jurassic) کہلاتا ہے۔ اس دور میں مختلف براعظم ایک دوسرے سے جڑے ہوئے تھے اور ان کو الگ کرکے آج کی صورت اختیار کرنے میں بھی تقریبا کوئی ایک ملین یعنی دس لاکھ سال لگ گئے۔ ان قدیمی بلاؤں کی ہڈیاں ہر جگہ نظر آتی ہیں۔میکسیکو سے منگولیا اور آسٹریلیا سے امریکہ تک۔

امریکہ میں بنی ہوئی فلم جراسک اور جراسک پارک کا نام اسی دور سے ماخوذ ہے۔ جراسک پارک میں اس دور کے مختلف ڈائنوسار دکھائے گئے ہیں۔ جراسک کے بعد والا دور Cretaceous کہلاتا ہے جو 75 ملین سال چلا اور آج سے 65 ملین برس قبل ختم ہوا۔ اس دور کے آخر میں یہ سارے بھاری بھرکم اور قدیمی جانور نیست و نابود ہوگئے۔

"یہ جانور کیسے ختم ہوئے؟" میں نے پوچھا۔

انہوں نے کہا کہ اس کا تسلی بخش جواب کسی کے پاس نہیں ہے۔ بعض سائنسدان کہتے ہیں کہ یہ جانور بھوک کی وجہ سے مرگئے۔ ان کو کھانے کے لئے بہت زیادہ مقدار میں خوراک کی ضرورت ہوتی تھی اور ان جانوروں نے کھاکھا کر سارے جنگلات صاف کر ڈالے۔کچھ سائنسدان ان کے خاتمے کا سبب کوئی پلیگ جیسی بیماری کہتے ہیں جس کے پھیلنے سے یہ سب ختم ہوگئے۔کچھ لوگ کہتے ہیں کہ زمین پر کسی دمدار ستارے کا ٹکڑا (Asteroid/Comet)ایسا زور سے ٹکرایا کہ ساری زمین پر کئی مہنوں تک دھول کے بادل اڑتے رہے اور مستقل اندھیرا چھانے اور ہوا ختم ہونے کی وجہ سے درخت اور بڑے جانور (ڈائنو سار) ختم ہوگئے۔ ان چھپکلیوں میں صرف چھوٹی چھپکلی بچ گئی جو آج بھی ہر گھر میں نظر آتی ہے جو Senior Citizen کہلاتی ہے۔

چینیوں کو افیونی کس نے بنایا

سوئیڈن میں دو سال کے قیام کے دوران ہمارا زیادہ تر وقت اچھے ماحول میں گزرا۔ سب ایک خاندان کے افراد کی طرح رہتے تھے لیکن جہاں چار بھائی ایک گھر میں رہتے ہوں تو وہاں ان میں بھی کبھی کبھی تھوڑا بہت اختلاف یا غلط فہمی پیدا ہو جاتی ہے اس طرح ہمارے ساتھ بھی تھا۔ عرب اور ہم پاکستانی لوگ تو ویسے ہی اتنی اونچی آواز میں بولتے ہیں کہ دوسروں کو لگتا ہے کہ لڑ رہے ہیں مگر یہاں تو افریقہ کے بھی ہر ملک کے لوگ تھے جن کی نمائندہ خواتین بھی ہم سے اونچی آواز میں بولتی تھیں۔ ایرانی طبعاً خاموشی کے ساتھ اپنا گروپ بناکر چلتے تھے مگر باقی لوگوں کو ایسا لگتا تھا کہ وہ ان سے روٹھے ہوئے ہوں۔ بہرحال کبھی کبھی وہ بھی لڑتے رہتے تھے اور یہی حال ملئی، انڈونیشی، ویتنامی اور برمیوں کا تھا۔ ان دو سال کا اس وقت تجزیہ کرتا ہوں تو چینی واحد قوم تھی جس کے نمائندے، جو ہمیشہ خاموش رہے کبھی اونچی آواز میں بات کرتے تھے اور نہ کسی کو ٹوکتے تھے۔ اللہ ہی بہتر جانتا ہے کہ ان کو ان کی حکومت کی طرف سے احکامات ملے ہوئے تھے یا وہ فطرتاً ایسے صابر ہیں۔ یہاں تک کہ دوسروں کے تبصرے کا جواب بھی مسکراہٹ سے دیتے تھے ۔ ایک زمانہ تھا کہ امریکہ بہادر کو ماؤزے تنگ کے چین کے لوگ اچھے نہیں لگتے تھے شاید اس لئے امریکی برادری کے ملکوں (خصوصاً یورپ) کے لوگوں کو آج بھی چینی اچھے

نہیں لگتے ہیں۔ سوئیڈن میں رہائش کے دوران یورپ کے کئی ممالک خصوصاً فرانس، ہالینڈ، اسپین یہاں تک کہ انگلینڈ کے لوگ چینیوں پر خواہ مخواہ نکتہ چینی کرتے رہتے تھے۔ "چینی لوگ جاہل ہیں،کنجوس ہیں،یا سوشل نہیں ہیں---"

ان کے اس قسم کے تبصرے سن کر افسوس ہوتا تھا۔ سب سے زیادہ دکھ تب ہوتا تھا جب کوئی یورپی افسر چینیوں کو بدمعاش افیونی یا Pot Smoker کہتا تھا۔

ماؤزے تنگ کے انقلاب تک چینی ایک نشئی قوم بن چکی تھی۔ چین کی گلی گلی میں افیون کے عادی لوگ نظر آتے تھے ان کے لئے افیون (Opium) ہی سب کچھ بن گیا تھا مگر آج کے نوجوان جو تاریخ سے ناواقف ہیں انہوں نے کبھی یہ بھی سوچا ہے کہ کیا چینی شروع سے افیونی تھے؟ چینیوں کو یہ لت کس نے لگائی؟ کن لوگوں نے ان کا اخلاقی معیار تباہ کیا؟ یہ ایسے سوالات تھے جو سوئیڈن میں اپنے ان یورپی جہاز ران ساتھیوں سے پوچھا کرتا تھا جب وہ چینیوں کے لئے کوئی غیر اخلاقی تبصرہ کیا کرتے تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ چینیوں کو تباہ کرنے میں یورپی لوگوں کا ہاتھ ہے۔ خصوصاً انگریزوں کا جو اب اخلاق (Morality) اور نیکی کے چیمپئن کہلاتے ہیں اور دوسروں کو آزاد رہنے کا درس دیتے ہیں۔

آج ہانگ کانگ چینیوں کے پاس واپس چلا گیا ہے جو سو سال تک انگریزوں کے قبضے میں تھا۔ کس بنیاد پر انگریزوں نے دوسروں کے ملک کا حصہ اپنے پاس رکھا اور دولت کمانے کے چکر میں چینیوں جیسی سلجھی ہوئی اور پرانی تہذیب سے واسطہ رکھنے والی قوم کو نشئی بنا دیا؟

چین صدیوں سے ایک بڑا ملک رہا ہے چین کی تہذیب نہ صرف قدیمی ہے بلکہ کئی ممالک اور اقوام نے چین سے بہت کچھ سیکھا ۔ جاپان جیسے ملک نے اپنی زبان کا رسم الخط چینیوں سے سیکھا۔ چین فن و ثقافت کی دنیا میں صدیوں سے مشہور رہا ہے چین نے دنیا کو میڈیکل سائنس اور فلسفہ دیا۔ تجارت کے معاملے میں چین کے تعلقات ساری دنیا سے رہے ۔ اٹھارویں صدی کے اوائل میں انگلینڈ کے چین سے تجارتی تعلقات تھے۔

انگریز چین سے کئی چیزیں درآمد کرتے تھے، خاص طور پر چائے، ریشم اور ربارب (Rhubarb) کافی تعداد میں لیتے تھے۔ (ربارب ریوند چینی کے نسل کا ایک بڑا پودا ہوتا ہے جو چین کے باغات میں اگایا جاتا ہے جس کے پتوں کی موٹی موٹی ڈنڈیاں چٹنی وغیرہ بنانے میں استعمال ہوتی ہیں۔(

انگلینڈ والوں کو یہ سوچ کر بڑی پریشانی ہوتی تھی کہ یہ ساری تجارت یکطرفہ ہورہی تھی۔ یعنی انگلینڈ والے چین سے کئی چیزیں خرید کر بدلے میں اپنے چاندی اور سونے کے سکے دے رہے تھے اور چین کا یہ حال تھا کہ اس کے پاس ایک سے ایک چیز تھی اور وہ انگلینڈ سے کوئی بھی چیز خریدنے کے لئے تیار نہ تھا۔ چین ہر لحاظ سے ایک خوشحال ملک تھا مگر انگلینڈ والے اس چکر میں لگے رہے کہ کس طرح چین کو سونا چاندی دینے کے بجائے مال کے بدلے مال دیا جائے بلکہ کوئی ایسی چیز نکل آئے جس کی چین کو سخت ضرورت پڑے اور انگریز ان سے دولت کما سکے۔

چینی سیانے تھے وہ دیکھ رہے تھے کہ انگریزوں نے تجارت کی آڑ لے کر پورے ہندوستان پر قبضہ کرلیا۔ اس لئے چینی غیرملکی لوگوں سے احتیاط برتتے تھے۔ وہ انگریزوں کو مذکورہ چیزیں بیچتے رہے لیکن ان کو اپنے قریب آنے سے روک رکھا تھا۔ انگریزوں کے جہاز کو صرف کینٹن بندرگاہ میں آنے کی اجازت تھی۔ وہاں بھی ان کو چینی تاجروں

سے براہ راست ملاقات پر پابندی عائد تھی۔ انگریز تاجر اور برٹش ایسٹ انڈیا کمپنی کے افسروں کو چینی حکومت کے کسی بھی کارندے سے ملنے یا بات چیت کرنے کی اجازت نہیں تھی۔ پرتگالی واحد یورپی قوم تھی جس کو چین میں آنے اور مقامی لوگوں سے ملنے کی اجازت تھی۔ پرتگالی چین میں انگریزوں سے بہت پہلے یعنی سولہویں‌صدی میں پہنچے تھے۔ وہ چینی سرزمین سے تھوڑا دور مکاؤ جزیرے پر رہتے تھے (مکاؤ ابھی تک پرتگال کی کالونی سمجھی جاتی ہے جیسے بھارت میں کچھ عرصہ قبل گوا کی حیثیت تھی(

چینیوں نے انگریزوں کو کنٹن بندرگاہ میں آنے کی اجازت دی تھی مگر سال کے صرف چند گرمیوں والے مہینے۔ سردیاں شروع ہوتے ہی ان کو بندرگاہ خالی کرنی پڑتی تھی۔ ہوا اور لہروں کے ناموافق رخ یا کسی اور سبب کی وجہ سے ان کو لنگر اٹھانے میں مجبوری ہوتی تھی تو اس صورت میں بھی کنٹن بندرگاہ میں انتظار کرنے کی بجائے آگے پرتگالیوں کے جزیرے مکاؤ میں جا کر رکنا پڑتا تھا۔ چینی کسی بھی صورت میں انگریزوں سے نرمی سے پیش آنے جیسی بے وقوفی نہیں کرنا چاہتے تھے جو ہندوستان کے مغل حکمراں کر بیٹھے جس کے بعد پورے ہندوستان پر انگریزوں کا قبضہ ہوگیا۔ گرمیوں کے جو چند مہینے انگریزوں کے جہاز کنٹن کی بندرگاہ میں ہوتے تھے انگریزوں کو صرف بندرگاہ والے علاقے میں ہی گھومنے پھرنے کی اجازت ہوتی تھی اس سے آگے ہرگز نہیں۔ یہ ایسے ہی ہے جیسے کوئی جہاز کراچی میں آکر رکے اور جہاز والوں کو صرف کیماڑی تک محدود رکھا جائے۔ چینی حکومت نے ان پابندیوں کے علاوہ انگریزوں پر یہ بھی پابندی عائد کر رکھی تھی کہ وہ اپنے ساتھ کوئی عورت نہیں لاسکتے۔ انگریزوں سے تجارت کے سلسلے میں معاہدے یا چین کی حکومت سے وقت بہ وقت جاری کردہ پیغامات کا سلسلہ انگریزوں تک پہنچانے کے لئے کچھ خاص چینی افسران مقرر تھے جو "کو۔ہانگ" کہلاتے تھے جیسے حج کے دوران رہائش کے مسئلے، پاسپورٹ اور دیگر سرکاری کاغذی کاروائیاں مقامی عرب "معلم" کے معرفت پوری کی جاتی ہیں۔

انگریز جو اس وقت تک ہندوستان ، سری لنکا، برما، ملایا اور سنگاپور کے حاکم بن چکے تھے ان کے لئے چین کی حکومت کا یہ سلوک کسی بھی بے عزتی سے کم نہیں تھا۔

انگریزوں کی تو شروع سے یہ خواہش اور کوشش تھی کہ کسی طریقے سے چین کے داخلی معاملات تک پہنچ کر ہندوستان کی طرح چین پر بھی قبضہ کرلیا جائے لیکن چینی اتنا آسانی سے ان کی پکڑ میں نہیں آرہے تھے کیونکہ چینیوں کو اچھی طرح معلوم تھا کہ ان انگریزوں کو سر پر بٹھانے سے ان کا کیا حشر ہوگا۔ انگریزوں نے جو بنگال اور بہار میں کیا تھا اسے کوئی زیادہ وقت نہیں گزرا تھا جو چینی اپنی آنکھوں سے دیکھ چکے تھے۔ اس لئے چینی حکومت انگریزوں کو ایک محدود دائرے میں رکھنا چاہتی تھی اور یہ ہرگز نہیں چاہتی تھی کہ کسی غاصب یورپی قوم کو ڈھیل دی جائے جو مقامی لوگوں کی کمزوریوں سے فائدہ اٹھا کر تقسیم کرو اور حکومت کرو کے تحت اپنا الو سیدھا کرے۔

کینٹن (چین) میں مختصر مدت کے لئے رہنے والے انگریزوں نے اپنی حکومت کو عرضداشت بھیجی کہ ان کے اعلیٰ عہدیدار چین کے شہنشاہ سے مل کر ان پر عائد پابندیاں نرم کرنے کی درخواست کریں۔ یکم ستمبر 1795ء پر انگلینڈ کے پہلے سفیر لارڈ میکارتنی (Lord Macartney) نے پیکنگ پہنچ کر چین کے شہنشاہ سے ملاقات کی اور اسے انگریزوں کے لئے ایک دور کا ہی سہی جزیرہ مقرر کرنے کے لئے کہا جہاں وہ لوگ اپنا ٹھکانہ بنا سکیں اور بہتر موسم کے آنے تک وہاں ان کے جہاز انتظار کرسکیں۔ انگریزوں کی مجبوری کا اس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے

کہ 1789ءتک انگریزوں کی چینیوں کے ساتھ یکطرفہ تجارت اس قدر بڑھ گئی تھی کہ انگریزوں کو چین سے ہر سال بیس ملین (یعنی دو کروڑ) پاؤنڈکی صرف چائے خریدنی پڑرہی تھی جس کی قیمت تیس لاکھ پاؤنڈ اپنی بجٹ سے نکالنے پڑتے تھے۔ ان دنوں میں (1793ءمیں) انگلینڈ اور فرانس میں جنگ چھڑ گئی جس کی وجہ سے انگلینڈکی مالی حالت انتہائی کمزور ہوگئی، وہ ہرگز نہیں چاہتے تھے ان کے بجٹ کا ایک بڑا حصہ چائے جیسی عیاشی کے لئے چین کے پاس چلا جائے۔ ان کی پوری کوشش رہی کہ کسی طرح چین کو انگلینڈ سے کچھ خریدنے کا شوق دلایا جائے تاکہ انگریزوں کو بھی کچھ فائدہ حاصل ہو۔ اس سلسلے میں انگریز سفیر لارڈ میکارتنی چین کے شہنشاہ کے لئے کچھ تحائف بھی لے کر آئے مثلاً کرسٹل کے شانڈلر، گھڑی، ڈربی شائرکے برتن، بیرا میٹر، گلوب وغیرہ وغیرہ۔

افریقی قبائل کے سردار تو آئینے یا تھوڑے سے گن پاؤڈر جیسی چیزیں حاصل کرکے ان گورے لوگوں پر دل وجان سے فدا ہو جاتے تھے۔ بھارت کا بھی ایک حاکم ان گوروں سے ملیریاکے علاج کے لئے کوینن حاصل کرکے انہیں اپنی زمین دے بیٹھا تھا۔ انگریز سفیر نے سمجھاکہ چین کے شہنشاہ کی طرف سے ایسے بیش بہا تحائف حاصل کرکے لٹوہوجائےگا اور اس کے بدلے میں انگریزوں کو مانگی ہوئی ہر سہولت مہیاکردےگا لیکن چین کے شہنشاہ نے جواب میں ان مایوسی دے دی۔ اورکہاکہ ہمارے ملک کو آپ کی کسی چیزکی ضرورت نہیں ہے۔"

اس زمانے میں انگلینڈ کا بادشاہ جارج سوئم تھا۔ چین کے شہنشاہ نے ان کی طرف بھی ان کے بھیجے ہوئے تحائف کے لئے شکریہ کا خط ارسال کیا جس میں انہوں نے صاف صاف یہ بتایاکہ وہ (شہنشاہ چین) انگلینڈ کے سفیرکو پیکنگ میں رکھنے سے قاصر ہیں اور نہ ہی ان کے تاجروں اور جہاز رانوں کے لئےکوئی زمین کا حصہ دینے کے لئے رضامند ہے، چاہے وہ زمیں کا ٹکڑاکوئی دور دراز اور ویران جزیرہ ہی کیوں نہ ہو۔

جب کسی کامیابی کےکوئی آثار نظر نہ آئے تو انگریز سفیرکے پاس صرف ایک کارڈ رہ گیا اور وہ تھا افیون (Opium)کا۔ تاریخ کے اس دور پر اگر نظر دوڑائی جائے تو یہ وہ زمانہ تھا جب ہندوستان میں جنگ پلاسی (1757ءمیں) اور بکسرکی لڑائی (1761ئ) چھڑ چکی تھی۔ بنگال اور بہارکے صوبےکی انتظامیہ اور عدلیہ ایسٹ انڈیاکے حوالےکی گئی اور پھر جس بیدردی کے ساتھ لوٹ کھسوٹ ہوئی اس کا نتیجہ یہ ہواکہ بنگال اور بہار جیسے صوبے تلپٹ ہوگئے۔ کاروبار ٹھپ ہونےکی وجہ سے چاروں طرف غربت چھاگئی۔ ایسٹ انڈیاکمپنی کی اپنی کمائی میں بھی حد درجہ کمی آگئی۔ پیسےکی کمی پوری کرنے کے لئےکمپنی اب افیون (Opium) پر انحصار کرنے لگی۔ افیون سےکمائی کاگراف دن بدن بڑھتا ہی رہا یہاں تک کہ افیون کی ایک پیٹی جس پر پچاس ڈالر لاگت آ رہی تھی وہ 1796ءکے اعداد و شمارکے مطابق سوڈالر میں فروخت ہورہی تھی اور وہی پیٹی دس سال بعد 1803ءمیں 1400 ڈالرکماکر دینے لگی تھی اور آگے چل کر اس کی قیمت 2000 ڈالر ہوگئی۔ مطلب یہ کہ اس افیون جیسی موذی چیز نے انگریز بہادرکو عیاشی کروادی۔ انہیں 4000فیصد فائدہ ہونے لگا تھا یعنی 100 ڈالر کی چیز 4000 ڈالر میں بک رہی تھی۔ اس وقت کوئی انگریز یا یورپی یہ کہنے سے قاصر تھاکہ افیون خراب چیز ہے۔ "افیون کا دھندغیر اخلاقی کام ہے۔" شاید اس لئےکہ ان کی کمائی ہو رہی تھی اور تباہی ایشیاکے لوگوں کی ہو رہی تھی جن کی حیثیت انگریز میموں کےکتوں سے بھی کم تھی۔ اسی لئے اس وقت مغرب کےکسی باشندےکو انسانی ہمدردی کی بات سمجھ میں نہیں آرہی تھی۔ اسی لئے اس وقت تو ان کو انسانوں کا خون چوس کر بھی اپنی جیب

کو ڈالروں سے بھرنا تھا۔ (انگلینڈ کا سکہ آج اور اس زمانے میں بھی پاؤنڈ اسٹرلنگ تھا لیکن پورے ایشیا اور آگے چل کر مشرق بعید اور جنوبی ایشیا میں افیون کا کاروبار اسپینی ڈالروں میں چلنے لگا۔(

نشہ آور چیز کی ہمیشہ یہ مصیبت ہوتی ہے کہ جو ایک دفعہ اس کا عادی ہو جائے تو اس سے جان چھڑانی مشکل ہو جاتی ہے۔ وہ گھر بیچ کر بھی نشے کو حاصل کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ا فیون کے خریدار بھی ختم ہونے کی بجائے دن بدن بڑھتے گئے اور جو ایک مرتبہ عادی ہو تا گیا وہ بھاری قیمت دیکر بھی افیون خرید تا رہا۔

اس طرح افیون کی عادت چینی لوگوں میں بھی مضبوط ہوتی گئی۔ وہ ایک طرف پیسہ ضائع کرنے لگے اور صحت دوسری طرف۔ "انگریز دنیا کی سلجھی اور تہذیب یافتہ قوم" کہلانے کے باوجود پیسے کمانے کی خاطر اخلاقیات اور اچھائیوں کی تمام حدیں پار کرتی گئی۔ یہ انگریز اور یورپی جو آج اخلاقیات اور انسانیت کے چیمپئن کہلاتے ہیں اور افغانستان ، پاکستان، برما، تھائی لینڈ وغیرہ وغیرہ میں افیون کی کاشت اور چرس جیسی چیزوں کی خرید و فروخت پر بندش لگوانے میں پیش پیش ہیں (بلاشبہ یہ ایک اچھا کام کر رہے ہیں، کسی کو اعتراض نہیں ہونا چاہیے) مگر لوگوں کی معلومات اور یادداشت کے لئے یہاں یہ حقیقت لکھنا ضروری سمجھتا ہوں کہ یہی وہ لوگ تھے جنہوں نے آدھی دنیا کو نشئی بنایا۔ پیسے کمانے اور اپنی عیاشیوں کےلئے افیون جیسی موذی چیز کی فروخت کی اور چینی جیسی سلجھی ہوئی اور تہذیب یافتہ قوم جو علم و فراست اور عقل و ادب میں سب سے آگے تھی نشئی اور بدکردار بنادیا۔ اس کے ساتھ ساتھ ہندوستان کے لوگوں کو کوئی اور فصل اگانے کی بجائے افیون کی کاشت کرنے کے لئے مجبور کیا۔

بچانان (Buchanan) نام کے ایک مصنف کی کتاب

"An Account of the Districts of Bihar & Panta 1812" پڑھنے کا موقع ملا جس میں بچانان نے لکھا ہے کہ وہ زرخیز اور اچھی زمینیں جن میں باغ لگائے جاتے وہاں افیون کاشت کی جانے لگی۔ انگریز سرکار کی طرف سے ہندوستانی کاشتکار کو سختی سے یہی ہدایت ملی ہوئی تھی کہ وہ کوئی اور پھل یا سبزی لگانے کی بجائے افیون ہی کاشت کرے حالانکہ افیون سے غریب مقامی ہاری کو کوئی فائدہ نہیں ہوتا تھا۔ اس سے تو انگریز سرکار آلو اور پیاز کے نرخ پر افیون خریدکرتی تھی اور پھر خود 4000 فیصد زائد قیمت پر چینیوں کو فروخت کرتی تھی۔

انگریزوں کو دیکھ کر یورپ کی دوسری قومیں بھی اس گھناؤنے دھندے میں کود پڑیں۔1815 ءمیں انگریزوں کو یہ معلوم کرکے حیرت ہوئی کہ پرتگالی مالوامیں کاشت کی ہوئی افیون 750 ڈالروں میں فی پیٹی چینیوں کو بیچ رہے ہیں اس وجہ سے ان کے افیون کی کھپت میں کمی آگئی ہے یہ بات انگریزوں کو پسند نہیں آئی اور پھر جیسے انگریز کرتے ہیں کوئی بہانہ ڈھونڈ کر جھگڑا کرنا۔ انگریزوں نے جلدی ہی کچھ بہانے اور اسباب گھڑ لئے اور مرہٹوں سے جنگ شروع کردی جن کے کنٹرول میں مالوا کا علاقہ تھا (یہ جنگ ہندوستان کی تاریخ میں چوتھی مرہٹہ جنگ کے نام سے مشہور ہے) اس جنگ میں انگریزوں کی جیت ہوئی اور مالوا ان کے قبضے میں آگیا اور اس کے ساتھ وہاں سے ہونے والا افیون کی ساری تجارت بھی ان کے ہاتھ لگ گئی۔

اب انگریزوں کے ہاتھ میں چین کے صوبے کینٹن کی ضرورت سے زیادہ افیون ہوگیا اس لئے انہوں نے چین کے شمالی علاقوں میں افیون کی فروخت شروع کردی۔ چین کی حکومت کی طرف سے انگریزوں کو کینٹن کے علاوہ آگے جانے کی اجازت نہیں تھی لیکن یہ لوگ چوری چھپے چینی کشتیوں (جو بعد میں Opium Clippers

کہلانے لگیں) سے افیون کی اسمگلنگ کرنے لگے اور دیکھتے ہی دیکھتے سارے چین میں اس نشے کا اثر ہوگیا اور آرٹ اور علم کے ماہر چینی لوگ افیونی بنتے گئے۔

یہ مضمون پڑھنے والے قارئین کے ریکارڈ کے لئے میں یہ حقیقت لکھنا ضروری سمجھتا ہوں کہ افیون لے جانے والے قافلے کا پہلا جہاز "The Sylph" نام کا تھا جس میں عیسائیوں کا ایک پادری مترجم (Translator)کی حیثیت سے تھا جو اس افیون پر ملنے والے کمیشن سے چین کے مختلف شہروں میں عیسائیت کی تبلیغ کے لئے مشن بناتا رہا۔

افیون پینے کی منحوس عادت سارے چین میں ایسی عام ہوگئی کہ اب چین کا شہنشاہ اور شاہی حکومت کے کارندے سب پریشان ہوگئے۔ انہوں نے انگریزوں کو اس غلط دھندے سے باز رہنے کے لئے متنبہ کیا مگر وہ اس گورکھ دھندے کو بند کرنے کی بجائے چین کی حکومت کا مذاق اڑانے لگے۔ آخرکار اور کوئی چارہ نہ دیکھ کر چین کی سرکار نے ان کشتیوں پر پابندی عائد کردی جو افیون کی اسمگلنگ میں حصہ لے رہی تھی۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ اب انگریز خود اپنی کشتیوں میں افیون بھر بھر کر دیدہ دانستہ چین کے چاروں کونوں میں بیچنے لگے۔ دور دراز کے گاؤں کے لوگوں کو افیون کا عادی بنانے کے لئے ان کو افیون مفت فراہم کی جاتی تھی۔ پہلے سے عادی لوگ افیون خریدنے کے لئے سخت بے چین رہتے تھے۔ وہ اس نشے کی بری طرح عادی بن چکی تھے اور افیون کی کھپت دس لاکھ ڈالر تک جاپہنچی تھی۔ اب وہ چینی جن سے ہر سال انگریز لاکھوں ڈالر کی چائے لے رہے تھے اور انگریزوں کی کوشش کے باوجود وہ ان سے کچھ خریدنے کے لئے تیار نہیں تھے اب وہ چینی افیون کے عادی بن چکے تھے اور انگریزوں کو افیون بیچنے کے لئے منتیں کرنے لگے۔ آخرکار چینی حکومت نے 1839ءمیں مسٹرلن سی سو Lin Tsi (Hsuکو کینٹن کے صوبے کا کمشنر مقرر کیا کہ وہ کسی طرح افیون کی اسمگلنگ بند کرے ۔ اس کمشنر چارج سنبھالتے ہی سختی شروع کی۔ ایک طرف انہوں نے اپنے چینی لوگوں پر نظر رکھی اور اس کاروبار میں حصہ لینے پر سزائیں دینی شروع کی اور دوسری طرف اس وقت کی انگلینڈ کی ملکہ وکٹوریا سے التجا کی کہ اس ظلم سے ان کے ملک اور لوگوں کو بچایا جائے۔ ملکہ وکٹوریہ کو لکھے ہوئے اس چینی کمشنر کے خطوط آج بھی موجود ہیں۔ ان خطوں کے کچھ حصے بہت ہی دکھ بھرے ہیں۔

"ملکہ صاحبہ! میں نے سنا ہے کہ آپ کے ملک (انگلینڈ) میں افیون جیسی چیز پر پابندی ہے۔ اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ آپ کو اس منحوس چیز کے نقصانات کا علم ہے۔ آپ دوسرے ممالک میں بھی اس کی خرید و فروخت پر پابندی کا حکم نامہ کیوں نہیں جاری کرتیں۔ بہتر تو یہ ہے کہ اس کی کاشت ہی روک دی جائے یہی ایک بہتر طریقہ ہے جس سے اس موذی مرض سے انسانی ذات کو نجات مل جائے گی۔ اگر آپ اس کو روکنے میں سختی سے کام نہیں لیں گی تو ہم یہ سمجھیں گے کہ آپ کو اپنے لوگوں کا تو خیال ہے مگر ہم چینیوں کی فکر نہیں ہے یعنی اپنے فائدے کی خاطر آپ دوسری انسانی ذات پر ظلم کر رہی ہیں۔" وغیرہ۔

چین کی حکومت نے جب اپنے لوگوں اور کینٹن میں آئے ہوئے انگریز تاجروں کی اس اسگلنگ پر سختی کی تو انگریز پریشان ہوگئے۔ کلکتہ میں موجود برطانوی حکام بار بار ملکہ وکٹوریہ اور پارلیمنٹ کے نمائندوں کو یہ لکھ کر بھیجتے رہے کہ افیون کی تجارت جاری رہنی چاہیے ۔ اس سے انگریز حکومت کو کئی فائدے ہیں۔

اس کے بعد وہی ہوا جو ہوتا رہتا تھا۔ انگریزوں کی تجارت اور کمائی میں کمی آنے پر انہوں نے نت نئے بہانے تراش کے چینیوں پر حملہ کردیا۔ چینیوں کے پاس جدید اور بھاری جنگی سامان نہ تھا جبکہ انگریزوں کے پاس

تو پیں اور بارود تھا جن کی بھیانک آوازوں سے ہی چینی گھبرا گئے اور اپنے ہتھیار ڈال کر ہر مطالبہ ماننے کے لئے تیار ہوگئے۔

کچھ سال پہلے میں نے ایک کتاب "Reflection on China" پڑھی تھی جو ڈاکٹر محمد یونس کی لکھی ہوئی ہے۔ ڈاکٹر یونس صاحب بھی پیرعلی محمد راشدی کی طرح کئی برس تک چین میں پاکستان کے سفیر رہ چکے ہیں۔ انہوں نے اس لڑائی جسے افیون لڑائی (Opium war) کہتے ہیں کا تفصیلی احوال لکھا ہے جو 1841ءمیں ہوئی اور جس کے بعد چین جیسا بڑا اور تہذیب یافتہ ملک انگلینڈ جیسے چھوٹے اور دور دراز کے جزیرے جیسے ملک کے قبضے میں آگیا، صرف اس وجہ سے کہ انگریز انتہائی شاطر قسم کے تھے۔ انہوں نے مشینری، جنگی جہاز اور بارود جیسی چیزیں دوسروں سے پہلے ایجاد کرلی تھیں۔ انگریزوں کے جنگی بحری جہازوں (Gun Boats) کے سامنے چین کا پرانا بیڑا (Junks) کوئی حیثیت نہیں رکھتا تھا۔

بہرحال افیونی جنگ وہ جنگ تھی جو ایک طاقتور قوم (انگریز) نے خواہ مخواہ چینیوں جیسی قوم پر مسلط کی اور ان کو افیون خریدنے اور افیونی بننے کے لئے مجبور کیا۔ اس جنگ پر آنے والے نام نہاد خرچے کے بدلے انگریزوں نے چینیوں سے ان کا کینٹن بندرگاہ کے قریب والا خوبصورت جزیرہ (ہانگ کانگ) سو سال کے لئے اپنے پاس رکھنے کا معاہدہ بھی کرلیا۔